سلسلۂ تجدید دین (۲)
تجدید
تعلیم و تبلیغ
حضرت مولانا عبد الباری ندوی
خلیفۂ اقدس
حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمہما اللہ تعالیٰ
المکتبۃ الاشرفیہ
جامعہ اشرفیہ
فیروز پور روڈ لاہور

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
دیباچہ	۱	علما و مشائخ کی مہلک خود فراموشی	۳۱
مقدمہ	۹	غیر مستطیع علما کے مسئلہ معاش کا قرآنی حل، علما پر اعتراضات کی تحقیق	۳۲
تعلیم کے صحیح معنیٰ	۱۰	علما کی اخلاقی کمزوریاں علم دین کا اثر نہیں	۳۷
اعلیٰ درجہ کا حیوان و شیطان	۱۱	زیادہ الزام معزز طبقہ پر	۳۸
تعلیم یافتہ جانور	۱۲	مولوی سے مراد عالم باعمل ہے	۳۹
جہنم بم	〃	تعصب و غصہ کا اعتراض	۴۰
تعلیم جدید کا مبلغ پرواز	۱۳	باہمی اختلافات کا شبہ	۴۴
اسلام کا تصورِ انسان	۱۵	فتوے میں مصلحت زمانہ کا عدم لحاظ	۴۵
چند اشارات	۱۶	گوشہ گیری کا اعتراض	۴۶
بس دو باتیں	۱۸	تحریر و تقریر میں قصور کا شبہ	۴۷
مطلوب محدود اور طلب نامحدود	۱۹	علما کی وقعت و عظمت کی حفاظت	۴۹
زہر کا نام تریاق	۲۰	علم دین کے حقوق طلبا و علما پر	۵۱
تجدید تعلیم	۲۲	علم دین کے دینی و دنیوی استعمال میں فرق۔	۵۳
روحانی امراض کے دو بنیادی اسباب	۲۳	علماء کا امراء سے اختلاط	〃
علم دین کے دو درجے	〃		
بقدر واجب علم دین کے حصول کی آسان تدبیر	۲۶		

مضمون	صفحہ
حیلۂ شرعی کو حیلہ بنانا	۵۴
علماء کی جاہ طلبی	۵۵
امراء سے اختلاط و اجتناب کے شرائط	۵۸
جاہ طلبی کی ایک دقیق تدبیر	۵۹
مناظرہ ومجادلہ کی حقیقت	۶۰
ظنی وقطعی مسائل کے حکم کا بڑا اہم فرق	۶۱
مسائل قطعیہ میں اختلاف کی مختلف حالتوں کا حکم	۶۳
مسٹروں کے ملکی وسیاسی مناظروں نے مولویوں کے دینی و مذہبی مناظروں کو بھی مات کر دیا	۶۶
مدارس کی اصلاح	۷۱
تجدیدی اصلاح	۷۲
طلبائے دین کی ذلت سے حفاظت	۷۴
طلباء کی وضع ولباس	〃
عطائے سند میں بے احتیاطی و نقالی	۷۸
قواعد کی پابندی میں سستی	۷۹
تجوید اور اخلاق کی تعلیم سے غفلت	〃
اصلاح اعمال و اخلاق	۸۶

مضمون	صفحہ
مختصر نصاب	۸۸
مسئلہ معاش	۹۷
بڑی ایمانی خامی	۱۰۱
بڑی خود فریبی	۱۰۲
آپ بیتی	۱۰۳
گویا خدا سے کوئی واسطہ نہیں	۱۰۵
مومن کی شان	۱۰۶
پورا خلل دماغ	〃
الدنیا سجن المؤمن	۱۰۷
جیسے کوئی منکر آخرت ہو	〃
آخرت کی کوئی مصیبت لاعلاج نہیں	۱۰۸
حضورؐ کی پسندیدہ زندگی	۱۰۹
فقر صادق	۱۱۰
مومن کی معاشی منطق	۱۱۱
مومن کی معاشی بے فکری	۱۱۴
تعلیم دین کے ساتھ فکر معاش	〃
ایک تنبیہ	۱۱۷
وعظ وافتا اور تصنیف کے متعلق اصلاحات	〃
متفرق اصلاحات	۱۲۱

مضمون	صفحہ
اہل دنیا اور علماء کے تعلقات	۱۲۲
معلم و متعلم اور شرکائے علم کے باہمی حقوق	۱۲۳
حقوق معلم	۱۲۴
خاص طالبعلمانہ کوتاہیاں	۱۲۷
متعلم کے حقوق	۱۲۸
شرکائے علم کے حقوق	۱۳۳
ضروری تنبیہات	۱۳۴
اصلاح تعلیم نسواں	۱۳۷
مختلف خیالات	۱۳۸
طبقۂ اول	〃
دوسرا طبقہ	۱۴۰
تیسرا طبقہ	۱۴۲
تحقیق تعلیم انگریزی	۱۴۴
پہلا مقدمہ	۱۴۵
دوسرا مقدمہ	۱۴۶
تیسرا مقدمہ	〃
چوتھا مقدمہ	۱۴۷
پانچواں مقدمہ	〃
چھٹا مقدمہ	۱۴۸
ساتواں مقدمہ	۱۴۸
آٹھواں مقدمہ	۱۴۹
نواں مقدمہ	〃
دسواں مقدمہ	۱۵۰
جامعہ ملیہ	۱۵۲
ندوہ	۱۵۳
دین کی پرواہ	۱۵۳
اردو کی شرعی حیثیت	۱۵۷
فارسی کی فضیلت	۱۵۹
ماننے کے دو درجے	۱۶۳
علم کی دو قسمیں	〃
کون علم میراث انبیاء ہے	۱۶۴
تجدید تبلیغ	۱۶۷
حضرت کے مواعظ در اصل دعوت و تبلیغ دین ہی کا علمی و عملی ذخیرہ ہیں	۱۷۰
تبلیغی حکمت کی ایک عجیب مثال	〃
بستی نظام الدین کی تبلیغی بنیاد میں حضرت کی شرکت	۱۷۲

مضمون	صفحہ
کچھ متودبانہ معروضات	۱۷۳
دستور العمل	۱۷۹
تبلیغ احکام کی ترتیب یہ ہو	۱۸۰
تبلیغ کے اس دستور العمل کی بڑی خصوصیت	۱۸۳
تعلیم المسلمین	۱۸۶
وعظ اور واعظوں کا انتظام و اصلاح	۱۸۷
مجلس دعوت الحق	۱۹۰
نظام العمل	۱۹۴
دعوت و تبلیغ کی دو قسمیں	۱۹۶
دعوت عام و خاص	۲۰۱
دعوت حقیقی و حکمی	۲۰۲
دعوت عام	۲۰۳
داعی کی دو قسمیں	۲۰۴
اشاعت و حفاظت دین کا کارگر طریقہ	۲۰۶
تبلیغ سے بے پروائی اور حیلہ جوئی کا سبب دنیاوی اغراض	۲۱۱
حیلوں کی حقیقت	۲۱۲
امر بالمعروف کے بعض حدود و شرائط	۲۱۵

مضمون	صفحہ
ایک آیت سے استنباطات	۲۱۶
تبلیغ میں افراط و تفریط کی اصلاح	۲۱۹
دینی طلبہ کو خصوصی تنبیہ	۲۲۱
اہل اصلاح کی دوسروں کی اصلاح سے بے فکری	۲۲۲
اصول و فروع سب میں تبلیغ فرض ہے	۲۲۴
علماء و عوام کے فریضہ تبلیغ میں فرق	۲۲۵
بعض مواقع پر اہل اللہ کے بظاہر ترکِ امر بالمعروف کی وجہ	۲۲۷
ایک سبق آموز مثال	۲۲۸
بعض دقیق باتیں	۲۳۰
تبلیغ اعمال بھی ضروری ہے	۲۳۲
جن کو سب سے زیادہ ہم پر تبلیغ کرنا واجب ہے	۲۳۳
ایک عجیب رائے	۲۳۵
انقلاب عام و تام	۲۳۸
قرآن مجید صرف کتاب ہدایت نہیں نظام ہدایت بھی ہے	″

مضمون	صفحہ
فرنگی وبا	۲۴۰
اصلاح کا خاص تجدیدی پہلو	۲۴۱
توابع کی اصلاحی ذمہ داری	۲۴۲
خلاصہ	۲۴۳
متعدی اصلاح و تبلیغ	۲۴۵
دینی زندگی کے دو کلیدی اصول	//
ایک اور عام عارضہ	۲۴۷
مقصود کام نہیں نام	۲۴۸
کیف و کم کا فرق	۲۴۹
اتفاق کا گر	۲۵۱
حضرتؒ کی تجدید دین کا ماحصل	//
سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات	//
ایک اور تقاضہ	۲۵۳
اجزائے نظام کا خاکہ	۲۵۴
ایک درسگاہ کا قیام	//
نصاب تعلیم	۲۵۵
کہفی رنگ	۲۵۶
مساجدی نظام	۲۵۷
نئی تعلیم والوں کی اصلاح	۲۶۲
نئی تعلیم تعلیم ہی نہیں	۲۶۳
زندہ کتابوں کا مطالعہ	۲۶۴
بحالات موجودہ ان کی اصلاح کی مختلف صورتیں	۲۶۶
نظام اصلاح کی روح	۲۶۹
ضمیمہ، ایک بڑا فرض کفایہ	۲۷۳
دوہری ذمہ داری	//
اسلام پر شبہات کا ازالہ	۲۷۴
کفر از کعبہ	۲۷۵
یونانی اور فرنگی شبہات کا فرق	۲۷۶
ندوہ کا فضل تقدم	۲۷۷
لادینی روگ دینی ادارت میں	۲۷۸
دو ضروری باتوں کا انتظام	//
مادیانہ سطحیت	۲۸۰
قدیم معقولات	۲۸۱
انگریزی کا لزوم	۲۸۲
خالص عربی ادب	//

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمد للہ سلسلہ تجدید دین کی تیسری کتاب بھی کتابی صورت میں پیش ہورہی ہے اصل میں بھی کتاب ہی تھی، لیکن کتابی صورت میں اشاعت دیر طلب تھی اس لئے بعض احباب نے تبلیغی وتعلیمی امور میں اس کی افادیت کو زیادہ محسوس کر کے پہلے مضامین کی صورت میں شائع کرادینے کی رائے دی، اچھا ہی ہوا کہ معارف والفرقان میں[1] دو تین سال قبل مضامینی صورت میں نکل جانے سے بعض رایوں سے استفادہ بلکہ اصلاح کا موقعہ مل گیا اور اب کتاب لفظی ردو بدل کے علاوہ بہت سی معنوی تبدیلیوں اور معتدبہ اضافوں کے ساتھ شائع ہورہی ہے،

پہلی دونوں کتابوں (جامع المجددین، تجدید تصوف) کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کی ظاہری وباطنی کامل وجامع انفرادی اصلاح سے تھا۔ جامع المجددین کا ظاہری سے اور تجدید تصوف کا باطنی سے،

تیسری کا اصل موضوع اجتماعی اصلاح کے تعلیمی وتبلیغی مسائل ہیں سب سے نمایاں دو خصوصیات اس کی بھی وہی قابل توجہ ہیں جو حضرت جامع المجددین (مولانا تھانوی) علیہ الرحمۃ کے سارے اصلاحی وتجدیدی کارناموں کی ہیں۔

(۱) تعلیم وتبلیغ سے متعلق سارے اصول وفروع کی جامعیت وہمہ گیری اور

(۲) ہر مسئلہ میں پوری حدود شناسی یا افراط وتفریط سے احتیاط، یہی دو خاص امتیازات دین کامل (اسلام) کا خاص کمال ہیں۔

---

[1] معارف (اعظم گڈھ) بابت ۱۹۴۵ء۔ الفرقان (لکھنؤ) بابت ۱۳۶۶ھ

یہ دینِ کامل بہت کچھ اپنی شانِ کمال واعتدال ہی کی بناء پر جس طرح ابتداء میں غیروں کے لئے غریب اجنبی و بیگانہ تھا آج خود اپنے اسلام کے اسی دوگونہ امتیاز سے بیگانہ و ناآشنا ہو رہے ہیں۔

اِنَّ الْاِسْلَامَ بَدَأَ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ غَرِیْبًا کَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ وَھُمُ الَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَا اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِیْ مِنْ سُنَّتِیْ

اسلام کی ابتدار بھی غربت یا اجنبیت کی صورت میں ہوئی اور آگے چل کر پھر یہ جلد ہی غریب ہو جائے گا (کہ لوگ اس کو پوری طرح پہچانیں گے نہیں) پس بڑی خوشخبری ان غرباء یا اجنبیوں کے لئے ہو، اور یہی وہ لوگ ہیں جو دین کے ایسے فسادات کی اصلاح کریں گے جو بعد کے لوگوں نے میرے طریقہ میں پیدا کر دیئے ہوں گے ،،

اچھے اچھے اہل علم و اخلاص افراد و ادارات تک کو دیکھا جاتا ہے کہ اسلام کی ہمہ گیری و حدود شناسی سے شاذ ہی آشنا و مانوس ہیں۔ انتہا اس بیگانہ وشی کی ہو گئی کہ معاشیات و سیاسیات کے سرتاسر موجودہ بطنی و حیوانی شور و غوغا سے متاثر ہو کر آج ہمارے بڑے بڑے علماء و مفکرینِ اسلام کے جمال و کمال کو زیادہ تر معاشی و سیاسی آئینہ میں دیکھ دکھلا کر پہچاننا اور پہچنوانا چاہتے ہیں سیاست و معیشت کی لادینی نہیں دینی اہمیت کے واجبی اعتراف کے ساتھ ان دونوں کا تعلق انسان کی انسانی یا مقصدگی زندگی سے براہ راست بہر حال نہیں۔ بلکہ حیوانی و مادی زندگی کے حوائج و وسائل سے ہے "خوردن برائے زیستن" ہے نہ کہ "زیستن برائے خوردن" سیاست و حکومت کا مطلب بھی اتنا ہی ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے مادی و معاشی مشاغل کو امن و امان کے ساتھ

انجام دے کہ انسان اصل انسانی زندگی کے مقصد و مدعا کی جدوجہد، طلب و تکمیل میں زیادہ سے زیادہ فراغ و اطمینان کے ساتھ مشغول و منہمک رہ سکے،

لیکن جب انسان اپنی احسن تقویم کے اعلیٰ مقصد و معنویت کی سربلندی سے گر کر اسفل السافلین کی پستی میں جا پڑا ہو تو پھر انسان کی انسانی غرض و غایت کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے جس بازار سے کھرے سکوں کا چلن اٹھ گیا ہو، ہر مال کی قیمت کھوٹے سکوں سے لگائی جاتی ہو وہاں کھرے کھوٹے کی تمیز کتنوں کو رہ جاتی ہے گی، کھرے اور کامل المعیار دین اسلام کی آج خود اپنوں میں کسادبازاری و کس مپرسی یا غربت و اجنبیت کا بڑا سبب یہی ہے

اس دین بیزاری اور معاشی و سیاسی شر و فساد کے آشوب میں اگر سیاسیات و معاشیات کی راہ سے دین کی طرف کوئی مڑ جائے اور دین کے ابتدائی و بنیادی مطالبات کا کچھ شعور پیدا ہو جائے تو یہ بھی بسا غنیمت معلوم ہوتا ہے چہ جائیکہ اسلامی شان و حدود شناسی و ہمہ گیری کی خالص و کامل تعلیمات کی خالص و کامل جامع تجدیدات جو جامع المجددین اور تجدید تصوف و سلوک نام کی کتابوں میں پیش کی جا چکی ہیں ان کی کسی خاص طلب و تمیز کی امید کیجاتی۔

تاہم خود حضرت جامع المجددین حکیم الامۃ علیہ الرحمۃ جو یہ بڑی حکیمانہ بات فرمایا کرتے تھے کہ اسلام کی شانِ کمال و جمال میں قدرۃً خود ہی بڑی کشش ہے تو اس میں شک نہیں کہ ان دو کتابوں کے ذریعہ اسلام کی یہ خاص شان کسی اعتبار سے کم ہی دگو توقع سے وہ بھی زیادہ ہی رہی، لیکن کیفی اعتبار سے جس طبقہ کے بھی سنجیدہ اور فہمیدہ ہاتھوں تک پہنچی انہوں نے تجدیدات کی جامعیت و ہمہ گیری اور توازن و حدود شناسی کے کمال و جمال کا اعتراف کیا اس اعتراف میں قدیم و جدید لیکن دونوں کے ایسے صاحب فہم و فکر حضرات تک شریک ہیں جن کو حضرت علیہ

الرحمۃ سے کسی نوع کے قرب و اعتقاد کے بجائے بُعد اور غلط فہمی ہی زیادہ تھی البتہ طبیعت میں انصاف تھا عناد نہ تھا ان سب نے مختلف عنوانات سے جن مشترک تاثرات کا زبانی یا تحریری اظہار فرمایا ان کا خلاصہ یہی جامعیت وہمہ گیری اور توسط و توازن یا حدود شناسی ہے اور ان دونوں کا لازمہ صحیح و کامل فہم دین، یہ تو نظری تاثرات تھے، سب سے قیمتی عملی تاثر خود اپنی اصلاح کا احساس اور اس کی طرف توجہ۔ حضرت مجدد وقت کی کتابیں جس نے بھی دو چار سو صفحات خصوصًا مواعظ و ملفوظات کے جی لگاکر پڑھ لیئے راقم سطور کا بلا استثنا، تجربہ رہا ہے کہ وہ اس بڑے بیش قیمت عملی تاثر سے محروم نہیں رہتا۔

غرض ہر طرح کے ناموافق حالات و فسادات کو دیکھتے اگر زیادہ ہمت افزائی نہیں ہوئی تو بحمد اللہ ایسی ہمت شکنی بھی نہیں ہوئی کہ سلسلہ کی مزید خدمت و اشاعت کا رُخ ہی نہ رہتا۔

بعض قابل ذکر واقعات و تجربات

ا۔ اتنا غالبًا پہلے ہی کہیں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ خدمت بلا کسی خاص سوچے سمجھے ہوئے ارادہ کے اور اس طرح گویا بے ارادہ انجام پذیر ہو رہی ہے حضرت مولانا (سید مناظر احسن) گیلانی مدظلہ العالی نے کئی بار اور بہت خوب تحریر فرمایا کہ یہ کام تم نے کیا نہیں کرایا گیا ہے۔ خیال کی ابتدا ریوں ہوئی کہ محب قدیم مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی زادہ اللہ مجدًا نے حضرت کی وفات پر صدق کے لیئے کوئی مضمون احقر سے بھی طلب فرمایا، جی میں آیا کہ حضرت کی مجددیت پر کسی نے خاص توجہ نہیں کی اسی کے متعلق چند صفحات پیش کر دوں جواب میں یہی عرض کر دیا۔ ایک بڑی طبعی نااہلیت یہ ہے کہ ذمہ داری کے اگر کسی ایک کام میں بھی لگا ہوں تو پھر توجہ طلب کوئی دوسرا کام یکسوئی سے بمشکل ہی ہو پاتا ہے

اور موقتی یا اخباری رنگ کے مختلف الموضوع اشتات یا متفرقات پر تو کہنا چاہئے کہ سرے سے قدرت ہی نہیں، طبعاً کے علاوہ عقلاً و نقلاً اور خود حضرت علیہ الرحمۃ کے رنگ سے بھی ایسا ہی سبق ملا۔ بہرحال مولانا موصوف کی خدمت میں جواب لکھ کر بات آئی گئی ہو گئی پھر جب عثمانیہ یونیورسٹی کی ذمہ دارانہ خدمت سے سبکدوشی ہوئی تو شاید موصوف ہی نے پھر یاد دلایا۔ یا خود یاد آیا تو ۵۰/۶۰ صفحے کے ایک مضمون کا ارادہ کر کے شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ تجدیدی نظر سے حضرت رح کی کتابیں جو دیکھنا شروع کیں تو معلوم ہوا کہ بے سوچے سمجھے سمندر میں کود پڑا ہوں

اسی دوران میں خواب دیکھا کہ ہمارے ندوی حضرت سید (سلیمان) صاحب مدظلہٗ اور خاکسار حضرت علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کیا دیکھا کہ ایک دالان میں بہت اونچے بڑے پلنگ، چھپر کھٹ پر کوئی بڑا قد آور لیٹا ہے جس پر بڑی صاف شفاف سفید چادر پڑی ہے جیسے جنازہ پر پڑی ہوتی ہے سید صاحب نے گھبرا کر فرمایا کہ حضرت کی وفات ہو گئی خاکسار نے کچھ اس طرح کے الفاظ میں شدت سے اس کی تردید کی کہ "نہیں حضرت کی وفات ہرگز نہیں ہوئی" اس کے بعد ہی اچانک اس چادر کے اندر سے نمایاں حرکت محسوس ہوئی، چھپر کھٹ کے محاذ ہی میں ایک دوسرا خالی پلنگ بچھا تھا۔ اس پر بھی بہت سفید چادر لگی تھی ہم دونوں اس پر اس بظاہر جنازہ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ آنکھ کھلی تو نہ ہم دو کے سوا کسی کا اور کا ہونا یاد نہ کوئی اور بات ہی یاد۔

تعبیر البتہ بے ساختہ ذہن میں یہ آئی کہ سید صاحب، اشرف الحیات کے نام سے حضرت کی سوانح حیات کا ارادہ بلکہ شاید آغاز فرما چکے[1] تھے جس کا دستور بالعموم

---

[1] افسوس کہ اختتام نہ ہوا۔ تجدید تصوف و سلوک میں مقدمہ کے عنوان سے جو حصہ شامل ہے وہ دراصل اشرف الحیات ہی کا تمہیدی ٹکڑا ہے۔

ناسوتی حیات کے خاتمہ کے بعد ہی لکھنے کا ہے اور راقم نااہل حضرت کی دینی تجدید و احیا کی خدمات پر لکھ رہا تھا جو غیر فانی ہیں۔ والغیب عند اللہ۔

۲۔ ایک اور غیر معمولی تجربہ اس سلسلہ کی خدمت میں عجیب ہوتا رہا اور برابر ہو رہا ہے۔ طالب علمی ختم کر کے جب سے زندگی میں قدم رکھا، حوصلہ و ہمت سے بڑھ چڑھ کر کامیابیاں ہمقدم رہیں۔ بظاہر کیسی عجیب بات ہی ہے کہ جیسا جیسا حضرت کی جوتیوں سے نزدیک ہوتا گیا زندگی کی یہ ظاہری کامیابیاں دور ہی ہوتی چلی گئیں۔ اب تو مدت سے رنگ ہی یہ ہے کہ اکثر چھوٹے سے چھوٹا اور آسان سے آسان کام بھی پہاڑ اور دشوار ہو جاتا ہے۔ نفع کی جگہ ہر معاملہ میں نقصان کا سامنا زیادہ ہوتا ہے، مجبوری و ناچاری ہی سے کسی نئے کام کو ہاتھ لگاتا یا کسی نئے معاملہ میں پڑتا ہوں

دوسری طرف سلسلہ تجدید کی ان کتابوں کی تحریر و طباعت اور اشاعت میں ایسی تیسیر و تسہیل ہوتی رہی کہ اس سراپا ناکام کا کام ہی نہیں معلوم ہوتیں! ۲۰،۲۲ سال سے دمہ ہمدم ہے، جاڑوں بھر کم و بیش نفس شماری میں کٹتی، لکھنے پڑھنے کا کوئی مسلسل و مستقل کام قطعاً نہ ہو پاتا، مرض کی شدت بارہا مریض و معالج، اعزہ و احباب سب کو مایوسی تک پہنچا دیتی لیکن ادھر قریباً چار سال جب تک اس سلسلہ کا تحریری کام انجام کو نہیں پہنچ لیا یاد نہیں کہ مرض کا اشتداد یا امتداد ایک دن بھی کام میں مخل ہونے کی حد تک پہنچا ہو۔ اس کے بعد گذشتہ سال ہی پھر مسلسل چار پانچ مہینے فریش و نیم فریش اور موت و حیات کی کشمکش میں رہا۔

۳۔ تحریر کے بعد طباعت کا ہفتخواں سامنے آیا۔ معاملات کے تجربوں نے یوں ہی ہر معاملہ سے خوفزدہ کر رکھا تھا، پھر طباعت و مطبع کے کوچہ سے تو سرے سے نابلد تھا ہمارے مولانا (سید ابوالحسن) علی میاں سلمہ، تک جیسے بے نفس سے سنا کہ انہوں نے حج و زیارت کے دوران میں اجابت دعا کے تمام مقامات پر خاص طور سے طباعت و مطبع

کے بعض سابقوں سے پناہ مانگی، ایسے بے نفسوں کے مقابلہ میں اس مجسمۂ نفس و نفسانیت کو تو جو کچھ پیش آجاتا کم تھا۔

لیکن خدا بڑی جزا دے محب محترم مولانا محمد منظور نعمانی سلمہٗ (مدیر الفرقان) کو کہ انہوں نے اس خدمت کو دین کی ایک ضروری خدمت تصور فرما کر بڑی للّٰہیت کے ساتھ طباعت کے بہت سے مراحل کی بہت کچھ ذمہ داری قبول فرماکر نامی پریس کا مشورہ دیا اور کام اس کے حوالہ کر دیا، نامی پریس کی نیک نامی کے لئے دعا گو ہوں کہ مالک پریس اور کارکنان پریس سب نے شکایت سے زیادہ شکریہ ہی کا موقعہ دیا۔ و الاجر عند اللہ

رہا، اب اشاعت کا مرحلہ آیا تو ہندوستان و پاکستان کے مسائل کی نئی مشکلات کا سامنا، کتابوں کی مانگ تھوڑی بہت جو کچھ وہ بہت زیادہ پاکستان میں، ہندوستان میں برائے نام، خود مؤلف ناکارہ طباعت ہی کی طرح اشاعت کے معاملات سے قطعاً بے بہرہ، ایسی صورت میں اس کو "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کی غیبی کارفرمائی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں جن حضرات سے سابقہ تعلقات کی بنا پر کچھ توقعات ہو سکتی تھیں وہ سب پیچھے ہٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک ایسے خالص و مخلص بندہ محب کریم و لطیف پیر عبد اللطیف سلمہٗ کو پاکستان کے سب سے بڑے مرکز اشاعت لاہور میں کھڑا کر دیا جنہوں نے غریب مؤلف کی غالباً صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ اب تک انہیں کے ہاتھوں جامع و تجدید دونوں کی سب سے بڑی اشاعت ہوئی ہے، پھر للّٰہیت کا یہ عالم کہ ہدیۃً کتاب کے صرف ایک ایک نسخے کی طلب و قبول کے آگے اشارۃً و صراحۃً، بواسطہ و بلاواسطہ جس جس ممکن عنوان سے کوئی درخواست کی سب کا ایک ہی جواب تھا کہ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ۔ مہینوں کے مقابلہ کے بعد آخر اس بندۂ کثیف ہی کو بندۂ لطیف کے سامنے سپر ڈال دینا پڑی۔

آخر میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ "پیر لطیف" کا یہ لطف دراصل اُسی پیر خرابات[1] کے "لطف واتم" کا ایک جرعہ ہے جس کی نسبت جامع المجددین کے دیباچہ میں عرض کیا جا چکا ہے کہ

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است
زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست وگاہ نیست

اور بالآخر یہ سب محض شیون و مظاہر ہیں شان ربوبیت و رحمت کے مبدأ اول وآخر کے۔ فالحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم

---

[1] حضرت مولانا المحترم شاہ محمد حسن صاحب مدظلہم العالی امرتسری ثم لاہوری۔ از اجل خلفائے حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَکْثَرَھُمْ	کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ اکثر ہوا پرست
یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ	(نام کے عقل پرست) کچھ سنتے سمجھتے
اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ	(یا واقعتاً عقل سے کام لیتے ہیں) ان
بَلْ ھُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا	کا حال تو بس چوپایوں (جانوروں) کا سا

ہے بلکہ ان سے بھی گیا گذرا (کیونکہ جانور تو بے عقلی کی وجہ سے معذور ہیں)

معنیٰ و مقصد ہستی کا سمجھنا معلوم

عقل ہے صرف پرستاری اوہام ابھی

فرنگی دجل کے اس دور کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اکثر سیاہ کو سفید اور زنگی کو کافور کا نام دے کر پروپیگنڈے کا ڈھول اس زور سے پیٹا گیا ہے کہ اس کے مقابل دوسری آواز کان پڑی سنائی نہیں دیتی، یہی برعکس نام نہند زنگی کافور کا معاملہ تعلیم کے ساتھ ہوا ہے کہ یہ لفظ سن کر بے ساختہ ذہن اسی نام نہاد نظامِ تعلیم کی طرف جاتا ہے جس کا جال کروڑوں، اربوں کے مصارف سے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سر بفلک عمارتوں کے اندر ساری دنیا میں پھیلا دیا گیا ہے، حتیٰ کہ تعلیم یافتہ سے مراد اب اسی تعلیم کا حامل اسفار ہوتا ہے اس لئے حضرت

مجدد وقت (مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ) کی تعلیمی تجدیدات و اصلاحات کا محل و مقام سمجھنے کے لئے ذرا خود تعلیم کا صحیح مطلب سمجھ لینا مقدم ہے۔

تعلیم کے صحیح معنیٰ

متعلم کو اس کے مقصد وجود کی تحصیل و تکمیل کا علم عطا کرنا ہیں۔ لیکن تعلیم جدید نے انسان کو اپنے اور کائنات کے وجود کا جو علم و تصور عطا کیا ہے وہ یہ کہ سارا کارخانہ عالم بس ایک خودرو جنگل ہے جس کا کوئی باغبان نہیں، جس نے برگ و بار، اشجار و اثمار کا کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھ کر قصد و ارادہ سے لگایا ہو، اس جنگل میں طرح طرح کے خودرو جانور چرند و پرند بھی بھرے ہیں، جن میں سے ایک انسان بھی ہے البتہ وہ سب سے اعلیٰ درجہ کا حیوان HIGHEN-ANIMAL یا سب سے بڑھیا جانور ہے مگر ہے جانور ہی۔ اور اس جنگل کے دیگر خودرو نباتات و حیوانات کی طرح اس کو بھی کسی دیدہ دانستہ مقصد کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس کے حق میں تعلیم کے یہ معنی بالکل بے معنی ہیں کہ وہ نام ہے اس کی کسی خاص مقصد اور تکمیل مقصد کی علم آموزی کا۔

انسان اور کائنات کے متعلق اس علم و تصور کی منطق کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ جنگل کے دوسرے جانوروں کی طرح یہ بھی زندگی کی ساری تگ و دو اور کشمکش، کھانے پینے رہنے سہنے، اور جننے جنانے (توالد و تناسل) کی نذر کر دے، البتہ چونکہ یہ اعلیٰ درجہ کا جانور ہے اس لئے اس کی بود و باش کے سامان بھی قدرتاً اعلیٰ درجہ کے ہوں گے۔ جانور اگر بھٹ میں رہتے ہیں تو یہ بنگلہ میں رہے، وہ اگر چر چگ کر کھاتے ہیں تو یہ میز کرسی پر کھائے وہ اگر توالد و تناسل کے وظائف سیدھے سادھے فطری طریقوں سے انجام دیتے ہیں تو یہ ان کو کوک شاستر کا آرٹ بنا دے،

غرض جب انسان من حیث الانسان کا نہ کوئی جداگانہ مقصد و مقام ہے نہ ماضی نہ مستقبل، یعنی نہ ماضی کی طرف اس کی آفرینش میں کسی کی مرضی و مشیت یا قصد و ارادہ کو دخل جس کی بناء پر اس کے وجود کا کوئی خاص مقصد و مراد یا مطلب و معنی ہوں نہ مستقبل میں اس کی موجودہ زندگی کا کوئی حساب و کتاب یا جزا و سزا تو اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ وہ آغاز و انجام سے یکسر بے پرواہ ہو کر تمام تر اسی سامنے کی مادی و فانی زندگی کے ماکولات و مشروبات، شہوات و رغبات، جاہ و جلال، آرائش و نمائش، کبریائی و سربلندی کے انفرادی و اجتماعی مقابلہ و مسابقت میں سرتاپا غرق رہے اور اسی کو تعلیم و تہذیب، ترقی و تمدن کا کمال جانے

اعلیٰ درجہ کا حیوان و شیطان

ساتھ ہی چونکہ اعلیٰ درجہ کے اس جانور (انسان) میں اعلیٰ درجہ کی عقل و ذہانت بھی ہے، اس لئے بالآخر اعلیٰ درجہ کے حیوان سے ترقی کر کے اعلیٰ درجہ کا شیطان بن جاتا ہے اور اس بے لگام عقل و ذہانت کی بدولت ایک طرف ذہنی، دماغی عیاشیوں کا شکار ہوتا ہے اور دوسری طرف طرح طرح کی ایجادات و اختراعات سے حیوانی و جسمانی راحت و زینت، تعلی و ترفع کے سامان مہیا کرتا ہے۔ پھر قدرۃً اسی میدان میں افراد و اقوام سب کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے نکل جانے میں بھی اسی اعلیٰ درجہ کی عقل و ذہانت سے مطلب برآری کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی مکاریوں اور چالاکیوں سے کام لیتا ہے اور ان کو سیاسیات و معاشیات وغیرہ کی ظاہر فریب و خوشنما اصلاحات میں تعبیر کر کے ننگی کا نام ہی کافور نہیں رکھ دیتا بلکہ ایسا مسحور کر دیتا ہے کہ سیاہ واقعتاً سفید دکھلائی دینے لگتا ہے وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ط

تعلیم یافتہ جانور

لازماً ایسی بے سروپا تعلیم، جس کے تصور میں نہ زندگی کا کوئی سر ہے نہ پیر، نہ ماضی نہ مستقبل، نہ مبدأ و معاد، وہ قدرۃً محض حیوانی یا مادی زندگی کے تعیش و تفوق کے لئے فرد فرد، قوم قوم اور ملک ملک کو ایکدوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما کر دیتی اور انسانی بستیوں میں جنگل کے قانون کے سوا کوئی قانون کارفرما نہیں رہ جاتا البتہ جنگل کے جانور سینگ اور پنجے مارتے، یا دانت سے نوچتے پھاڑتے ہیں۔ وہ بھی ایک نے بہت سے بہت دو چار کو کھا چبا ڈالا، لیکن یہ اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ جانور اپنی عقل و تعلیم کے زور سے ایٹم بم (اور اس سے بھی لاکھوں درجہ بڑھ کر ہائیڈروجن بم) کے ایک ہی وار میں شہر کے شہر، بوڑھوں بچوں، عورتوں، بیماروں کی تمیز کے بغیر نیست و نابود کر ڈالتا ہے اس شتر بے مہار تعلیم کی بدولت ساری زمین شر و فساد سے بھر گئی ہے، جنگوں اور خانہ جنگیوں نے کسی گوشہ میں امن و امان کا نشان نہیں چھوڑا۔ جنگ عظیم اور پھر جنگ عالمگیر کے برپا کئے ہوئے انفرادی و اجتماعی مصائب ابھی ختم نہیں ہوئے بلکہ روز افزوں ہیں کہ تیسری جنگ عالم سوز کے فریق دانت نکال کر نمودار ہو گئے ہیں اور ہاتھ طبل جنگ پر ہے

جہنم بم

امریکہ کے ایک وظیفہ یاب امیر البحر کا مضمون (پاینیر ۳ راکتوبر ۱۹۴۷ء) میں شائع ہوا تھا کہ مختلف قوموں نے دور دراز فاصلوں تک تباہی و بربادی پھیلانے والے ایسے آلاتِ حرب بناتے ہیں جو روئے زمین سے انسانی و حیوانی اور نباتاتی زندگی کا آخری نام و نشان تک مٹا ڈالیں گے" اور یہ ساری برکت انہی بڑے

بڑے نام والے علوم جدیدہ حیاتیات (بیالوجی) جرثومیات (بیکٹریالوجی) موسمیات کلائماٹولوجی) وغیرہ کی ہے جن پر عصر جدید کی ترقی وتعلیم کو سب سے زیادہ فخر ہے۔
ہائیڈروجن بم کے متعلق پانیر ہی (۲۶ر فروری ۵۰ء) میں ایک مضمون جہنم بم کے نام سے نکلا ہے کہ ایٹم بم اگر دس مربع میل پر تباہی نازل کرتا تھا تو ہائیڈروجن بم ۳، ۴ سو مربع میل کو جہنم بنا دیگا۔ اور ہمارے زمانہ کے سب سے بڑے مشہور سائنسدان آئنسٹائن کا بیان ہے کہ

اس کا زہر ساری فضا میں پھیل کر کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑے گا۔

(صدق ۱۰ر مارچ ۱۹۵۰ء)

خود ہمارے ملک ہندوستان میں اسی تعلیم جدید کی حاصل کردہ آزادی کی برکات نے چند ہفتے کے اندر ہی کشت وخون کی آزادی کا جو ناقابل بیان بازار گرم کیا اور جس کی آزادی کا سلسلہ ہندوستان وپاکستان دونوں جگہ کم وبیش چلا ہی جارہا ہے وہ آنکھوں کے سامنے ہے سینکڑوں ہزاروں نہیں لاکھوں انسان، جان وایمان جاہ ومال، عزت وآبرو، وطن ودیار سے محروم کئے جاچکے، سفر وحضر میں کہیں امان نہیں، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آگے اور کیا کیا دیکھنا پڑے گا۔ اسی کو عارف رومی فرماتے ہیں کہ ؎

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

تعلیم جدید کا مبلغ پرواز

اگر کشت وخون، شر وفساد کے اس وبال ونکال تک بفرض محال نوبت نہ بھی آئے تب بھی تعلیم جدید کا رقاص (پنڈلم) اپنے بے آغاز وبے انجام تصوّر

تعلیم کی رو سے قدرتاً صرف نفسانی و حیوانی زندگی کی لذت و مسرت جاہ و مال کے مابین ہی رقص کرنے پر مجبور ہے۔ علم و تعلیم کے اس مبلغ پرواز کا ایک دلچسپ تجربہ خود حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے نقل فرمایا ہے کسی مقام پر حضرت کی

وہ ایک انگریز جنٹ سے اس کی خواہش پر ملاقات ہوئی، دوران گفتگو میں اس نے پوچھا کہ ہم نے سنا آپ نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے تو آپ کو کتنا روپیہ ملا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے دل میں کہا کہ واہ و ابس یہ ہے آپ کا مبلغ پرواز اور مطمح نظر۔ جب میں نے کہا کہ کچھ نہیں ملا، تو بڑے تعجب سے پوچھا کہ اتنی بڑی کتاب لکھی اور کچھ بھی نہ ملا تو پھر کیا فائدہ اتنی محنت ہی کیوں کی .... خیر میں نے اس کے مذاق کے مطابق اس کو سمجھایا کہ اس سے مجھے دو فائدے ہوتے ایک تو یہ کہ علاوہ اس زندگی کے ہم مسلمانوں کے اعتقاد میں ایک دوسری زندگی بھی ہے وہاں ایسے کاموں کا اجر ملنے کی ہم کو توقع ہے"

یہ تو صاحب کے مبلغ علم کی سمجھ میں کیا آتا۔ البتہ آگے جب حضرت نے فرمایا کہ:۔

دوسرا فائدہ دنیا کا بھی ہے کہ میں نے یہ تفسیر اپنے بھائی مسلمانوں کے فائدہ کے لئے لکھی ہے جب اپنے بھائیوں کے ہاتھ میں دیکھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے کہ میری قوم کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے چونکہ یہ تقریر اس کے مذاق کی تھی اس کی نظر میں میری بڑی وقعت ہوئی غرض جو روپیہ پیسہ اور جاہ کو مقصود سمجھے گا وہ ضرور ایسے شخص کو کہیگا کہ بڑا بیوقوف ہے کہ محض دین کے لئے اپنا جاہ و مال سب برباد

کر دیا۔ (وعظ طریق القلندر صفحہ ۳۵ و ۳۶)

لاکھوں کروڑوں کے سامانوں اور فلک بوس ایوانوں کے اندر بڑے بڑے دعووں کے ساتھ آج کل جو تعلیم دی جاتی ہے بھلا بتائیے کہ اس کا مبلغ پرواز اس فانی و مادی زندگی کے جاہ و مال لذت و مسرت کے سوا کیا ہے، بہت بلند اڑے تو انفرادی سے آگے اجتماعی یا قومی و ملکی یا نرے زبانی دعووں میں اور بھی اونچے اڑے تو ساری انسانیت کے لئے انہیں چند روزہ حیوانی منافع و نفسانی لذات کو مطمح نظر بنالیا۔ جب فرد قوم یا انسان زیادہ سے زیادہ ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان ہے اور دیگر حیوانات کی طرح کھاپی کر مرجانے کے سوا اس کا اور کوئی انجام نہیں تو پھر اس کی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ حیوانی لذات و فوائد فراہم کرنے سے آگے نظر آخر جا ہی کیسے سکتی ہے خواہ اس کا نتیجہ بالآخر اعلیٰ درجہ کے حیوان سے ترقی کر کے اعلیٰ درجہ کا شیطان بن کر خود اس دنیاوی زندگی کی خودکشی اور اس کے امن و امان بلکہ ساری آبادی کی بربادی کی صورت میں ظاہر ہو۔

اسلامی تصور انسان

سو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے تصور میں انسان نہ نرا اعلیٰ درجہ کا حیوان ہے نہ اسلام کا تعلیمی تصور اس کی عارضی و ضمنی حیوانیت کو ترقی دے کر اس کو اعلیٰ درجہ کا شیطان بنانا چاہتا ہے، انسان، انسان ہے اور اس کی تعلیم کا مقصد اس کو انسان کامل بنانا ہے اسلام کی نگاہ میں انسان کی اصلی انسانیت نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (کہ انسان کے اندر میں نے اپنی روح پھونکی ہے) والی الٰہی روحانیت ہے اس روحانیت کے مطالبات اتنے اعلیٰ و نامحدود ہیں کہ ان کی سمائی دنیا کی ادنیٰ و محدود زندگی میں ناممکن ہیں وہ اس زندگی کو آغاز و انجام سے

ناآشنا، یا ماضی و مستقبل سے غیر مربوط لا یعنی و عبث قرار نہیں دیتا بلکہ اس فانی و محدود کا دامن ایک غیر فانی و غیر محدود ذات و انجام سے بندھا ہوا ہے (وَاللّٰہُ خَیۡرٌ وَّاَبۡقٰی - وَالۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ وَّاَبۡقٰی) اور دینی تعلیم کا مقصد دنیاوی زندگی کو اسی خیر و ابقیٰ کے شایانِ شان بنانا ہے، نہ کہ انجام و منزل سے آنکھیں بند کر کے خود راستہ ہی کو منزل بنا لینا، اور اس طرح خوردن برائے زیستن، اور پھر زیستن برائے خوردن کے چکر میں جان دے دینا، جس کو راقم ہذا اس گندی زندگی کے مناسب گندی مثال میں طعام خانہ اور پاخانہ کے درمیان چکر کاٹنے کی زندگی کہا کرتا ہے اور اسی چکر میں جانوروں کی طرح مر جانا۔ اور کبھی یہ سوال تک نہ پیدا ہونا کہ کھانا پینا سب کچھ ہمارے لئے، تو ہم آخر کس لئے؟ دین اور تعلیم دین دراصل اسی کا جواب ہے، کہ ہمارا حقیقی مقام و مطلب
اس کائنات میں کیا ہے بالفاظ دیگر تمام علوم و فنون کا موضوع انسان کی اس دنیوی زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ کی مادی و حیوانی ضروریات و حاجات کو پورا کرنا ہے اور علم دین کا موضوع (بلکہ دین کی نگاہ میں علم نام ہی اس کا ہے جس کا موضوع) خود اس زندگی کا مقصد و منتہیٰ متعین کرنا ہے اور دینی تعلیم کا مقصد اسی مقصد و منتہیٰ تک پہونچانا ہے۔ اِنَّ لَکُمۡ نِہَایَۃً فَانۡتَہُوۡا اِلٰی نِہَایَتِکُمۡ "اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَہٰی"

چند اشارات

اصل میں تو یہ گفتگو اور زیادہ تفصیل و تطویل کی طالب ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ مستقلاً اپنے موقع پر ہوگی، یہاں مختصراً اہل بصیرت کے لئے چند اشارات عرض ہیں۔

۱۔ انسان اور کائنات کی فطرت وساخت میں ایک اعتبار سے بڑا تضاد ہے۔ انسان کی الٰہی یا روحانی فطرت خیر مطلق، بقائے دوام، اور نامحدودیت کی طالب ہے حتیٰ کہ لباس وطعام، مسکن وقیام کی خالص نفسانی وحیوانی لذات وحاجات تک جن میں دیگر حیوانات اپنی جبلت کی بندھی ہوئی راہ پہ کھاپی کر مرجاتے ہیں ان میں بھی انسان کسی ایک نقطہ پہ چین نہیں لیتا نہ کسی نقص وشر کو باقی رہنے دینا چاہتا۔ بلکہ کامل سے کامل تر اور خوب سے خوب تر کی دھن میں لگا تار رہتا ہے کہ ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

لیکن کائنات کی ساخت ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہاں کی ہر شے محدود فانی اور ہر خیر کے ساتھ شر توأم ہے۔ جو خود اس بات کی فطری دلیل ہے کہ انسان کی یہ زندگی کسی اور زندگی کی طالب ہے جہاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہونی چاہئے کہ انسان کی مشیت نامحدود ہو جائے جو یہ چاہے وہ ہو، جو مانگے وہ پائے۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ ٥	اور تمہارے لئے وہاں ہے جو چاہے جی تمہارا۔ اور تمہارے لئے وہاں ہے جو کچھ مانگو۔

اور یہ زندگی اسی نامحدود زندگی کا محض راستہ ہے نہ کہ خود منزلِ مقصود، اور راستہ کی کامیابی یہی ہے کہ نظر کسی وقت بھی منزل سے روگرداں نہ ہو، نہ کوئی قدم بے راہ پڑے۔

۲۔ اب اگر انسانوں کا کوئی عقلمند قافلہ منزل کو فراموش کر کے راستہ یا مسافر خانہ ہی کی راحت ولذت کے مقابلہ ومسابقت میں لڑ لڑ کر جان دینا ہے تو

اس کی منزل رسی معلوم راستہ بہرحال راستہ ہے، اس میں منزل کی کامل آسودگی کی فکر حماقت کے سوا کیا ہے اس طرح انسانوں کے مختلف افراد اور قافلے (اقوام) اپنی فطرت کے نامحدود مطالبات کا سارا زور اگر اس دنیا کے جاہ ومال محدود مطالبات ولذات پر لگادیں، تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ ہڈی اور کتوں کی جنگ اور خودکشی کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے، خدا کو بھولنے کی سزا ہی یہ ہے کہ خود کو بھول جائیں۔

نَسُوا اللّٰہَ فَاَنسٰاھُمْ اَنْفُسَھُمْ — اللہ کو بھلا دیا پھر اللہ نے بھلا دیئے ان کو ان کے جی۔

بس یہ دو باتیں

اگر سمجھ میں آجائیں، تو اسلامی تعلیم کی اس بنیاد کو سمجھ لینے میں بھی کوئی دشواری نہ ہوگی کہ اس کا اصلی مقصود مستقبل کی اس خیر وابقیٰ زندگی کی فلاح وکامیابی ہے جو انسانی فطرت کے اعلیٰ وحقیقی مطالبات کی کامل آسودگی کا مظہر ہوگی۔ اور موجودہ زندگی کی حیثیت مقصود کی نہیں بلکہ وسائل کی ہے اور اس وسیلہ کو مقصود بنانا ویسی ہی خودفریبی ونادانی ہے جیسے بخیل آدمی خود مال کو مقصود بنا کر اس کے پیچھے عزت وراحت سب کچھ بلکہ جان تک گنوا دیتا ہے اور نتیجہ الٹا یہ ہوتا ہے کہ روپیہ پیسہ جس عزت وراحت کا وسیلہ تھا اسی سے محروم رہتا ہے۔

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ — اور جو بچایا گیا اپنے جی کے لالچ سے، سو وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔

یہی حشر خدا اور آخرت کو فراموش کرکے جاہ ومال پر جان دینے والی تعلیم کا ہے

کے سامنے ہے کہ خود دنیا بھی اس کی بدولت آخر کار جہنم بن کر رہی، افراد و اقوام سب اسی جاہ و مال کی آتش رقابت میں بھسم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور قلب کا آرام و اطمینان یا دل کا سکھ چین نہ حکومت و وزارت کی کرسیوں پر نصیب، نہ صنعت و تجارت کے کارخانوں اور کوٹھیوں میں، سب کے سینہ میں هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کی بھٹی دھک رہی ہے زندگی تنگ و وبال جان ہو کر رہ گئی ہے

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ؕ — اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملنی ہے گذران تنگی کی۔

راز وہی ہے کہ جب مطلوب قلیل و محدود ہو اور طلب کثیر و نا محدود، تو اہل طلب میں رقابت و مخاصمت ناگزیر ہے، دنیا کا حال یہی ہے کہ یہ اور اس کی ہر شئے جاہ و مال، حکومت و تجارت، لذت و راحت، سب ہی انسان کے نا محدود مطالبات کے مقابلہ میں نہایت محدود، اس لئے اگر سارا زور ان ہی کی مطلوبیت پر صرف کر دیا جاتے اور تعلیم یہ ہو کہ اس فانی و محدود زندگی کے ان فانی و محدود مطلوبات کے سوا نہ آگے کوئی خیر و ابقیٰ مطلوب ہے نہ خیر و ابقیٰ کی زندگی، بس جو کچھ ہے یہی محدود ناقص دنیا، اور یہی ناقص و فانی زندگی جس کو جو کچھ لینا ہے یہیں سے لے۔ تو یہ جنگ و خانہ جنگی کا علانیہ اعلان و مبارز نامہ نہیں تو اور کیا ہے اور اس راستہ پر چل کر بالآخر اگر ساری زمین قومی و بین الاقوامی کارزار کا میدان بن گئی تو تاسف جتنا ہو، لیکن تعجب کی کیا بات ہے پھر اندھیر کا کچھ ٹھکانا ہے کہ الٹے دین کی تعلیم ہی کو شر و فساد کی جڑ مشہور کر دیا گیا، جو اس محدود و فانی دنیا کے محدود و فانی مطلوبات و لذات سے انسان کی نظر کو اونچا کر کے اس کی اصلی فکر و عمل کی عنان کو باقی و نا محدود کی طرف موڑ دینا چاہتی ہے کیونکہ خدا و آخرت ہی ایک ایسا غیر فانی و غیر محدود مطلوب ہے

جو ایک طرف انسان کی غیر محدود طلب کی تمام وکمال تشفی وآسودگی کا ضامن ہو سکتا ہے اور دوسری طرف اس دنیا کے فانی ومحدود حیوانی ومادی مطلوبات ولذات سے نظر کو اونچا کرکے جاہ ومال تجارت وصنعت، حکومت وسیاسیات کی باہمی عداوت ورقابت اور روز روز کے فساد وخونریزی سے نجات بخش سکتا ہے اس لئے کہ خدا وآخرت دنیاوی دولت وحکومت کی طرح کوئی ایسی حقیقت نہیں کہ اگر اس کے ایک حصہ پر کسی ایک کا قبضہ ہو جائے تو دوسرے کے لئے اس سے بھی زیادہ بلکہ زیادہ سے زیادہ کی گنجائش نہ رہے تو پھر لڑائی جھگڑے کی گنجائش کہاں! نہ دین نے دنیاوی حکومت وتجارت ولذت وراحت جاہ ومال میں تفوق وبرتری کے لئے جنگ وجدال کی اجازت دی ہے بلکہ اس کی جنگ تو صرف انہی لوگوں سے ہے جو انسان کو اس کے اصل مطلوب ومقصود، وخدا وآخرت کی راہ سے روک یا کج راہ کرکے تمام تر مادی ونفسانی لذات ومطلوبات میں فنا کرکے انسان کے بجائے حیوان بنا دینا چاہتے ہیں

اَلَّذِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَیَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ کَافِرُوۡنَ ٥

جو روکتے تھے اللہ کی راہ سے اور ڈھونڈھتے تھے اس میں کجی اور وہ آخرت سے منکر تھے۔

زہر کا نام تریاق

باقی جو لوگ دین کا نام لے کر دنیا ہی کے مقاصد کے لئے لڑتے مرتے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں وہ دین کی نگاہ میں خالص دنیا پرستوں سے بھی بڑھ کر مجرم ہیں کہ خدا کی باتوں کو کوڑیوں کے دام فروخت کرتے ہیں۔ یَشۡتَرُوۡنَ

بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا) اور اگر کوئی زہر کا نام تریاق رکھ کر پینا پلانا شروع کر دے تو نتیجہ زہر ہی کا برآمد ہو گا تریاق کا کیا قصور؟ دین سچ پوچھئے تو زیادہ تر صرف اپنے دوست نما دشمنوں ہی کے ہاتھوں بدنام ہوا۔ اور ہو رہا ہے۔

غرض دیکھا جائے تو ہمارے موجودہ انفرادی واجتماعی مصائب ومفاسد میں سب سے زیادہ حصہ اس موجودہ نظام تعلیم ہی کا ہے جس نے خدا و آخرت کی مطلوبیت ومقصودیت کو عملاً زندگی سے خارج کر کے صرف جاہ ومال حکومت وتجارت اور نفسانی وحیوانی لذت وراحت کو انسان کا مطمح نظر اور مبلغ پرواز بنا دیا ہے مختومیت قلب کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ افراد کی بیدینی والحاد پسندی سے گذر کر اب حکومتیں اپنا سب سے بڑا دانشمندانہ کارنامہ یہ قرار دیتی ہے کہ اپنے بے دین یا لادینی (سیکولر) ہونے کا فخریہ اعلان وتبلیغ کرتی رہیں۔

جو اپنے دین کو پہلے ہی کھو چکے ہیں وہ گمراہی میں جتنی دور بھی نکل جائیں چنداں تعجب نہ تھا۔ غم وغصہ تو اپنے حال پر ہے جو زندہ وپائندہ دین کی شاہراہ پر (صراط مستقیم) پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اس کی طرف بلانے کے بجائے خود ان کی آواز میں آواز ملانے اور راہبری کا منصب چھوڑ کر گمراہوں کے پیچھے چل پڑے ہیں

فَمَاذَا بَعۡدَ الۡحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ط

تجدیدِ تعلیم

اس گم کردہ راہ دنیا کے ازسر نو راہ پر آنے کی فقط ایک ہی صورت ہے کہ قدرت کی طرف سے راہنمائی کی مشعل جس امت کے ہاتھ میں دی گئی ہے پہلے وہ خود خداشناسی و آخرت طلبی کی شاہراہ پر آگے آگے ہو اور اس کی فقط ایک ہی صورت ہے کہ خدا و آخرت طلبی کی تعلیم و تربیت اور ساتھ ہی تبلیغ کا ایسا جامع و محیط نظام اختیار کیا جائے جو امت مبعوثہ کے عوام و خواص زن و مرد پڑھے اور ان پڑھے سب کو حاوی اور محیط ہو،

حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے دین کی تعلیم و تبلیغ دونوں کی ایسی ہی جامع و حاوی تجدید فرمادی ہے کہ اس کے قبول وعمل کے بعد نہ کوئی طبقہ انشاء اللہ محروم رہ سکتا ہے نہ کوئی فرد، لیکن ثمراتِ باغبانی کی کسی بہتر سے بہتر خالی کتاب کے پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتے وہ تو اصول و قواعد کے موافق باغ لگانے ہی سے حاصل ہوں گے۔ آگے ان ہی اصول و قواعد کی تفصیل و تجدید ملاحظہ ہو

جامع[1] المجددین میں تعلیم الدین، اصلاح انقلاب اور بہشتی زیور وغیرہ کے مضامین کی تفصیل سے اتنا بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کا بیش بہا جامع و کامل دین کی جامع و کامل اصلاح و تجدید تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت کے ہاتھوں بوجہِ اتم اس کو پورا فرما کر امت

---

[1] مؤلفہ مؤلف ہذا۔

پر اتمام حجت فرما دیا۔

خود حضرت علیہ الرحمۃ بطور تحدیث نعمت فرمایا کرتے تھے کہ الحمد للہ دین و طریق صدیوں کے لئے صاف و بے غبار ہو گیا۔ اب بڑا سوال یہ ہے کہ اس تجدید یافتہ کامل و جامع دین کی تعلیم و تبلیغ کا امت کے سارے طبقات، عوام و خواص، ذکور و اناث میں اجرا کیونکر ہو، مسلمانوں کے دینی و روحانی امراض کے بنیادی اسباب حضرت علیہ الرحمۃ کی تشخیص کی رو سے دو ہیں بڑا اور پہلا سبب قلت علم، یعنی علوم و احکام دین سے بے خبری ہے ظاہر ہے کہ آدمی اپنے برے بھلے کو اگر جاننے کی طرح جان لے تو جان بوجھ کر اپنے نفع و ضرر سے کون بے پرواہ ہو سکتا ہے، سقراط نے تو اسی تعلیم کی بنا پر تعلیم اخلاق کا اصل الاصول یہی قرار دیا تھا کہ "علم ہی نیکی ہے" غرض دین کی تعلیم و تبلیغ کے نظام میں بھی ایسی جامع و ہمہ گیر اصلاح و تجدید کی حاجت تھی کہ اس کے مطابق اگر انتظام کر لیا جائے تو کسی طبقہ اور کسی فرد کے لئے بھی بجز اپنی کوتاہی و کم نصیبی کے محرومی کا کوئی جائز عذر نہ رہ جائے۔

تعلیم و تبلیغ کی ان اصلاحی و تجدیدی صورتوں اور تدبیروں کا کچھ ذکر اصلاح انقلاب[1] پر گفتگو میں گذر چکا ہے اس کے علاوہ ایک مستقل رسالہ حقوق العلم کے نام سے اور کئی وعظ۔ آداب تبلیغ اور الدعوۃ الی اللہ وغیرہ کے نام سے ہے آگے ان پر مختصر گفتگو ہے

علم دین کے دو درجے فرض عین و فرض کفایہ

جس طرح دنیوی تعلیم کے دو معیار یا درجات قرار دیئے جاتے ہیں، ایک

---

[1] دیکھو جامع المجددین از صفحہ ۲۴۲

لازم (کمپلسری) جس سے کسی فرد کو مستغنی و مستثنیٰ نہیں سمجھا جاتا، اور دوسرا اس کے اوپر کا درجہ جس میں خاص خاص ضرورتوں کے لحاظ سے مختلف علوم وفنون داخل ہوتے ہیں۔ اسی طرح دینی تعلیم کی بھی ایک مقدار لازم وواجب ہے جس سے کسی دینی زندگی بسر کرنے والے کا استغناء واستثناء جائز نہیں یعنی مختلف شعبوں کے وہ ضروری شرعی احکام جن سے کم وبیش سب کو سابقہ پڑتا ہے اس کی نسبت ارشاد ہے کہ:۔

"علم دین کی دو مقداریں ہیں ایک یہ کہ ضروری عقائد کی تصحیح کی جائے فرض عبادتوں کے ضروری ارکان وشرائط واحکام معلوم ہوں، معاملات ومعاشرت میں جن سے اکثر سابقہ پڑتا ہے ان کے ضروری احکام معلوم ہوں، مثلاً نماز کن چیزوں سے فاسد ہوجاتی ہے قصر کتنے سفر میں ہے زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہے نکاح کن عورتوں سے حرام ہے رضاعت سے کون کون رشتے حرام ہوجاتے ہیں اجرت ٹھہرانے میں کونسی صورتیں جائز ہیں کونسی ناجائز، لباس کونسا حلال ہے کونسا حرام، نوکریاں کونسی جائز ہیں کونسی ناجائز (اگرچہ بدقسمتی سے ناجائز میں مبتلا ہو مگر ناجائز کو ناجائز ہی سمجھے گا تو دو جرموں کا مرتکب نہ ہوگا ایک تو ناجائز کا ارتکاب دوسرے اس کو جائز سمجھنا) اگر کوئی صاحب حکومت ہے تو اس کو فیصلہ مقدمات کے شرعی قوانین کا علم بھی ہونا چاہئے گو ان کے نافذ کرنے پر قادر نہ ہو۔ مگر جاننا اس لئے واجب ہے کہ شرعی فیصلوں کے ناحق اور غیر شرعی کے حق ہونے کا اعتقاد نہ کر بیٹھے"

اس زمانہ میں مسلمان حاکموں کو غیر اسلامی قوانین کے تحت فیصلے کرنا پڑتے ہیں ان کے لئے یہ امر کتنا ضروری ہے کہ کم از کم اپنے اعتقاد ہی کو درست رکھ سکیں تاکہ نَفْعَلُ و نَسْتَغْفِرُ کے درجے سے تو نہ گر جائیں۔

"ماکولات و مشروبات میں کیا جائز ہے یا ناجائز اسباب تفریح میں کس کا استعمال درست ہے کس کا نادرست، باطنی اخلاق میں محمود و مذموم کا امتیاز، ریا و کبر، ظلم و غضب، حرص و طمع وغیرہ کی حقیقت اور ان کے علاج کا جاننا ضروری ہے تاکہ اپنے اندر ہونا یا نہ ہونا معلوم ہو سکے اور ہونے کی صورت میں ان کے ازالہ کی تدبیر کر سکے اور کوتاہی پر استغفار کرے۔"

"غرض علم دین کی یہ مقدار عام طور پر ضروری ہے کیونکہ بدون اس کے حق تعالیٰ کی ناراضی اور معصیت میں مبتلا ہونا پڑے گا۔"

وہ مسلمان جو آج کل اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اپنے دینی احکام کی مقدار واجب تک سے ان کی لاعلمی کا یہ حال ہے کہ حضرت فرماتے ہیں کہ حقیقی بھانجے کی لڑکی سے نکاح حلال جاننے والا میں نے خود دیکھا باقی نوکری، لباس اور اسباب تفریح میں تو ایسے صاحبوں کے نزدیک کوئی چیز ممنوع ہے ہی نہیں، اور اخلاق میں بجز تفاخر، مسلمانوں کی تحقیر اور حرص دنیا کے جس کا نیا لقب ترقی ہے اور کچھ سیکھا ہی نہیں۔

"دوسری مقدار یہ ہے کہ اپنی ضروریات سے تجاوز کر کے مجموعہ قوم کی ضرورتوں پر لحاظ کر کے نیز دوسری قوموں کے شبہات سے اسلام کو جس مضرت کا اندیشہ ہے اس پر نظر کر کے ایک ایسا وافی ذخیرہ معلومات دینیہ مع اس کے متعلقات و لواحق اور آلات

وخوادم علوم کے جمع کیا جاتے جو مذکورہ ضرورتوں کے لئے کافی ہو۔
پہلی مقدار فرض عین تھی اور یہ دوسری فرض کفایہ ہے، فرض عین
کا یہ حکم ہے کہ ہر ہر فرد انفرادی طور پر اس کا مکلف ہے جو اس
میں کوتاہی کرے گا گنہگار ہوگا اور فرض کفایہ کا حکم یہ ہے کہ
اگر ہر مقام پر ایک ایسی جماعت موجود ہے کہ ان ضرورتوں کو پورا
کر سکے تو سب مسلمان گناہ سے بچے رہیں گے ورنہ یہ سب مسلمان
گناہ میں شریک ہوں گے"

بقدر واجب علم دین کے حصول کی آسان تدبیر

اس تقسیم سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ علم دین کی جس مقدار کا حاصل کرنا ہر
مسلمان پر فرض عین ہے وہ اتنے کم وقت کی طالب ہے کہ حریص سے حریص طالب
دنیا کی دنیا طلبی یا آج کل کی نام نہاد ترقی میں کسی درجہ میں بھی مانع و مخل
نہیں ہو سکتی، راقم احقر تجربہ کی بناء پر عرض کرتا ہے کہ ساری عمر میں صرف
دو تین مہینے وہ بھی پورا وقت نہیں صرف دو تین گھنٹے روزانہ جی لگا کر دیدیئے جائیں
تو اس فرض عین کی ادائی کے لئے بالکل کافی ہیں یعنی دنیاوی علوم کے طالب اور
ترقی کے خواہاں اگر اپنی دس بارہ سال کی طالب علمانہ زندگی میں صرف ایک سال
کی بڑی تعطیل کے صرف دو تین گھنٹے روزانہ حضرت کی تجاویز کے مطابق حضرت
ہی کی کتابوں کے ذریعہ علم دین کی طلب میں صرف کردیں۔ تو آج کل کے نام نہاد
سند لے بھاگنے والے مولویوں کے مقابلہ میں نہ صرف دین کے مسائل و معلومات
کی حد تک بلکہ انشاء اللہ فہم دین اور تعلق مع اللہ میں بھی کمتر نہیں برتر ہی رہیں گے
ابھی اس تحریر کے دوران میں ایک تازہ تجربہ ہوا ہے کہ ایک طالب صادق

تین مہینے کی نیت سے احقر کے پاس آکر مقیم ہو گئے ہیں صبح دو گھنٹے کے لئے مدرسہ فرقانیہ میں کلام مجید کی تصحیح کے لئے جاتے ہیں تیسرے پہر ایک بچے کو پڑھاتے ہیں باقی وقت احقر کی مجوزہ ترتیب کے مطابق حضرت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور عصر و مغرب کے مابین راقم کے پاس بیٹھ کر اس مطالعہ میں اگر کچھ شبہات رہ جاتے ہیں ان کو صاف کر لیتے ہیں اور اسی سلسلے میں کچھ گفتگو ہو جاتی ہے۔ ابھی ایک ہی مہینہ ہوا ہے کہ ایک طرف بحمداللہ پارۂ عم نصف سے زائد صحت مخارج کے ساتھ حفظ کر چکے ہیں جس سے قرأت نماز بقدرِ واجب صحیح ہو گئی، جو ہمارے سندی مولویوں میں بھی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنوں کی ہوتی ہے، دوسری طرف تعلیم الدین، بہشتی زیور اور بہشتی گوہر کے ضروری حصے ذاتی مطالعہ اور احقر سے رفع شبہات کے ساتھ قریب ختم ہیں، کچھ ملفوظات بھی روزانہ پڑھ لینے کی ہدایت ہے، اس کے بعد چالیس مواعظ، یہ پورا نصاب انشاءاللہ تین مہینہ کے اندر ہی پورا ہو جائے گا۔

اسی دوران میں ضروری مسائل و معلومات کے ساتھ حضرت کی کتابوں خصوصًا ملفوظات کی برکت سے دماغ دین کی فہم، اور دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا بھی کچھ نہ کچھ لذت آشنا ہو چلا ہے۔

اب دنیوی تعلیم کے اسکولوں، کالجوں میں پڑھنے پڑھانے والے جو طلبہ و اساتذہ اپنی صرف ایک سال کی تعطیل اور عام مسلمان ساری زندگی میں دو تین مہینے بھی ایک ساتھ یا حسب فرصت متفرق اوقات میں آخرت کی ابدی زندگی و فلاح کے لئے نہیں دے سکتے وہ اپنے ہی گریبان میں سر ڈال کر سوچ لیں کہ ایسی صورت میں کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہنے اور خدا اور رسول کو سچا جاننے اور ان پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ تو ایک ضروری جملہ

معترضہ تھا۔

اصل مطلب یہ ہے کہ جو علم دین فرض عین یا ہر شخص کے لئے فرداً فرداً واجب و لازم ہے اس کے معنی یہ بالکل نہیں کہ ہر شخص کا پورا اور اصطلاحی عالم ہونا لازم ہے کہ دنیوی یا معاشی مشاغل میں خلل کا ذرا بھی اندیشہ و عذر ہو البتہ سارے مسلمانوں کے ذمے

"یہ انتظام ضروری ہے کہ ایک معتدبہ جماعت ایسی بھی ہو جو ہر طرح علوم دینیہ میں کامل و محقق ہو اور عمر کا بڑا حصہ ان علوم کی تحصیل میں اور ساری عمر اُن کی خدمت و اشاعت میں صرف کریں جس کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہو، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی جماعت کا ذکر ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	تم میں ایک ایسی جماعت کا ہونا لازم ہے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلاتی، بھلائی کا حکم کرتی اور برائی سے روکتی رہے ۔

اور حدیثوں میں اصحاب صفہ کی یہی مثال ہے۔

باقی عام مسلمان اسی جماعت سے تقریراً و تحریراً اپنی دینی ضرورتوں کو رفع کیا کریں، جو پڑھنے کے قابل ہیں جیسے بچے یا جو قدرے معاش سے فارغ ہیں ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ اس جماعت سے سبقاً سبقاً کچھ رسائل عقائد و مسائل کے پڑھ لیں۔ پھر نئے پیش آنے والے واقعات کے متعلق وقتاً فوقتاً اس جماعت سے پوچھتے رہیں، اس طرح تھوڑے زمانہ میں بڑا ذخیرہ معلومات کا جمع

ہو جاتا ہے اور جو کسی سبب سے اس طرح نہیں پڑھ سکتے وہ کم از کم ہفتہ میں ایک روز میں گھنٹہ دو گھنٹے نکال کر ایک معین وقت کسی سمجھدار ذی علم سے درخواست کریں کہ ایسے رسائل پڑھ کر سنا اور سمجھا دیا کرے اور ضرورت کے وقت پوچھتے رہنا، یہ تمام عوام بلکہ علماء کے لئے بھی (جو بات ان کو نہ معلوم ہو) واجب ہے پھر ان طریقوں سے زبانی یا کتاب کے ذریعہ جب خود احکام پر مطلع ہو لیں تو اپنے اپنے گھر کی مستورات کو پڑھاتے یا سناتے رہیں۔"

دینی علم کی مقدار واجب کے لئے پڑھا لکھا ہونا بھی ضروری نہیں سماعت و صحبت سے یعنی کتابیں سن سنا کر یا اہل علم کی صحبت و دینی تربیت سے باآسانی اس مقدار واجب کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

امراء کی فرض ناشناسی

اصلی سوال اس مذکورۂ بالا جماعت کے انتظام معاش کا ہے جن کے لئے علوم دینیہ میں کامل و مکمل و محقق ہونا ضروری تجویز فرمایا گیا ہے، اور اس لئے عمر کا بڑا حصہ ان علوم کی تحصیل میں اور پھر تمام عمر ان کی اشاعت میں اور خدمت دین میں صرف کرنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ساری عمر خدمتِ دین کی راہ میں نذر کر دینے کے بعد ان کو کسب معاش کا موقعہ کیسے مل سکتا ہے؟ اس مشکل کا قدرتی و صحیح اور ساتھ ہی سب سے مفید و آسان حل تو وہی ہے جس کی طرف ترغیباً و ترہیباً ہر طرح حضرت علیہ الرحمۃ نے کثرت سے جا بجا اپنی کتابوں اور مواعظ وغیرہ سب میں متوجہ فرمایا ہے کہ امراء کا طبقہ جو بقدر کفایت معاش کی فکر سے آزاد ہے اس کے ذمہ زیادہ حق تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اس

خدمت کے لئے وقف کرتے، پھر اولاد میں بھی جو ذہین وفطین وسلیم وفہیم ہو نہ کہ جو سب سے کوڈن ہو (حقوق العلم ص۳)

اور جو ہزاروں روپے ہندوستان سے لے کر ولایت تک ان کی دنیوی تعلیم پر صرف کرتے ہیں، اسی کی آمدنی (کسی جائداد یا کاروبار میں لاکر) ان کی رئیسانہ وامیرانہ نہ سہی تو متوسط درجہ کی ساری ضرورتوں کو کافی ہو سکتی تھی۔ پھر چونکہ یہ اولاد آسودہ حال گھرانوں کی ہوتی اس لئے قدرۃً بالعموم ان میں وہ دناءت وتنگ نظری وغیرہ بھی نہ ہوتی جو غریبوں میں متوارث ہوتی ہے اور جس کا راسخ اثر علوم دینیہ کی تعلیم سے بھی بہ مشکل دور ہوتا ہے مگر ظلم یہ ہے کہ امراء خود تو اپنی اس کوتاہی پر نادم تو نہیں ہوتے کہ جو خدمت دراصل ان کے کرنے کی تھی وہ بیچارے غریب غرباء کرتے ہیں بلکہ اگر ان غریب گھرانوں کے علماء میں کچھ موروثی اثر سے اخلاق میں خرابیاں رہ جاتی ہیں تو ان کی بناء پر الٹے علماء کی ساری جماعت پر لعن وطعن کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان خرابیوں کو نہایت جسارت کے ساتھ نفس دینی وعربی تعلیم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ بقول حضرت علیہ الرحمہ کے یہ ہے کہ:۔

ان غرباء کو انگریزی تعلیم دی جاتی تو اس سے بھی بدتر حال ہوتا اور امراء وشرفاء کے بچوں کو اگر دینی تعلیم کے لئے وقف کیا جاتا تو ان کے اخلاق وعادات اس سے ہزاروں درجہ بہتر ہوتے جو انگریزی پڑھ کر ہوتے ہیں۔"

بات یہ ہے کہ ایک تو امراء پر امارت کے باوجود بالعموم دنیا طلبی کا غلبہ غرباء سے بھی زائد ہے دوسرے علوم دین کی جو وقعت قلب میں ہونی چاہیئے وہ نہیں، اس لئے وہ امراء تک

جو دینی مکتب و مدارس قائم کرتے ہیں اسلامی و قومی خیر خواہی کا دعویٰ
بھی کرتے ہیں مگر اس کام کے لئے اپنی اولاد کو کبھی تجویز نہیں کرتے
اولاد کے لئے ڈپٹی کلکٹری منصفی، سب ججی و بیرسٹری ہی تجویز
ہوتی ہے اور مولویت کے لئے جس کو بزعم خود ذلیل کام سمجھتے ہیں
ذلیل لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے غور کا مقام ہے کہ جس کام کے
لئے غرباء منتخب کئے جائیں اس کی وقعت ان کے قلب میں کیا ہوگی
اگر یہ کام ضروری و باوقعت ہے اور اس کا اہتمام کرنا قومی و اسلامی
خیر خواہی ہے تو اس شرف کے لئے خود اپنی اولاد کو کیوں نہیں تجویز
فرمایا جاتا،،

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جو کام معزز طبقہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ
عام نظروں میں بھی معزز و ضروری سمجھا جاتا ہے لہٰذا امراء کے ذمہ
بہ نسبت غرباء کے زیادہ حق ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اس خدمت
کے لئے وقف کر دیں پھر اولاد میں بھی جو ذہین و فطین و سلیم و فہیم
ہو نہ کہ جو سب سے کودن ہو،، (ص۸)

علماء و مشائخ کی مہلک خود فراموشی

امراء تو خیر امراء ہی ہیں اب تو بڑے بڑے خاندانی علماء و مشائخ تک جو
نسلہا نسل سے علوم دین کے حامل و خادم چلے آرہے ہیں وہ بھی انگریزی
دانوں کے مقابلے میں خود اپنے اور اپنے دینی علوم کو عملاً ذلیل و حقیر خیال کرتے
اور اولاد کو دھڑا دھڑ اسکولوں اور کالجوں میں پہنچاتے چلے جا رہے ہیں اور
جب امراء و علماء کا یہ حال ہے تو عوام تو بالعموم ان کے پیچھے چلتے ہی ہیں

ان عوام میں بھی خال خال ہی کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا جو دین اور علوم دین کو ضروری اور بادقعت جان کر اپنی اولاد کو اس طرف جانے دیتا ہو، ورنہ خود تکلیف اٹھا کر قرض کر کے بھیک مانگ کے یا اولاد ہی سے ٹیوشن کرا کے زیادہ تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ اگر بی، اے، ایم، اے نہیں تو میٹریکولیٹ ہی ہو جائے اس لئے عوام یا متوسط طبقہ کی جو اولاد عربی مدرسوں میں نظر آتی ہے وہ زیادہ تر کسی مجبوری و بیچارگی ہی سے آجاتی ہے۔

غیر مستطیع علماء کے مسئلہ معاش کا قرآنی حل

پھر بھی عربی و دینی درسگاہوں کی جو کچھ آبادی ہے وہ بہت کچھ غریب عوام و متوسط طبقہ ہی کے دم سے ہے اس لئے بڑا سوال ان کی فکر معاش کا ہو سکتا ہے کہ مولوی بن کر اور ساری زندگی علوم دین کی تحصیل و تبلیغ میں لگا کر آخر کھائیں کہاں سے؟

اس کا مفصل جواب حضرت جامع المجددین رحؒ نے قرآن کی ایک آیت سے دیا ہے جو لفظ بلفظ نقل کرنے کے لائق ہے، آیت یہ ہے

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ	اصل حق ان حاجتمندوں کا ہے جو اللہ کی راہ (دین کی کسی خدمت) میں لگے ہیں جس کی وجہ سے (اپنی معاشی یا دنیوی ضرورتوں کے لئے) دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے ناواقف ان کے سوال سے بچنے کے سبب ان کو تونگر خیال کرتے ہیں (پھر بھی) تم ان کو ان کی

فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ؕ صورت سے پہچان سکتے ہو (کہ یہ حاجتمند ہیں ورنہ یوں) وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے (تو ایسے لوگوں کی خدمت کرنے کو) جو مال خرچ کرو گے یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ تم کو اس کا بھرپور اجر و ثواب دیں گے)

جس سے ایک قاعدہ مفہوم ہوتا ہے جس سے فقہاء نے بہت سے فروع متفرع کئے ہیں۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص کسی کی منفعت کے لئے محبوس ہو تو اس کا نفقہ اسی پر واجب ہے جیسے زوجہ کا نفقہ زوج پر (یہ تو انفرادی وجوب کی صورت ہے دوسری صورت جماعتی وجوب کی ہے) جیسے قاضی و والی کا نفقہ بیت المال پر، جس کا حاصل تمام مسلمانوں پر وجوب ہے (کیونکہ بیت المال کا سرمایہ تمام مسلمانوں کا ہوتا ہے) لہٰذا جب یہ جماعت خدمتِ دین کے لئے (جو مدلول ہے فی سبیل اللہ کا) محبوس و وقف ہے (جو مدلول ہے اُحْصِرُوْا کا) تو ان کے حوائج کی بقدرِ کفایت تکمیل (جو مدلول ہے فُقَرَاء کا) مسلمانوں کے ذمہ واجب ہے (جو مدلول ہے لامِ استحقاق کا) تو اب اس جماعت کے مصارف کی کفالت جمہور مسلمانوں کا کام ہے خواہ تعین کے ساتھ جیسے مدرسین و واعظین کی تنخواہ خواہ بلا تعین جیسے متوکلین کی خدمت، پس یہ شبہ منقطع ہو گیا کہ مولویوں کی جماعت کھائے کہاں سے۔

اس آیت سے اور بھی چند فوائد نکلتے ہیں جن کو گو اس بحث میں دخل نہیں مگر تعلق ہے اس لئے ذکر کئے جاتے ہیں!

ایک یہ کہ ایسی جماعت کو تحصیل معاش میں بالکل مشغول نہ ہونا چاہئے جیسا کہ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ اسی پر دلالت کرتا ہے اور اس سے وہ الزام بھی جاتا رہا جو عوام الناس علماء پر طلب معاش میں اپاہج ہونے کا لگاتے

ہیں، بلکہ اس معنی میں ان کا اپاہج ہونا ضروری ہے۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ ایک شخص سے دو کام پوری طرح ہوا نہیں کرتے خصوص جب ایک کام ایسا ہو کہ ہر وقت اس میں مشغول رہنے کی ضرورت ہو خواہ ہاتھ کو خواہ زبان کو، خواہ دل کو، خدمت دین ایسا ہی کام ہے اور علوم دینیہ کی تدریس یہ ذرائع معاش میں داخل نہیں۔ بلکہ اس کی تنخواہ بوجہ خدمت دین میں محبوس ہونے کے ہے اور تنخواہ کی تعیین اس مصلحت سے ہوتی ہے کہ نزاع نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کو کسی دنیا دار کے سامنے اپنی حاجت پیش نہ کرنا چاہئے بلکہ اغنیاء کی طرح مستغنی رہیں جیسے یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ اس پر دال ہے۔

واقعی ان آیات میں دین اور خادمانِ دین دونوں کی خدمت کا ایسا سہل و شائستہ اور تمام مفاسد سے پاک و صاف انتظام اور ساری مشکلات کا حل اور سارے شبہات کا جواب موجود ہے کہ اگر دنیا کے معمولی معاملات کے برابر بھی ہمت و اہتمام سے کام لیا جائے تو اپنے پرائے کوئی بھی دین کی تعلیم و تبلیغ سے محروم نہیں رہ سکتے، حالانکہ دین کا حق اور عاقبت اندیشی کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی دنیا کے بڑے سے بڑے کام کے مقابلے میں بدرجہا زائد ہمت و اہتمام سے کام لیا جاتا۔ لیکن جب غفلت اور ناعاقبت اندیشی کا یہ حال ہو کہ دین کے بڑے سے بڑے معاملے کی دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے کے برابر بھی فکر نہ ہو۔ تو مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی یہی غفلت خسرانِ آخرت نہیں خسرانِ دنیا کا بھی سبب ہے، اس لئے کہ ان کی فلاح دنیا کا دامن فلاحِ دین کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور ان کو اپنی دنیا کا قیاس غیروں کی دنیا پر ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

علماء پر اعتراضات کی تحقیق

آگے کچھ ان سطحی اعتراضات پر گفتگو ہے جو بالعموم مولویوں اور عربی پڑھنے والوں پر دنیاداروں کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مولوی ہو کر پست خیالی، کم ہمتی ذلت پسندی، تنگ نظری، دنائیت، نیز قوتِ انتظامیہ کی کمی، وغیرہ صفات رذیلہ پیدا ہو جاتی ہیں اور اس لئے اپنی اولاد کے لئے مولویت کو پسند نہیں کرتے۔ ان الزامات میں جتنی واقعیت ہے اس کا اور اس کے واقعی اسباب کا ذکر تو آگے آتا ہے، پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ زیادہ تر ان کی بنیاد برعکس نہند نام زنگی کافور پر ہے کہ لوگ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کہنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ یعنی دنیاداروں نے

دنیا میں مالی ترقی نہ کرنے کو پست خیالی اور اس ترقی کی فکر و تدبیر نہ کرنے کو جو قناعت ہے کم ہمتی اور اخلاق میں جاہ و کبر حاصل نہ کرنے کو اور وضع میں سادگی اختیار کرنے کو ذلت پسندی اور اپنے پرائے کے حقوق کے امتیاز کو تنگ چشمی اور اسراف نہ کرنے کو دنائت اور دنیوی فضولیات میں انہماک نہ ہونے کے سبب اپنے بعض مصالح میں فروگذاشت کو قوت انتظامیہ کی کمی کا نام رکھ لیا ہے"

سو اکثر اہل علم میں ان امور کا ہونا مسلم، مگر یہ رذائل ہیں یا بخلاف دنیاداروں کے زعم کے فضائل، تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس فیصلے کے لئے قرآن مجید و حدیث کافی ہے۔

قرآن میں ہے کہ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ

الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ط

(۲) اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُہُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّہُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ط

(۳) اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ہ

(۴) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ط

(۵) وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ

(۶) اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ۔ وغیرہ آیات

اور ان کے علاوہ حدیث کی کثیر روایات میں غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ صفات مذکورہ جو اہل علم میں پائے جاتے ہیں آیا رذائل ہیں یا فضائل، اور معترضین نے ان کا نام رذائل رکھ کر ان کے مقابل میں جو فضائل ٹھہراتے ہیں نصوص میں ان پر وعیدیں وارد ہیں اور شریعت میں ان کے نام یہ ہیں۔ حرص، طولِ امل کبر، عجب، اتلافِ حقوق، اسراف و تبذیر، حبِّ دنیا، غفلت من الآخرہ

شریعت سے قطع نظر اخلاقی اعتبار سے بھی حرص وغیرہ کا شمار اخلاق ذمیمہ ہی میں ہے اب ان صفات کو بھی سن لیجئے جو علوم دین نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں اور اس حالت میں اور زیادہ پیدا ہوتی ہیں جب کہ علوم دین نہ ہونے کے ساتھ دوسرے علوم باطلہ یا صحبتِ اہلِ باطل نے بھی اثر کیا ہو، ان کے عنوانات یہ ہیں :-

قارونیت، فرعونیت، ظلم وحمق، عجز بزہ، جن کا حاصل بالفاظ دیگر وہی حرص وطول امل وغیرہ ہے تو اگر علمائے دین کو پست خیال ذلیل وغیرہ کہا جاتے تو اس سے زیادہ ضروری ہے کہ مقابل کی جماعت کو فرعون وقارون کہا جائے ''

اور اگر ان الفاظ کے صحیح معنٰی لئے جائیں یعنی پست خیالی، یہ کہ فقط اپنی تن پروری و شکم پروری سے مطلب ہو اور دوسروں کو نفع پہنچانے کا خیال نہ ہو، اور کم ہمتی یہ کہ مشقت سے گھبرائے آرام کی فکر میں رہے گو اس سے ضروری حقوق تلف ہونے لگیں، اور ذلت یہ کہ مال کو آبرو پر مقدم رکھے، اور اس کی تحصیل میں غیرت وحیا کو طاق پر رکھ دے، اور تنگ چشمی یہ کہ ذرا ذرا چیز میں بخل کرے، شریعت و مروت کو چھوڑ دے، تعلقات واجبہ کی پرواہ نہ کرے اور دنائت وہی جو حاصل ہے ذلت و تنگ چشمی کا اور قوتِ انتظامیہ کی کمی یہ کہ اوقات کا پابند نہ ہو، جن ضوابط و آداب معاشرت کے ساتھ دوسرے کے مصالح وابستہ ہوں ان کے خلاف کرے جس سے ان کی مصلحتیں فوت ہوں۔

علماء کی اخلاقی کمزوریاں علم دین کا اثر نہیں ہیں

تو بلا شبہ یہ اخلاق رذیلہ ہیں اور یہ بھی مسلّم ہے کہ بعض محصلین علم میں یہ رذائل پائے جاتے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ علم دین کا خدانخواستہ اثر ہے یا کسی اور چیز کا۔ اس کا فیصلہ اس طرح نہایت آسان ہے کہ یہ اخلاق رذیلہ سب اہل علم میں پائے جاتے ہیں یا بعض میں پائے جاتے ہیں اور بعض میں نہیں۔ شقِ اُولیٰ مشاہدہ سے غلط ہے، اور دوسری شق سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ یہ علم دین کا اثر نہیں ورنہ سب میں ہوتا۔

تو ضرور یہ کسی دوسری چیز کا اثر ہے جو میری تحقیق میں خاندان و صحبت کی کمی ہے یعنی بعضے خاندانی حیثیت سے پست و دنی ہوتے ہیں اب اگر صحبت بھی نصیب نہ ہوگی تو نری تعلیم بھی کافی نہیں، لامحالہ ان میں خاندانی رذائل موجود اور ظاہر ہوتے رہیں گے۔ لیکن ان کے مقابل میں ان اہل علم کو کیوں

نہیں دیکھتے، جو عالی خاندانی یا فطرۃً سلیم ہیں یا صحبت نے ان کو درست کردیا ہے۔ اور افسوس ہے کہ اس وقت عالی خاندان لوگوں نے چونکہ سرتاپا انگریزی کو اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اور عربی کثرت سے ایسے ہی لوگ پڑھتے ہیں جو خاندانی طور پر دنی، دیہات میں رہنے کے سبب سے صحبت و تہذیب سے محروم ہوتے ہیں اور اس میں تبدیل کے اسباب جمع نہیں ہوتے تو لامحالہ بہت سے لوگ ایسے ہی نظر آئیں گے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم دین نے پھر بھی ان کو کسی قدر مہذب بنادیا ہے ورنہ اور زیادہ بے تہذیب ہوتے۔ اگر ایسی طبیعت کے لوگ انگریزی پڑھتے تو ان سے بھی زیادہ رذائل ان میں پائے جاتے۔

زیادہ الزام معزز طبقہ پر ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس الزام کا زیادہ مورد معزز طبقہ ہے جس کے علم دین سے اعراض کی بدولت ادنیٰ خاندان کے لوگ اہل علم میں زیادہ پائے جاتے ہیں جن کو دیکھ کر بقاعدہ للاکثر حکم الکل سب پر یہی گمان کیا جاتا ہے حالانکہ اگر خاندانی لوگ اپنی اولاد کو علوم دین میں کامل بناتے تو ان میں کثرت سے علما پائے جاتے اور بوجہ علو خاندان ان میں فضائل طبعیہ زیادہ ہوتے اور رذائل مفقود ہوتے، تو جب اکثر علماء ایسے نظر آتے تو للاکثر حکم الکل کے قاعدے سے عام طور پر علماء کو فضائل اخلاق کا جامع سمجھا جاتا اور علم دین سے بدگمانی نہ ہوتی، چنانچہ جو علماء خاندانی ہیں خصوصاً جن کو اہل طریق کی صحبت میسر ہو گئی ان میں کسی کو پست خیال، کم ہمت، تنگ چشم دکھاتے۔ گو ساز و سامان ان کے پاس امیرانہ نہ ہو۔ پھر بھی ان کی شان یہ ہے کہ ع

شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

بلکہ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ بدوں علمِ دین کے فضائلِ اخلاق و سیر چشمی و بلند نظری، عالی دماغی، تہذیب اعتدالِ افعال، و انتظامِ اقوال میسر ہونا ممکن نہیں۔ چنانچہ بے علم امراء میں ان اخلاق کا نام نہیں ہوتا لیکن مال کی بدولت خوشامدیوں کا اجتماع رہتا ہے اس لئے ان کے عیوب پر پردہ پڑا رہتا ہے

مولوی سے مراد عالم باعمل ہے

سب سے بڑی اور آخری بات یہ ہے کہ مولوی سے مراد عالم باعمل ہے! جس کا نام چاہے آپ درویش رکھ لیجئے جو ایسا نہیں وہ ہمارے نزدیک مولویوں میں داخل نہیں، ہم صرف عربی جاننے والے کو مولوی نہیں کہتے، مصر و بیروت میں بہت سے عیسائی و یہودی عربی دان ہیں۔ (حتیٰ کہ علومِ اسلامیہ کے بڑے بڑے واقف ہیں مصر و بیروت کے علاوہ خود یورپ میں) تو کیا ہم ان کو مقتدائے دین کہنے لگیں گے؟

یا مثلاً اہل علم کی وضع و لباس اکثر سادہ کبھی اپنے گھر کا دھلا ہوا، کبھی پیوند لگا ہوا کبھی بند یا بٹن کھلا ہوا، دیکھا جاتا ہے اس سے ان پر تذلل کا شبہ کیا جاتا ہے حالانکہ یہ تواضع ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عزت کا مدار استغناء اور تذلل کا احتیاج ہے لباس و وضع کو اس میں دخل نہیں، اگر کپڑے پرانے ہیں اور ہفت اقلیم کا بھی دست نگر نہیں تو وہ معزز ہے، اور اگر لباس و وضع نوابوں کا سا ہے، ہزاروں روپیہ تنخواہ ہے ہزاروں روپیہ کی جائداد کی آمدنی ہے سامان امیرانہ ہے مگر نظر اس پر ہے کہ اس مقدمہ میں کچھ اور مل جائے فلاں معاملے میں کچھ اور ہاتھ آجائے تو ایسا شخص بالکل ذلیل ہے۔

ہمارے جدید تعلیم کے معترزین اگر عزت و ذلت کے اس صحیح معیار کو پیشِ نظر رکھ کر خود اپنی عزت کا کچھ مشاہدہ فرمائیں تو انشاء اللہ پھر دین کی تعلیم والوں پر ذلت کی نگاہ ڈالنے یا اپنی اس بلند ہمتی کے مقابلہ میں ان کو پست ہمت کہنے کی ہمت نہ ہوگی۔

پھر اگر عالم دین واقعی عالم دین ہے تو اس کو اپنے دینی و علمی مشاغل نماز روزہ تہجد و تلاوت، درس و تدریس، تعلیم و تبلیغ وغیرہ میں انہماک سے خود اپنے بناؤ سنگار کی طرف توجہ کیسے ہو سکتی ہے کہ ہر وقت بالوں کی درستی اور پتلون کی شکن پر نظر رکھ سکے

"یہ شخص تو قومی انجن کا ڈرائیور ہے، ڈرائیور کو غسل اور صابون ملنے کی اور کپڑوں کو جھاڑنے کی فرصت کہاں، اگر فسٹ اور سیکنڈ کلاس کے متنعم اس پر اعتراض کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ ہم ولایت اسی کی بدولت پہنچے ہیں اور وہاں سے ڈگریاں حاصل کر کے فسٹ و سیکنڈ میں سفر کر رہے ہیں، تو نادانی کے سوا کیا ہے"

اور علوم دین پر کیا موقوف، علومِ دنیا کے جو سچے اور پکے طالب ہوتے ہیں وہ بھی اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں عورتوں کی طرح بناؤ سنگار کی فرصت نہیں رکھتے

تعصب اور غصہ کا اعتراض

کچھ اس طرح کے اعتراضات بھی غریب مولویوں پر کئے جاتے ہیں کہ یہ کسی سوال کا جواب نہ بن پڑنے پر یا غلبۂ تعصب سے غصہ کرنے لگتے ہیں اپنی بات رٹے جاتے ہیں دوسروں کی سمجھنے کا قصد نہیں کرتے باہم حسد و نفسانیت کا زور اور ایک دوسرے کی برائی اور بدگوئی میں لگے رہتے ہیں۔

"اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ انگریزی کے فاضلوں میں یہ اخلاق بدرجہا زیادہ پائے جاتے ہیں ذرا اخلافِ مزاج بات ہو جائے غصہ سے بیخود ہو جاتے ہیں بات بات میں کبر وسخن پروری کا اظہار ہوتا ہے۔ تہذیب کی کمی کا یہ حال کہ جس کی طرف چاہا پشت کر لی جس کی طرف چاہا پاؤں جوتوں سمیت پھیلا دیئے، بزرگوں کا ذرا ادب نہیں ماں باپ تک مساوات، بلکہ تحقیر کا معاملہ، اس سے زیادہ کیا بیحیائی ہو گی۔ کسی بڑے عہدہ کی طلب میں خواہ تنخواہ نہ ملے محض جاہ کے لئے ان کی حسد و نفسانیت، بلکہ تو تو میں میں دیکھنے کے قابل ہوتی ہے"

کالج اور یونیورسٹی تک کی نام نہاد علمی فضا اور ان کی کمیٹیوں وغیرہ کی بحث اور گفتگو اور ان کے آپس کے تعلقات میں حسد و نفسانیت کے جو مناظر چوتھائی صدی سے زیادہ راقم الحروف کے خود ذاتی تجربہ و مشاہدہ میں آتے رہے ان سے نام کا یہ مولوی بھی اکثر شرما جاتا تھا۔

"بس اتنا فرق ہے کہ اگر اہل علم میں ان اخلاق کا کوئی اثر ہو تو اس کا منشاء اکثر دین ہوتا ہے اور ان اہل ترقی میں ان کا منشاء دنیا ہوتی ہے مثلاً مولویوں کو دین کی بات پر غصہ آویگا اور ان حضرات کو دنیا کی بات پر، کیونکہ دین کی خود وقعت ہی ان کے دل میں نہیں اس لئے اُن کو جوش نہیں آتا۔ لہٰذا اپنے کو حلیم اور مولویوں کو تندخو قرار دیا ہے، یہی حال اور اعتراضوں کا بھی ہے یہ تو الزامی جواب تھا اور حقیقی جواب یہ ہے کہ بالکل غلط ہے کہ علماء کو نفس سوال پر غصہ آتا ہے، غصہ اگر آتا ہے تو اس پر کہ سوال ایک تو بطور استفادہ

کے ہوتا ہے اور وہ سوال بھی ضرورت کا ہو، اس پر تو میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ کوئی شخص کسی عالم کا ایک جگہ بھی غصہ نہیں ثابت کر سکتا اور ایک سوال بطور تعنت یا تمسخر و مشغلہ یا محض اعتراض والزام کے لئے ہوتا ہے چونکہ اس میں شریعت کی توہین ہوتی ہے تو جس کے دل میں شریعت کی عظمت نہ ہوگی وہ اس توہین کو کب گوارا کرے گا اسی طرح بعض اوقات سوال میں مخاطب کی اہانت ہوتی ہے اس پر بھی ناگواری ایک طبعی امر ہے جو مذموم نہیں، اسی طرح فضول یا اپنی فہم سے ماورا سوال کیا اور سمجھانے سے سمجھ میں نہ آیا تو بھی غصہ آجانا ایک طبع سلیم کا مقتضا ہے جو بجائے خود ایک کمال ہے، چنانچہ سید الحکماء والعلماء حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا خود بعض لایعنی سوالوں پر غصہ فرمانا کثیر حدیثوں میں وارد ہے کیا اگر کوئی شخص عدالت کی توہین کرے یا عدالت سے کچھ سوال کرے مثلاً ادنیٰ سی بات ہے کہ درخواست پر ٹکٹ لگانے کی نسبت پوچھنے لگے کہ ایسا قانون کیوں مرتب کیا یا اس فیس سے نصف فیس کیوں نہ مقرر ہوئی تو کیا توہین عدالت کو جرم اور اس فضول سوال کو ناگوار اور اگر باز نہ آئے تو موجب غصہ نہ کہا جائے گا، کیا اس غصہ کو اخلاق رذیلہ میں داخل کیا جائے گا؟"

"کیا مطلق غضب وتشدد کا شمار اخلاق رذیلہ میں ہے، اگر کسی کی عفیفہ ماں کے متعلق کوئی براہ شرارت سوال کرے کہ سنا ہے آپ کی والدہ ایک زمانہ میں چکلہ میں بیٹھا کرتی تھی تو کیا کوئی شخص ٹھنڈے دل سے اس کی تغلیط پر دلائل قائم کرے گا یا؟ اگر ایسا کیا تو شرفاء

اس کو بے غیرت قرار نہ دیں گے، یا اگر وہ غضب وشدت سے کام
لے تو عقلاء کے نزدیک غیور وباحمیت نہ ہوگا۔"

یا اگر آپ کا سائیس درخواست کرے کہ مجھ کو اقلیدس کی پانچویں
شکل اس طرح سمجھا دیجئے کہ نہ اس میں اشکالِ سابقہ کا حوالہ ہو
نہ اصولِ موضوعہ ومتعارفہ کا تو کیا آپ سمجھانے بیٹھ جائیں گے یا
فرمائیں گے کہ بھائی یہ تیری سمجھ سے باہر ہے پھر بھی اگر وہ اصرار
کرے تو کیا آپ اس کو گدھا اور اُلّو نہ کہنے لگیں گے۔ اور کیا ایسا
کہنے سے کوئی یہ کہیگا کہ آپ کو جواب نہیں آتا۔"

رہا تہذیب کا معاملہ اس کی نسبت کیسی دقیق وعمیق حقیقت کی جانب اشارہ
فرمایا گیا ہے کہ تہذیب کا معیار صرف مذہب صحیح ہو سکتا ہے، باقی آج کل۔

"تہذیب کا معیار جو یورپ کا رسم ورواج سمجھ لیا گیا ہے تو خود اس معیار
کے صحیح ہونے کی کیا دلیل ہے، کیا اہل یورپ کی کوئی رسم تہذیب سے
گری ہوئی نہیں، معیار دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں، عقلِ سلیم یا مذہب
صحیح، مگر سلیم ہونے کے لئے پھر بھی کسی معیار کی ضرورت ہوگی
کیونکہ عقلیں متفاوت ہیں، بس معیار ہونے کی صلاحیت صرف
مذہب صحیح میں ہو سکتی ہے، جب تہذیب کا معیار مذہب صحیح اور
دین الٰہی قرار دیا گیا تو خلاف تہذیب کا مصداق خلاف دین ہوا۔
تو اب دیکھ لیجئے کہ دین کے خلاف علماء میں زیادہ افعال پائے
جاتے ہیں یا غیر علماء میں اس سے معلوم ہو جائے گا کہ بے تہذیب
کون کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔"

باہمی اختلافات کا شبہ

ایک شبہ یہ ہے کہ مولویوں میں اکثر مسئلوں میں اختلاف ہوتا ہے جس سے لوگوں کو عمل کرنے میں سخت حیرت ہوتی ہے کہ کس پر عمل کریں - جواب یہ ہے کہ کیا اطبا میں باہم اختلاف تشخیص و تجویز میں نہیں ہوتا؟ اور کیا کوئی شخص اپنے مریض کو بلا علاج ہی چھوڑ دیتا ہے؟ کہ اختلاف کی حالت میں کس کا علاج کریں تو لاؤ سب ہی کو چھوڑ دیں بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کون طبیب زیادہ تجربہ کار اور ماہر فن ہے اور کس کے ہاتھ سے مریض زیادہ شفایاب ہوتے ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جس امر کو ضروری سمجھتا ہے اس میں ایسے اختلافات سنگ راہ نہیں ہوتے، پھر کیا ہر اختلاف ہر شخص کے لئے مذموم ہی ہے - اگر ایسا ہے تو چاہئے کہ عدالت میں جب کوئی مقدمہ پیش ہو تو عدالت بجائے اس کے کہ تنقیح و تحقیق کا بار اپنے ذمے لے، محض اس بناء پر کہ یہ لوگ باہم اختلاف کرتے ہیں - اور اختلاف مطلقاً مذموم ہے فریقین کو ہمیشہ سزا دیا کریں کہ ایسے جرم اختلاف کے کیوں مرتکب ہوئے، یا اگر سزا نہ کرے تو کم از کم مقدمہ کو خارج ہی کر دیا جاتے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اہل اختلافات میں سے ہر ایک کو الزام دینا اور دونوں کو محض اتفاق کا مشورہ دینا عظیم غلطی ہے بلکہ پہلے تحقیق کر کے معلوم کریں کہ کون حق پر اور کون باطل پر ہے جو حق پر ہو اس کی طرف ہو کر صاحب باطل کو مجبور کریں اور رائے دیں کہ تم کو اختلاف کرنا جائز نہیں -

فتوے میں مصلحت زمانہ کے لحاظ نہ کرنے کا اعتراض

ایک اعتراض یہ ہے کہ علماء اپنے فتاویٰ میں مصلحتِ زمانہ کا لحاظ نہیں
کرتے وہی پرانے مسائل بتلاتے چلے جاتے ہیں، زمانہ بدل گیا اب علماء
کو چاہئے کہ سود وغیرہ معاملات کو درست قرار دیں۔ اس اعتراض کا
باطل بلکہ مہمل ہونا ظاہر ہے اس لئے کہ شریعت کے احکام اگر کسی بشر
بنائے ہوئے ہوتے تو اس احتمال کی گنجائش تھی کہ اس کی نظر آئندہ مصالح
پر نہ تھی، لیکن جب احکام شرعیہ خدا تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں جس سے
قیامت تک کے مصالح کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی مخفی نہیں
تو یہ احتمال ہی کب ہے کہ ان میں آئندہ مصالح کی رعایت نہیں بلکہ
جس مصلحت کی اس میں رعایت نہیں وہ مصلحت ہی نہیں
رہے اجتہادی احکام تو اجتہاد بھی مجتہد یا علماء اپنے دل سے نہیں کرتے وہ بھی
کتاب وسنت پر ہی مبنی اور اس سے مستنبط ہوتے ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ
قیاس مثبت نہیں مظہر ہوتا ہے یعنی وہ خود کسی بات کو اپنی طرف سے ثابت نہیں کرتا
بلکہ جو کچھ قرآن وحدیث سے ثابت ہے اسی کو ظاہر کر دیتا ہے اور پھر قیاس بھی کیسے
مجتہدین کا جن کا علم وفہم، تقویٰ وتدین ایسا غیر معمولی تھا کہ کم از کم ہمارے مقابلہ
میں ان سے خطا ولغزش کا بہت کم احتمال ہے پھر اس خطائے اجتہادی پر مؤاخذہ
نہیں بلکہ اجر ہے اس لئے کہ اگر اجتہاد کے شرائط کسی میں موجود ہیں اور اس نے ہر طرح
تحقیق کا حق ادا کیا تو ماجور ہوگا اور اگر از راہ بشریت اس حق کے ادا کرنے پر بھی خطا
کی تو معذور ہے۔

گوشہ گیری کا اعتراض

ایک اعتراض مولویوں پر یہ ہے کہ یہ اپنے گھروں مسجدوں اور مدرسوں میں بیٹھے رہتے ہیں قوم کی تباہی پر رحم نہیں آتا کہ گھروں سے نکل کر گمراہوں کی دستگیری کریں لوگ بگڑتے چلے جاتے ہیں کوئی اسلام چھوڑ رہا ہے کوئی احکام سے بیخبر ہے"

تو اولاً تو مختلف ذرائع سے اسلام و احکام کی اتنی اشاعت ہو چکی ہے کہ اب تبلیغ کے وجوب کا درجہ باقی نہیں رہا۔ جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے اگر اس کو اپنے اسلام اور دین کی کچھ بھی قدر اور پرواہ ہو تو طرح طرح کی واہیات اور خرافات کتابیں، اخبارات و رسائل وغیرہ تک پڑھنے سننے میں وقت صرف کرتا اور لڑائی بھڑائی میں دنیا بھر کی واہی تباہی خبریں معلوم کرنے میں لگا رہتا ہے تو کیا دین کی کتابیں اور رسالے نہیں پڑھ اور سن سکتا، یا جاننے والوں سے مسئلے مسائل نہیں دریافت کر سکتا۔ اسی طرح غیر قوموں نے کیا اسلام کا نام نہیں سنا اور اگر مذہب کوئی اہم معاملہ ہے تو کیا وہ آسانی سے دو ایک رسالے پڑھ یا سن کر اتنا نہیں معلوم کر سکتے کہ اسلام ہے کیا اور وہ اصولاً چاہتا اور کہتا کیا ہے۔

اس کے علاوہ مسجدوں اور مدرسوں میں جو مولوی پڑے ہیں وہ بھی تو آخر کچھ نہ کچھ اپنی لبساط بھر دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ تاہم تبلیغ اس میں شک نہیں کہ دین کی بہت بڑی بلکہ سب سے بڑی اور اعلیٰ خدمت ہے لیکن

کیا اسلام کی یہ خدمت صرف علماء ہی کے ذمہ ہے دنیا دار اور مالدار مسلمانوں کے ذمہ نہیں کیا وہ اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ علماء کو

معاش سے فراغ نہیں لہٰذا آپس میں سرمایہ جمع کر کے ، علماء کی ایک جماعت کو اس کام کے لئے مقرر کر دیں جس طرح مشنری لوگ بڑے بڑے مشاہرے پا پا کر ہیں جا بجا لکچر دیتے اور رسائل تقسیم کرتے پھرتے ہیں

اور ہمارے معترضین کو علماء پر جو یہ اعتراض سوجھا ہے وہ انہی مشنریوں کی مساعی کو دیکھ کر، اور یہ اس وقت عام عادت ہو گئی ہے کہ اصل حقیقت میں غور نہیں کرتے بس غیروں کے رسم و رواج کو اپنا ہتما اور معیار استحسان قرار دے لیا ہے حقیقت بینی سے قطع نظر یہ بھی نہ دیکھا کہ اپنے علماء پر ان کے علماء کے برابر سعی نہ کرنے کا الزام دینے سے پہلے یہ بھی دیکھ لیں کہ آیا ہمارے دنیا دار اُن کے دنیا داروں کے برابر اعانت مالی بھی کرتے ہیں یا نہیں"

حالانکہ بیچارے ہمارے بدنام "مولوی" اب بھی اتنے قانع اور قلیل المصارف ہیں کہ مشنریوں سے بہت کم پر گذر کر سکتے ہیں لیکن اپنے بال بچوں کے واجبات اور حقوقِ نفس کا ادا کرنا بھی تو شریعت ہی کا حکم ہے اور مستحب تبلیغ کے مقابلے میں واجب بلکہ واجب تبلیغ پر بھی مقدم ہے اس سے معلوم ہوا کہ قصور زیادہ کس کا ہے دنیا داروں اور مالداروں کا یا مولویوں کا۔ غرض تبلیغ و اشاعت کا وجوب بھی علماء کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ سب مسلمانوں پر اپنی وسعت و اہلیت کے بقدر واجب ہے۔

تحریر و تقریر میں قصور کا شبہ

ایک شبہ عربی کے طالب علموں اور علماء پر یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ تقریر و تحریر میں قاصر رہتے ہیں تو یہ کلی حکم تو نہایت بے انصافی ہے کیا علماء و طلباء میں بہت سے ایسے بے حد خوش تحریر و خوش تقریر نہیں پائے جاتے جن کا

مقابلہ دوسری تعلیم کا بڑے سے بڑا فاضل بھی نہیں کر سکتا[1]

البتہ اتنی ضرورت اس زمانہ میں ضرور معلوم ہوتی ہے کہ خوش تحریری
وتقریری کی مشق کا اہتمام بھی مدارس میں بالالتزام کیا جائے۔
اور طلباء کا اختیاری امر نہ رہے بلکہ سب کو اس پر مجبور کیا جائے"

خیال تھا کہ اس جدید ضرورت کا احساس پہلے پہل ندوہ کو ہوا لیکن جامع المجددین کی نظر کسی جدید و قدیم ضرورت سے بھی کیسے محجوب رہ سکتی تھی یہ اور بات ہے کہ قدیم درسگاہوں نے اس تجدید کے قبول کرنے میں تاخیر کی اور ندوہ کی تعجیل قابل تحسین ہے لیکن وہاں یہ استحسان اعتدال کی حد سے نکل کر غیر مستحسن حد کو پہنچ گیا ہے یعنی ندوی اپنا اصلی کمال انشاپردازی اور انشاء نگاری ہی کو جاننے لگے ہیں حتیٰ کہ اس کے پیچھے درسیات میں استعداد کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور دوران طالب علمی میں عربی و درسی کتابوں سے زیادہ اردو کی انشاء پردازانہ کتابوں کی طلب و مطالعہ میں لگ جاتے ہیں۔ ابھی آج (۱۱ رجون ۱۹۴۸ء) یہ سطریں لکھ ہی چکا تھا کہ روزنامہ تنویر میں طلبائے ندوہ کی جمعیۃ الاصلاح کا یہ کارنامہ چھپا اور پڑھا کہ علمی و ادبی مجالس میں دلچسپی اور انشاپردازی اور تقاریر کی طرف اشتیاق زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں آگے اور اصلی ندویت لیجئے کہ جن حضرات نے زیادہ دلچسپی لی اور ہمیشہ اپنی تقریروں سے جلسہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی انہیں کپ و مڈل دے کر ہمت افزائی کی گئی

---

[1] اس زمانہ میں اس کی مثال ہمارے فاضل اجل مولانا سید مناظر احسن گیلانی سلمہٗ کی سامنے ہے کہ ساری عثمانیہ یونیورسٹی کے بڑے سے بڑے فضلائے جدید بھی تحریر و تقریر دونوں میں ان کا لوہا مانتے تھے۔

غریب طلباء سے زیادہ علمائے ندوہ اور منتظمین ندوہ کو سوچنا چاہیئے کہ آیا
کی اس نقالی کے سوا ہمت افزائی کا کیا اور کوئی طریقہ نہیں اور اس نقالی کے مفاسد
کہاں تک جاتے ہیں اور غیروں کی تقلید و اتباع کی اس سے کتنی ہمت افزائی
ہوتی ہے ہمارے مشہور خوش تحریر و خوش تقریر غیر ندوی فاضلِ اجل مولانا
گیلانی نے تو اسی بناء پر ندوہ کا نام ہی "مدرسۃ الصحافۃ والخطابۃ" رکھ دیا ہے
اس کے علاوہ جن کو فطری مناسبت نہیں وہ مجبور کرنے اور مشق کرنے سے بھی
طوطے ہی بنے رہیں گے اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ پہلے اندازہ کر لیا جائے اور جن کو
مناسبت نہ ہو ان کو اپنا وقت خراب نہ کرنے دیا جائے جیسا کہ حضرت نے ہدایت
فرمائی ہے"

"کہ پھر بھی ایسے لوگ ثابت ہوں گے جن کو فطری طور پر تقریر و تحریر
سے کم مناسبت ہوگی سو ایسے لوگ اپنے عمل کیلئے علم حاصل
کریں دوسروں کے افادہ کے لئے اور بہت سے لوگ مل سکیں گے
یہ کیا فرض ہے کہ ہر کام ہر شخص کرے (ص ۳۲)

علماء کی وقعت اور عظمت کی حفاظت نہایت اہم ہے

عربی و دینی تعلیم کے طلباء و علماء کو طرح طرح کے معقول و نامعقول صحیح
و غلط اعتراضات کا ہدف بنانا خصوصاً نئے فیشن کے لوگوں میں جو ایک فیشن
بن گیا ہے اس کی طرف حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ نے جو اس قدر بلیغ
توجہ فرمائی اور راقم ہذا نے اس کے بیشتر حصہ کی تلخیص ضروری جانی اس کی
بڑی وجہ یہ ہے کہ تعلیم و تبلیغ کی اصلاح و تجدید کے سلسلہ میں حضرت کی
نگاہِ تجدید میں دین کی حفاظت کے لئے علماء و فقہاء کی وقعت و عظمت کی

حفاظت اہم و اقدم ہے

اس لئے کہ سارے مسلمان سارے اسلامی علوم اور احکام و مسائل کے عالم و محقق نہ کبھی ہوتے ہیں اور نہ آیندہ ہوں گے لازماً اگر کوئی خاص جماعت ولتکن منکم الخ کے تحت ہمیشہ اور ہر عہد میں موجود رہے تو جمہور مسلمین کو ایمان اور عمل صالح کے مختلف ابواب اور شعبوں کے احکام آخر کون بتلائے اور کس سے معلوم کریں، یہی نہیں بلکہ اگر خدانخواستہ علماء کی جماعت کسی عہد یا کسی نسل میں بالکلیہ ناپید ہو جائے تو دین کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جائے خالی کتابوں اور کتبخانوں سے دین محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک ان کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ تواتر کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ مستمر نہ رہے،

خوب یاد رہنا چاہئے کہ زبانی یا درسی تعلیم و تعلم کا تسلسل و تواتر ٹوٹ جانے سے خالی کتاب سے ہر چیز کا صحیح سمجھ لینا بھی ممکن نہیں۔ ایک عالم نفسیات خوب سمجھ سکتا ہے کہ کتابوں کی فہم کی استعداد بھی زبانی تفہیم کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے شروح و حواشی بھی زبانی فہم و تفہیم سے مستغنی نہیں بنا سکتے کسی معمولی فن کو بھی جس نے استاذ سے نہیں پڑھا ہے محض کتابوں سے بیسیوں مقامات پر ٹھوکر کھائے گا۔

غرض جب علماء کا وجود ایک طرف دین کی تعلیم و تبلیغ کے لئے اور دوسری طرف اس کے بقاء و تحفظ کے لئے ناگزیر ہے تو اگر امت کے اندر یہ جماعت خدانا کردہ موجود نہ رہے یا موجود ہو اور اس کی اتنی تحقیر و توہین جا بیجا الزامات سے دلوں میں راسخ کر دی جائے کہ لوگ ان سے بیزار ہو کر استفادہ نہ کریں تو پھر علماً و تعلیماً اور بالآخر عملاً معاذ اللہ دین کے فناء ہو جانے کے سوا اور کیا نتیجہ ہوگا؟ گو جس دین کی حفاظت خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہو وہ فنا نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا اس سے

ہم اپنے واجبات سے سبکدوش اور مؤاخذہ سے بری ہو جا سکتے ہیں۔ حضرت کی کتابوں اور مواعظ و ملفوظات وغیرہ سب میں کثرت سے اس پر تنبیہات موجود ہیں کہ ہر مسلمان کو کسی نہ کسی عالم سے تعلق رکھنا اور احکام دریافت کرتے رہنا ضروری ہے بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر جیسے ہر شخص یا ہر خاندان کسی نہ کسی طبیب سے عادۃً تعلق رکھتا ہے اور چھوٹی بڑی بیماریوں میں زیادہ تر اسی کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے تو کیا روحانی صحت جسمانی صحت کے برابر بھی لائق التفات نہیں اگر قریب کوئی عالم نہیں ہے تو حضرت کی تاکید ہے کہ دور ہی کے کسی عالم سے تعلق رکھے اور خط و کتابت سے احکام معلوم کرتا رہے۔

اسی طرح دینی مدارس قائم کرنے اور جو قائم ہیں ان کی حفاظت و ترقی کی تاکید جا بجا فرمائی ہے کیونکہ ہماری گاڑی کے ڈرائیور یہیں سے پیدا ہوتے ہیں اگر خدانخواستہ عربی درسگاہوں سے ان کی فراہمی منقطع ہو جائے تو امراء کے فرسٹ و سیکنڈ، متوسطین کے انٹر اور غرباء و عوام کے تھرڈ، سارے کے سارے ڈبے اپنی جگہ بےحس و حرکت کھڑے رہ جائیں، ہر طبقہ کی دینی حیات و حرکت ان مدرسوں سے نکلے ہوئے برے بھلے علماء یا مولویوں ہی کے دم سے قائم ہے اور جس قدر امت کے مختلف طبقات اپنی اپنی اہلیت و حیثیت کے موافق ہماری دینی گاڑی کے ان ڈرائیوروں یا چلانے والوں کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت، خدمت و اعانت کا بندوبست کریں گے اسی قدر ہماری دینی حرکت و حیات جاندار و پائدار ہوگی اور اسی نسبت سے انشاء اللہ دنیا بھی درست ہوگی۔

علم دین کے حقوق طلباء و علماء پر

یہاں تک ان حقوقِ علم پر گفتگو تھی جو زیادہ تر عامہ مسلمین کے ذمہ ہیں

آگے باب دوم میں ایسے حقوق علم میں کوتاہیوں اور ان کی اصلاح کو بیان فرمایا گیا ہے جو خود علم دین کے طلبا و علماء پر ہیں۔

بعض طلبا یہ خیال کرتے ہیں کہ ابھی تو ہمارا تحصیلِ علم کا زمانہ ہے اس میں عمل کی چنداں ضرورت نہیں یہ سراسر شیطانی دھوکہ ہے نصوص نے وجوب احکام میں طلباء و علماء میں کہیں فرق نہیں کیا۔ البتہ اعمال زائدہ جیسے طویل اوراد یا مجاہدات و ریاضات کہ ان میں مشغول ہونے سے طالب علم کے لئے مطالعہ اور تکرار سبق افضل ہے۔"

بعض نام نہاد علماء علوم دین کو دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں خواہ طلب جاہ ہو یا طلبِ مال لیکن ان پر سب کو قیاس نہ کرنا چاہیئے کیا کوئی اناڑی عطائی آدمی خلاف اصولِ طب کسی کا علاج کرے یا کسی کو دھوکا دے کر ٹھگ لے تو اس سے ملک کے تمام ماہرین اطباء کے کمال کی نفی جائز ہو گی؟ بہرحال بعضے ایسا کرتے ہیں کہ وعظ کو پیشہ بنا لیتے ہیں اور اسی غرض سے وعظ کرتے پھرتے ہیں کہ کچھ وصول ہو اور اس قسم کی وعیدوں کو بھلا دیتے ہیں کہ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

من تعلم علماً مما یبتغی به وجه الله لا یتعلمه الا لیصیب به عرضاً من الدنیا لم یجد عرف الجنة یوم القیامة۔	جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے علم کو دنیا کی کسی غرض سے سیکھا اس کو قیامت میں جنت کی بو بھی نصیب نہ ہو گی ....

علم دین کے دینی و دنیوی استعمال میں فرق

البتہ جس طرح اوپر آیت لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا کے تحت وعظ کی نوکری کا جائز ہونا معلوم ہو چکا اسی طرح اگر اشاعتِ احکام حسبۃً للہ ہو اور لوگ کچھ خدمت کر دیں جس کی قلب میں طمع نہ ہو (گو احتمال وسوسہ ہو) تو وہ جائز ہے اور اور اس کا امتحان یہ ہے کہ وعظ کے لئے یہ شخص کن مقامات کو منتخب کرتا ہے ان کو جہاں روپیہ ملنے کی زیادہ امید ہے یا ان کو جہاں تبلیغ احکام کی زیادہ ضرورت ہے یہی امتحان علوم دینیہ کی تدریس کا ہے کہ اگر تنخواہ پر نظر نہ ہوگی تو جس صورت میں ایک جگہ پر گذر ہو رہا ہو گا اور وہاں علوم دینیہ کی ضرورت بھی زیادہ ہو تو ایسی جگہ کو چھوڑ کر ترقی پر نہ جائیگا اور نہ خود کوشش کر کے ایسی جگہ جانا چاہے گا اور فقہا نے جو تعلیم علوم دینیہ اور وعظ پر اجرت کی اجازت دی ہے اس سے مراد یہی صورت ہے ورنہ حنفیہ رحمہم اللہ طاعات مقصودہ پر اجرت کو بوجہ نہی کے کسی طرح جائز نہیں رکھتے۔

علماء کا امراء سے اختلاط

بعضے علماء، امراء و اہل اموال سے اختلاط اسی غرض سے رکھتے ہیں کہ اُن سے وقتاً فوقتاً کچھ حاصل ہوتا رہے اس میں گلہ ہے نوبت یہاں تک آتی ہے کہ ان کی غرض سے مسئلہ بتا دیتے یا بنا لیتے ہیں جس سے سردست تو وہ خوش ہو جاتے ہیں لیکن بہت جلد ہی ایسے علماء ان کی نظر سے گر جاتے ہیں اور پھر وہ ان پر تمام علماء کو قیاس کر کے جماعت کی جماعت سے نفور ہو جاتے ہیں۔
باقی اگر اس اختلاط سے امراء کی اصلاح ہو کہ ان کو احکام دینیہ بتلاتے

جائیں خصوص جب کہ وہ خود خواہش کریں اور ان کو حاضر ہونے کی مہلت نہ ہو تو ایسا اختلاط نہ مضر ہے نہ موجب ذلت، مگر جب قرائن سے یا شرائط سے یہ معلوم ہو کہ آزادی کے ساتھ حق ظاہر کیا جا سکے گا اور ایسی حالت میں اگر وہ کچھ خدمت کریں تو لینے میں کچھ مضائقہ نہیں، مگر احقر کا مشورہ یہی ہے کہ ہرگز قبول نہ کرے بلکہ جانے سے قبل شرط کرلے کہ لینے دینے کا کچھ قصہ نہ ہوگا جس کا اثر فطری طور پر بہت اچھا ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں امراء کا حوصلہ نہیں پڑتا کہ علماء کو اپنا تابع بنانے کا وسوسہ بھی دل میں لائیں بلکہ ہر طرح انہی کو تابع ہونا پڑتا ہے اور یہی امر مہتم بالشان ہے اور اگر خود امراء آئیں تو یہ اختلاط منع نہیں عین مطلوب ہے ان سے بے رخی نہ کرے اخلاق سے پیش آئے مگر استغناء کو اب بھی ہاتھ سے نہ جانے دے۔

حیلۂ شرعی کو حیلہ بنانا

بعض علماء کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری غنی بنایا ہے ان کو کسی کے ہاتھ کی طرف دیکھنے کی نوبت نہیں آتی لیکن اپنے مالی معاملات میں ایسا کرتے ہیں کہ اگر شریعت پر عمل کرنے سے کوئی ان کی مالی منفعت ضائع ہو رہی ہو تو ضعیف تاویلوں اور غیر مشروع حیلوں سے (گو نام ان کا حیلۂ شرعی رکھتے ہیں) کام لیتے ہیں یہاں تک کہ عام لوگوں کے زبان زد ہو گیا ہے کہ مولوی اپنے مطلب کا مسئلہ جس طرح چاہتے ہیں بنا لیتے ہیں۔

میرے نزدیک اگر گناہ کرکے اپنے کو گنہگار سمجھے اور گنہگار ہونے کا اقرار کرے تو اتنا مفسدہ نہیں جتنا گناہ کو کھینچ تان کر جائز بنانے میں مفسدہ ہے اس سے عام لوگ گمراہ ہوتے اور علماء سے بد اعتقاد ہوتے ہیں اور پھر اپنے

معاملات میں تاویلیں اور حیلے پوچھتے ہیں اور اگر کوئی نہیں بتاتا تو قیاس فاسد سے خود ہی اپنی من سمجھوتی کر لیتے ہیں۔

مضرت عوام کی حفاظت

علماء کی شان تو یہ ہے کہ اگر کوئی چیز بلا تاویل بھی جائز ہو مگر کسی وجہ سے اس کے ارتکاب میں عوام کی دینی مضرت ہو تو اپنا ضرر بقدر تحمل گوارا کر لیں لیکن عوام کا دین بچائیں نہ کہ ان کے لئے فتنہ کا دروازہ کھول دیں لیکن اس سے تصحیح معاملات کی ان وجوہ پر (گو ان کو بھی بعض کتابوں میں حیلہ سے تعبیر کیا گیا ہے) کوئی شبہ نہ کرے جن میں بلا کسی نفسانی غرض کے عام مسلمانوں کو تنگی سے نکالنے اور معاصی سے بچانے کے لئے اذن دیا گیا ہے جیسا کہ خود حدیث میں ہے کہ بع الجمع بالدراھم ثم ابتع بالدراھم التمر۔ وغیرہ ہے فرق دونوں میں یہ ہے کہ جس سے مقصود کسی شرعی مقصود کا ابطال ہو وہ مذموم ہے اور جس سے مقصود کسی مقصود شرعی کا حاصل کرنا ہو وہ محمود ہے مثلاً ربوٰ مقصود نہ ہو بلکہ خود اجناس ہی قیمت میں متفاوت ہوں۔ لیکن اتحاد بدلنے کے سبب تفاضل ممنوع ہو وہاں حدیث مذکور کے سبب تصحیح کر لینا جائز و مشروع ہے

علماء کی جاہ طلبی

یہ تو بصورتِ مال دنیا طلبی تھی۔ بصورتِ جاہ دنیا طلبی کی چند صورتیں ملاحظہ ہوں۔

بعضے علماء اس لئے امراء سے ملتے ہیں کہ لوگوں میں عزت و وقعت بڑھے گی حالانکہ عام مسلمان اس کو اہل علم کے لئے عیب سمجھتے

ہیں، واقعہ میں بھی علماء کی عزت وشان کے لئے یہی مناسب ہے
کہ دین کی خدمت کریں، امراء سے مستغنی رہیں، غرباء کے ساتھ
خوش خلقی کریں اور امراء کی نظر میں تو اس سے اچھی خاصی ذلّت
ہوتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ خوشامد کے لئے ملتے ہیں اور ایک اثر
امراء وغرباء دونوں پر ایسا ہوتا ہے کہ تحقیق دین اور فتویٰ کے
باب میں اعتبار اٹھ جاتا ہے ان کے وعظ فتویٰ اور تقریر پر وثوق نہیں
رہتا۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید دنیا داروں کی خوشامد میں ایسا کرتے ہیں"
لیکن ایک اثر جو خود علماء پر امراء کی صحبت کا پڑتا ہے وہ تو اتنا خطرناک ہے کہ بالآخر
ان کے دین کو ہی لے ڈوبتا ہے یعنی امراء کے منکرات پر روک ٹوک ان کے لئے
دشوار ہو جاتی ہے کیونکہ پھر تو ان سے لطفِ صحبت ہی رہنا مشکل ہو گا۔
جانبین کو انقباض ہو گا اور چونکہ امراء کو بالعموم مطلوب بنا کر بلا جاتا ہے ان
کی خلافِ شرع حرکتوں پر سکوت کرنا پڑتا ہے"
جس سے علماء کے اندر مداہنت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور
صحبت کی ترقی سے اس میں ترقی ہوتی ہے حتی کہ قلب سے اس کا اثر
زبان پر آتا ہے یعنی پہلے قلب میں حق کی عظمت اور باطل سے نفرت
کم ہو جاتی ہے پھر زبان سے اظہارِ حق کی ہمت گھٹتی ہے پھر
باطل کا اظہار خفیف معلوم ہونے لگتا ہے پھر اس کا صدور ہونے
لگتا ہے حتی کہ ان امراء کو اس کا احساس ہو کر اتنا حوصلہ ہو جاتا
ہے کہ اپنی نفسانی خواہشوں کے موافق ان علماء سے توجیہات
کی فرمائش کرنے لگتے ہیں اور یہ اُن کو پورا کرنے لگتے ہیں ؎
اس مقام پر پہنچ کر ان کا قلب مسخ ہو جاتا ہے اور حق بینی کی استعداد ہی

ضائع ہوجاتی ہے بلکہ الٹے کبھی کبھی اہل حق سے جدال وعناد پر آمادہ ہوجاتے ہیں
پھر خود ان کی اصلاح کی توقع نہیں رہتی اور امت محمدیہ کے لئے
(العیاذ باللہ) ابلیس سے زیادہ ضرر رساں ہو جاتے ہیں کہ ان کے
ہوتے ہوتے اگر شیطان فارغ ہو بیٹھے تو بھی بعید نہیں میں نے اپنی
آنکھوں سے ایسے ہی طالب دنیا کو دیکھا ہے کہ ایک ہزار روپیہ
لے کر اور ایک ترکیب تراش کر حقیقی ساس کے ساتھ حلت
نکاح کا فتویٰ لکھ دیا۔ حدیث میں اسی طرح کے مسخ قلب کا ذکر
ہے کہ

لما وقعت بنوا اسرائیل فی المعاصی نهتهم علمائهم
فلم ينتهوا فجالسوهم واكلوهم وشاربوهم فضرب
الله قلوب بعضهم ببعض ولعنهم على لسان داؤد
وعيسى بن مريم ذلك بما عصوا وكانوا يعتدون

لیکن یہ سب خرابیاں اسی وقت ہیں کہ جب امراء کو مطلوب بنا کر
جاویں اسی کی مذمت احادیث صحیحہ میں ہے کہ

ابغض القراء الی اللہ	اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض وہ
الذین یزورون الامراء	علماء ہیں جو امراء سے ملتے ہیں۔
اور۔ العلماء امناء الدین	اور۔ علماء دین کے محافظ ہیں جب
مالم یخالطوا الامراء	تک امراء سے میل جول نہ رکھیں
فاذا خالطوا الامراء فہم	ورنہ دین کے ڈاکو ہیں۔
لصوص الدین ۰	....

....

امراء سے اختلاط و اجتناب کے شرائط

البتہ اگر امراء طالب ہو کر حاضر ہوں یا کسی ضرورت سے خود علماء
کو مدعو کریں تو اس معاہدہ کے بعد کہ ہم آزادی سے جو چاہیں گے
کہیں گے اور نذرانہ وغیرہ قبول نہ کریں گے تو ایسی مخالطت محافظت
دین ہے کیونکہ اگر علماء اس طرح بھی ان سے نہ ملیں تو ان کو دین
کیونکر پہنچیگا مگر اس طرح کا اختلاط فرض عین نہیں کہ سب پر ضروری
ہو، فرض کفایہ ہے" اور اس کے لئے ایسا شخص موزوں ہے جو
قوی القلب اور غنی النفس ہو ورنہ ضعیف کے لئے سلامتی اسی
میں ہے کہ امراء سے بالکل نہ ملے، تبلیغ کے لئے دوسرے
لوگ یا رسائل اور کتابیں کافی ہیں "

سبحان اللہ کیا فہم دین ہے کہ حدود سے تجاوز پر یہاں بھی متنبہ
فرمایا جو حضرت جامع المجددین کی تجدید کی خاص و نمایاں خصوصیت ہے کہ
امراء سے اجتناب کرنے میں ان کو حقیر اور اپنے کو مقدس نہ سمجھے
بلکہ ان کو مبتلائے دنیا و جہل سمجھ کر رحم و دعا کرے اور اپنے کو
ضعف دین کا مریض جان کر اجتناب کو ایسا سمجھے جیسا کمزور طبیعت
والے کو جس میں تاثر کا مادہ زیادہ ہو متعدی مرض کے مریض سے بچاتے
ہیں اور ساتھ ہی اس متعدی مرض کے مبتلاء پر غصہ بھی نہیں کرتے
بلکہ رحم کھاتے ہیں

سبحان اللہ کیسی مجددانہ حدود شناسی اور پھر کیسی حکیمانہ ان کی تفہیم ہے!
ساتھ ہی پھر تنبیہ ہے کہ اس عدم غصہ اور عدم بغض کی بھی ایک حد ہے

کیونکہ اگر کوئی شخص حق سے عناد اور اہل حق سے بغض و عناد رکھے یا تکبر کرے تو
اس سے بغض رکھنا واجب و عبادت ہے اور بغض فی اللہ یہی ہے
آگے جاہ طلبی کی ایک اور دقیق تدبیر کا بیان ہے کہ

جاہ طلبی کی ایک دقیق تدبیر

بعضے دنیا داروں کو دھتکار دیتے ہیں سخت سست کہتے ہیں
حتی کہ بعض پہرا بٹھا دیتے ہیں اگرچہ یہ لوگ متکبر امراء کا پورا علاج
ہیں جن سے امراء کو ان کے تکبر کی سزا ملتی ہے لیکن یہ تکوینی علاج
ہے تشریعی نہیں۔ اور ایسا برتاؤ یا اخلاق شرع کے بالکل خلاف ہے
پھر بعضے ایسے بھی ہیں کہ ان کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ اس طریقہ
سے امراء میں شہرت ہوتی ہے لوگ بڑا بزرگ سمجھتے ہیں لہذا
ایسے لوگوں کو بہ نسبت متکبر کے ریا کار (اور جاہ طلب) کہنا زیادہ
زیبا ہے "
یہ تو وہ لوگ تھے جن کے اس طرز عمل کی غایت ہی جاہ تھی بعضوں کے ہاں
جاہ غایت وسبب نہیں بلکہ مسبب ہوتی ہے۔
اور وہ لوگ واقع میں اپنے کو مقدس اور دوسروں کو گنہگار سمجھتے
ہیں اس لئے ان سے نفرت کرتے ہیں ایسوں کو بہ نسبت ریا کار
کے متکبر کہنا زیادہ بجا ہے اور یہ تکبر دنیا داروں کے تکبر سے
بھی زیادہ قبیح و شنیع ہے کیونکہ ان لوگوں کو بہ نسبت دنیا داروں
کے زیادہ علم ہے اور علم کے ساتھ بد عملی عند اللہ زیادہ مبغوض
ہے ان لوگوں کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اعتبار خاتمہ کا ہے لہٰذا

ان کو کیا معلوم کہ جس کو یہ گنہگار جان رہے ہیں اس کا خاتمہ کیسا ہوگا اور خود اپنے کو جو مقدس سمجھ رہے ہیں ان کا خاتمہ کیسا ہوگا؟

ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

مناظرہ و مجادلہ کی حقیقت

بعض لوگ بلا ضرورت بات بات میں مجادلہ و مناظرہ کرتے اور دن رات اسی میں لگے رہتے ہیں جس سے اکثروں کی غرض اپنی علمیت کا سکہ بٹھانا یا علمی جاہ طلبی ہوتی ہے جس کا

بعض اوقات یہاں تک اثر ہوتا ہے کہ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی باطل پر اصرار کئے جاتے ہیں کہ بات ہیٹی نہ ہو جائے میں نے ایک ایسے ہی کا فتویٰ ایک قطعی رضاعی رشتہ میں نکاح کا دیکھا کہ ابتدا میں تو ان سے غلطی ہو گئی مگر پھر بات کی پچ پڑ گئی اور باوجود سارے علماء کی مخالفت کے اور تقریراً و تحریراً تنبیہ کرنے کے ہرگز رجوع نہ کیا حتیٰ کہ بعض ثقہ لوگوں سے سنا گیا کہ خود اپنے ایک بزرگ سے کہا کہ اب کیا کروں قلم سے نکل گیا اب تو تائید ہی کرنا ضروری ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما ضل قوم بعد ھدیً کانوا علیہ الا اوتوا الجدل ثم قرأ ھذہ الآیۃ ما ضربوہ لک الا جدلا بل ھم قوم خصمون جدل سے مراد یہاں عناد ہے اور اپنے مذہب کی ترویج کے لئے تعصب ہے۔"

اور بعض آیات و روایات میں مجادلہ و محاجہ کا جو امر و اذن ثابت ہے تو یہ مطلب نہیں کہ ہر مجادلہ اور ہر حال میں مذموم ہے البتہ ہمارے زمانہ میں زیادہ تر ایسے ہی مجادلہ کا رواج ہے جو مذموم ہے یا جس کا ترک محمود ہے اور جس کی مذمت آیات و احادیث اور بزرگوں کے کلام میں موجود ہے اس کی تفصیل ذرا آج کل کے مناظرہ پسندوں کے لئے کان کھول کر سننے کی ہے

ظنی و قطعی مسائل کے حکم کا بڑا اہم فرق

مسائل دو قسم کے ہیں ایک جن کی شق یقیناً حق اور دوسری باطل ہے خواہ سمعاً خواہ عقلاً، یہ مسائل قطعیہ کہلاتے ہیں دوسری قسم جس میں دونوں جانب حق و ثواب کا احتمال ہو یہ مسائل ظنیہ کہلاتے ہیں مسائل کلامیہ اکثر قسم اول سے ہیں اور بعض ثانی سے اور مسائل فقہیہ اکثر قسم ثانی سے ہیں اور بعض اول سے۔

مسائل ظنیہ میں صرف ظنی ترجیح ثابت کرنے کے لئے اہل علم میں باہم گفتگو و مکالمت جائز ہے بشرطیکہ نہ بغض و عناد ہو نہ ایک جانب کی قطعیت کا اعتقاد ہو نہ دوسری جانب کے قطعی باطل ہونے کا یقین جازم، نیز جب سمجھ میں آجائے تو اپنی رائے سے رجوع اور حق کے قبول کا عزم ہو۔

مگر مصلحت اس میں بھی یہ ہے کہ عوام تک اس کی اطلاع نہ ہو اگر زبانی گفتگو ہو مجمع خواص کا ہو اور اگر تحریری ہو تو عام فہم زبان مثلاً ہندوستان میں اردو میں نہ ہو، عربی میں ہو یا کم از کم فارسی میں تاکہ اگر کسی وقت شائع ہو جائیں تو عوام تک اس اختلاف کا اثر

نہ پہنچے اور سلف سے اسی طرح کی گفتگو منقول ہے نہ کہ جیسی آج
کل ہوتی ہے کہ ایک قراءۃ خلف الامام کا حق ہونا، اس طرح تبلا
رہا ہے کہ اس کے نزدیک تمام حنفیہ تارک صلوٰۃ اور فاسق ہیں
اور دوسرا اس کی اس طرح نفی کر رہا ہے کہ گویا اس کے نزدیک قراءت
خلف الامام کی کوئی حدیث ہی نہیں، اور عین مناظرہ میں اگر مقابل کا
قول دل کو لگ بھی جائے تب بھی ہرگز قبول نہ کریں بلکہ گفتگو شروع
کرتے ہی ردّ ہی کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں اور اسی نیت سے سنتے
ہیں کیونکہ مقصود تمامتر اپنا غلبہ اور دوسرے کو ساکت کرنا ہوتا
ہے پھر باہمی عناد وفساد حتیٰ کہ نوبت عدالت تک پہنچتی ہے
کیا یہ دین ہے کیا سلف صالح اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا
ان مسائل میں یہی طریقہ تھا

افسوس اگر آج مسلمان ان ظنی مسائل میں اختلاف وگفتگو کو اپنے حدود
میں رکھتے اور مجدد وقت کی حدود شناسی کو مشعلِ راہ بناتے تو کتنے اور کیسے کیسے
مہیب ومہلک مفاسد کا سدّباب ہو جاتا پھر ہمارے آج کل کے سیاسی
وملکی مسائل تو ان فقہی مسائل سے بھی زیادہ ظنی ہیں ان میں ایک دوسرے پر
لعن طعن، سب وشتم، تکفیر وتفسیق اور وہ بھی کسی خاص مجمع اور کسی خاص
زبان میں نہیں بلکہ عوام الناس کے بھرے جلسوں اور سرارد و اخبار کے کھلے کالموں
میں سیاسی وملکی ہی کیا اور عوام یا انگریزی دانوں ہی پر کیا موقوف بعض مستند
اور بہت سے غیر مستند مدعیان علمِ دین فقہی وظنی مسائل تک کو رسائل واخبارات
کے میدان میں عوام الناس کے سامنے ڈال دینا عین خدمت دین جانتے ہیں

ع ببین تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

کاش اسلام کے یہ نادان دوست مجدد وقت کی ان باتوں پر کان دھرتے تو آج مسلمان ان دینی و دنیوی ہلاکتوں اور ذلتوں سے کیوں دوچار ہوتے!

حضرت جامع المجددین کی اصلاحات و تجدیدات ہر معاملہ میں ایسی جامع ہیں کہ بے ساختہ دل گواہی دیتا ہے کہ اگر ان کا اتباع ہو تو دین و دنیا کی صلاح و اصلاح سب کا نقشۂ سلف خدا چاہتا پھر سامنے آجاتا۔

مسائل قطعیہ میں اختلاف کی مختلف حالتوں کا حکم

اب رہ گئے مسائل قطعیہ جیسے کفر و اسلام کا اختلاف، یا اہل حق کے نزدیک جو متفق علیہ بدعت و سنت ہے تو اس میں چند حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ صاحب باطل متردد و طالب حق ہے اور اپنے شبہات صاف کرنا چاہتا ہے اور اس غرض سے گفتگو یا مناظرہ کرتا ہے تو جو شخص حق کی تائید پر قادر ہو اس پر ایسا مناظرہ واجب و فرض ہے اور جب جواب سے عجز ہو تو صاف کہدینا چاہیئے کہ اس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سوچ کر یا پوچھ کر تبلاؤں گا۔ یا اپنے سے زیادہ جاننے والے کا پتہ تبلادے اور طالب کو چاہیئے کہ وہاں جا کر رجوع کرے ایسے مناظرہ سے انکار معصیت اور مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهٗ الخ میں شامل ہے

(۲) دوسری حالت یہ ہے کہ مخاطب طالب حق نہیں لیکن متکلم مناظرہ کو توقع و احتمال ہے کہ شاید حق کو قبول کرلے، سو جب تک اس کی امید ہو مناظرہ کرنا تبلیغ احکام میں داخل ہے کہ جہاں تبلیغ واجب ہے وہاں یہ مناظرہ واجب اور جہاں مستحب ہے وہاں مستحب ہے۔ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اہل کتاب و خوارج سے مناظرات اسی قبیل سے تھے

(۳) اور تیسری حالت یہ ہے کہ وہ طالب بھی نہیں نہ قبول کی امید ہے مگر کسی

مفسدہ ومضرت کا اندیشہ بھی نہیں اور کسی ضروری امر میں خلل کا بھی احتمال نہیں تو ایسی صورت میں ایسا مناظرہ مستحب ہے۔

(۴) چوتھی حالت یہ ہے کہ طالب سے نہ امید قبول نہ کسی ضروری امر میں خلل نہ کسی مضرت کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں قوی ہمت کے لئے عزیمت واولیٰ ہے اور ضعیف ہمت والے کے لئے رخصت وغیر اولیٰ۔

(۵) پانچویں حالت یہ ہے کہ نہ طالب سے توقع قبول اور ساتھ ہی کسی دینی مضرت کا احتمال یا کسی اہم دینی منفعت کے فوت ہونے کا احتمال ہے اس صورت میں اس سے اعراض اور ضروری میں اشتغال واجب ہے۔

قرآن مجید میں اعراض اور ترکِ جدال کا امر ایسے ہی موقع پر ہے سورۃ عبس کے شانِ نزول کا جو قصہ تھا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے اس کو تیسری حالت میں داخل سمجھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو پانچویں حالت میں داخل تبلایا۔

(۶) چھٹی حالت یہ ہے کہ مناظرہ کرنے میں تو مخاطب کی نہ کوئی منفعت متوقع ہے اور نہ اس سے کسی خاص مضرت کا احتمال ہو اور مناظرہ نہ کرنے سے عوام اہلِ حق کے شبہ میں پڑ جانے کا خوف ہو اور مسئلہ ایسا ہو کہ عوام اہلِ حق کو اس کے غلط ہونے کا احتمال بھی نہ ہو تاکہ علمائے حق سے دریافت کر سکیں تو اس صورت میں اس کی تدبیر واجب ہے جو دو ہیں۔

ایک یہ کہ خود اہلِ باطل کو مکالمہ یا مکاتبہ میں مخاطب بنایا جائے۔

دوسری یہ کہ اس سے خطاب نہ کیا جائے بلکہ عام خطاب سے حق کو ثابت اور باطل کو رد کیا جائے۔ ان میں جس تدبیر کو اختیار کیا جائے واجب ادا ہو جائیگا۔

(۷) ساتویں حالت یہ ہے کہ قیود مذکورہ حالت ششم کے ساتھ وہ مسئلہ

بھی ایسا ہو کہ عوام اہل حق کو اس کے غلط ہونے کا شبہ واقع ہو سکتا ہو اس صورت میں خود عوام پر واجب ہے کہ علماء سے تحقیق کریں اور علماء پر جواب دینا واجب ہوگا ورنہ بدون سوال وہ سبکدوش ہوں گے

اور ان تمام صورتوں میں یہ واجب ہے کہ الفاظ و مضمون متانت و تہذیب کے خلاف نہ ہوں اور اگر دوسرا درشتی کرے تو صبر ہی افضل ہے

ممنوع و مذموم بحث و مباحثہ

یہ ساری تفصیل و تقسیم ان امور میں ہے کہ جو شرعاً مقصود ہوں بعض وہ امور ہیں جو شرعاً مہتم بالشان نہیں جیسے خاندان چشتیہ کا باہم تفاضل۔ یا بعض وہ امور جن میں بحث کرنے یا حکم لگانے سے شارع علیہ السلام نے منع فرمایا ہے جیسے تقدیر کا یا کوئی دوسرا ایسا ہی مسئلہ، مثلاً باوجود اس کے کہ کسی کا کلام صحیح معنی کو محتمل ہو پھر بھی اس پر کفر کا حکم لگانا، ایسے امور میں بحث و مباحثہ کرنا ممنوع و مذموم ہے جس مرتبہ کی نہی یا منہی عنہ ہوگا اسی مرتبہ کی ممانعت و مذمت ہوگی

اس سے معلوم ہوا کہ نہ ہر مناظرہ محمود ہے نہ مذموم، نیز تمام وہ نصوص و اقوال اور عادات ائمہ دین جو بظاہر اس باب میں متعارض نظر آتے ہیں ان میں تطبیق ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس زمانہ میں زیادہ ایسے ہی مناظرے شائع ہیں جو مذموم ہیں[1]

---

[1] ایک مناظرہ ہی کی بحث میں حضرت مجدد کی ان تجدیدی تنقیحات و تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح ہر مسئلہ کے تمام جزئی پہلو آئینہ فرما دیئے جاتے ہیں اور بظاہر متضاد سے متضاد جزئیات کی چولیں کس طرح اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہیں اور ہر شے اپنی حد میں رہتی ہے، ع

ایں سعادت بزور بازو نیست

مسٹروں کے ملکی وسیاسی مناظروں نے مولویوں کے دینی ومذہبی مناظروں کو بھی مات کردیا۔

البتہ مولویوں اور مذہب کے میدانی یا تحریری مناظرات کی جگہ (جن میں پھر بھی دین سے ایک لگاؤ تھا) اب حکومت وسیاست اور مسٹروں کے پنڈالی یا اخباری مناظرات نے حاصل کرلی ہے جن کو تحقیقِ حق یا قبولِ حق سے اتنا بھی تعلق نہیں جتنا دینی مناظروں کے معمولی سے معمولی فریقین کو ہوتا تھا۔

بس ہر جماعت اس کے ہر لیڈر و اڈیٹر اور ہر جلسہ وجلوس کا فرض یہ ہے کہ اپنی ہی بات جہاں تک ہو سکے اتنے غل وہنگامہ کے ساتھ کہے جائے کہ دوسرے کی نہ خود سنے نہ کسی کو سننے دے اور اس فرض کی ادائی میں بغض وعناد، دروغ وبہتان، مکر وفریب، لعن وطعن یہ سب فریقین کے لئے عین سیاست اور عین تہذیب ہے کیونکہ یہ سب پروپیگنڈا ہے، یہی نہیں بلکہ ہر درجہ کا طوفان بے تمیزی فتنہ وفساد، ملک وقوم کی عین خدمت بلکہ درجہ جہاد ہے،

فریقِ مخالف کے جلسوں اور جلوسوں میں فتنہ برپا کرنا، مقرر کو تقریر نہ کرنے دینا، شرم شرم کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لینا، حسب ضرورت سوڈے کی بوتلوں اور انڈوں کی مار سے تواضع کرنا اس سے بھی کام نہ چلے تو اینٹیں اور پتھر ہیں اور پھر یہ فتنہ وفساد کوئی اتفاقی نہیں بلکہ ہر جلسہ وجلوس میں اس کا احتمال اس لئے پہلے سے جلسہ وجلوس کی اجازت اور پھر موقع کے لحاظ سے پولیس یا فوج کی نگرانی لازم ہے۔ اور جو خوش قسمت اس قومی وسیاسی جہاد میں پولیس کے ڈنڈوں اور فوج کی گولیوں کے لئے سینہ پیش کرکے کام آسکے اس کے مجاہد

وشہید ہونے میں کیا شک ، جلسوں اور جلوسوں ہی کی قید نہیں یوں بھی فریقین جو دہشت انگیزی اور کشت وخون میں بازی لے جاسکے مثلاً فلسطین کے یہودی تو بس وہی برسرِ حق ہے اس کے علاوہ نہ امریکہ کے ٹرومین کے پاس ٹرویا حق کا کوئی معیار ہے اور نہ برطانیہ کے پاس انصاف، یا اپنے وعدوں کی شرم، بھلا حق و باطل کے پرانے مولویانہ مناظرہ کے فریقین کے پاس احقاقِ حق و ابطالِ باطل کے لئے ایسی دہشت انگیزی کی منطق اور دلائل کہاں موجود تھے جن کا مقابلہ بڑی بڑی حکومتوں کو اپنی فوجوں سے کرنا پڑے

مسلمانوں کی جیت سیاسی مباحثوں اور مناظروں میں بھی حضرت مجدد کے تجدید فرمودہ اصول ہی میں ہے ۔

کاش مسلمان اب بھی آنکھیں کھولتے کہ انہوں نے وحی نبوت کی روشنی کو رکھتے ہوئے دین و دانش دونوں آنکھوں کے کیسے اندھوں کا دامن تھام رکھا ہے ، مسلمانوں کی تو دنیا کا بھی ہر اہم مسئلہ کسی نہ کسی طرح نفیاً یا اثباتاً بواسطہ یا بلاواسطہ دین ہی کا مسئلہ ہے ، اس لئے اگر وہ اغیار سے اخباری و پنڈالی بحث و مناظرہ میں صرف اپنی دینی راہ کے ان حدود و شرائط پر عمل پیرا ہو جائیں جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ نے آخر میں بطور خلاصہ تحریر فرماتے ہیں تو انشاء اللہ نصرت حق کی بدولت معاندین کے باطل پروپیگنڈے اور ناحق کی خونریزی و دہشت انگیزی کو بالآخر مغلوب ہی ہونا پڑے گا بس ذرا ایمان و عمل صالح کے ساتھ تواصی بالحق و تواصی بالصبر کی ضرورت ہے بہرحال مسلمانوں کے لئے بہ حیثیت مسلمان حکومت و سیاست کے

بظاہر دنیاوی مسائل میں بھی بحث و مباحثہ کے وہی آداب و شرائط ہیں جو خاص دینی مسائل میں ہیں۔

" یعنی وہ مسئلہ دین میں مقصود بھی ہو، دل سے یہ عزم ہو جائے کہ حق واضح ہو جائے گا تو فوراً قبول کرلیں گے یہ نیت نہ ہو کہ ہر بات کو رد کر دیں گے گو سمجھ میں بھی آجاتے، مخاطب پر شفقت ہو اگر وہ شفقت کے قابل نہ ہو تو صبر و معدلت کے ساتھ مقابلہ کرے اگر قرائن سے عناد مشاہد ہو تو مناظرہ سے معافی کی درخواست کرے الفاظ و مضمون نرم ہو جو بات معلوم نہ ہو نہ جاننے کا اقرار کرنے میں عار نہ کرے "

ذرا ان اصولوں کو مسلمان امتحاناً ہی کچھ عرصہ صبر و عزیمت کے ساتھ اپنے اخباری و سیاسی مباحثوں اور اکھاڑوں میں آزما دیکھیں، گو یہ صبر و عزیمت دین سے تعلق کے بغیر نصیب ہونا آسان نہیں تاہم جہاں ترقی کی سب تدبیریں کرتے ہیں دین کے تعلق کو بھی بطور تدبیر ہی اختیار کر دیکھیں، مگر جب خود علمار ہی طوفانِ بے تمیزی کے اس اکھاڑے میں کود پڑے ہوں تو عوام سے کیا اور کس منہ سے کہا جاتے، اور دینی اعتبار سے لیڈروں کا شمار عوام ہی میں ہے ورنہ وہی ہونا تھا جو آج آنکھوں کے سامنے ہے کہ ان باتوں کو دیکھ کر

عوام الناس علمار سے بھی بدگمان ہو گئے ہیں کہ یہاں ہر شخص دوسرے کی تکذیب کرتا ہے اس لئے یا تو سب ہی کو چھوڑ دیتے ہیں، یا ایک کی طرف ہو کر مقابل کی بے آبروئی اور ایذا رسانی کے در پے ہوتے ہیں اور باہمی عداوت قائم ہو کر ایکدوسرے کی بے آبروئی (بلکہ جان تک) کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور گروہ بندیاں ہو کر

مسلمانوں کی وقعت و قوت میں روزانہ ضعف وانحطاط ہوتا جاتا ہے کبھی مارپیٹائی ہوکر نوبت بعدالت پہنچتی ہے "

بعض لوگ ان مفاسد سے قطع نظر کرکے اخباری یا پنڈالی بحث ومباحثوں کے طرح طرح کے مصالح و فوائد بیان کرتے ہیں مگر شرائط بالا کے فقدان کی صورت میں ہوتا وہی ہے جو ایسے مذہبی مناظرات میں ہوتا تھا کہ ملاں آں باشد کہ چپ نشود اب لیڈر آں باشد کہ چپ نہ شود" یعنی

ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا ہے ہر شخص دوسرے کا جواب، پھر وہ دوسرا اس کا جواب الجواب، پھر وہ پہلا اس جواب الجواب کا رد پھر دوسرا اس رد کا رد دونوں اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہیں

اور بقول ایک بڑے عالم کے کہ جب تک مولوی یا لیڈر کی زبان پر لقوہ اور ہاتھ پر فالج نہ گرے اس ردوقدح کا تحریری وتقریری سلسلہ بند نہیں ہوسکتا۔ پھر ایک عربازاری یہ ہے کہ مولویانہ وعظ کی طرح جس کس وناکس کا جی چاہے لیڈرانہ تقریر کے لئے بھی کھڑا ہوجاتا ہے حالانکہ وعظ کے متعلق حدیثوں میں ہے کہ۔

لا یقصُّ الا امیرٌ او مامور او مختال او مرآءٍ

یعنی وعظ امیر کہتا ہے یا مامور کہتا ہے (یعنی اس کو کہنا چاہیئے) یا پھر شیخی باز (مختال) یا ریاکار۔

اسی طرح ہے کہ

من تعلم صرف الکلام لیسبی قلوب الناس لم یقبل اللہ لہ یوم القیامۃ صرفاً ولا عدلاً۔

یعنی جو آرٹیری (صرف الکلام) یا باتیں بنانا اس لئے سیکھتا ہے

کہ لوگوں کے دلوں کو پھانسے، اس کا قیامت کے دن نہ اللہ فرض عمل قبول فرمائے گا نہ نفل۔

آج کل اس صرف کلام یا باتیں بنانے اور الٹ پھیر کرنے کا جیسا زور اور جیسا بیجا استعمال ہے ظاہر ہے اور جیسے بہت سے واعظ بدوں کافی علم کے وعظ کہنے لگتے ہیں اور ضَلُّوا وَاَضَلُّوا کا مصداق ہوتے ہیں ویسے ہی آج کل کے بہت سے لیڈر واڈیٹر سیاسی و دنیوی مسائل کو بھی پوری طرح جانے اور سمجھے بغیر نام کے رہنما لیڈر بن کر خود بھی گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

مدارس کی اصلاح

یہ تو علماء کے فرائض و مشاغل کے متعلق اصلاحات تھیں۔ اس کے بعد جہاں علماء بنتے ہیں یعنی مدارس کی اصلاحات کا بیان ہے، ان مدارس کی مجدد آخر نگاہ میں اتنی اہمیت ہے کہ فرماتے ہیں

"اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اس وقت علوم دینیہ کے مدارس کا وجود مسلمانوں کے لئے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے فوق متصور نہیں، دنیا میں اگر اس وقت اسلام کے بقاء کی کوئی صورت ہے تو یہ مدارس ہیں کیونکہ اسلام نام ہے خاص عقائد و اعمال کا، جس میں دیانات، معاملات و معاشرات اور اخلاق سب داخل ہیں اور ظاہر ہے کہ عمل موقوف ہے علم پر اور علوم دینیہ کا بقاء ہر چند کہ فی نفسہ مدارس پر موقوف نہیں مگر حالاتِ وقت کے اعتبار سے ضرور مدارس پر موقوف ہے

لیکن ساتھ ہی ان مدارس میں ہم جیسے خدام و عمال کی سوء تدبیر سے متعدد ایسے امور پائے جاتے ہیں جن کی اصلاح بہت ضروری ہے اور یہ اصلاح نہ ہونے سے اہل علم کی جماعت ہدف ملامت بھی بنتی ہے اور ان مدارس کے قائم کرنے کی خود جو روح و غایت ہے یعنی عمل بالدین وہ بھی ضعیف ہو جاتی ہے اور لوگ

علوم دینیہ سے متوحش و نفور ہو جاتے ہیں تو اس طرح یہ جماعت علم گویا یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (خدا کی راہ سے روکنے) کا سبب بن جاتی ہے

چندہ کے متعلق خاص و اہم تجدیدی اصلاح

ایک بہت ضروری اصلاح جس کی طرف جا بجا متوجہ فرمایا گیا ہے اور جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کی خاص تجدیدی اصلاحات میں داخل ہے اور جس میں عوام و خواص علماء و غیر علماء لیڈر و مسٹر سب ہی مبتلا ہیں وہ یہ کہ اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ وَلَا یَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ اور لا یحل مال المرءِ الا بطیب نفسہٖ (کسی کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر حلال نہیں) کی صریح نصوص ہوتے ہوئے مدارس کے چندوں میں مال کے حلال و طیب پر کہنا چاہئے کہ بالکل نظر ہی نہیں ہوتی، مثلاً چندہ لینے میں دینے والے کے طیب نفس کی بالکل ہی پرواہ نہیں کی جاتی، بلکہ طرح طرح کے اثرات اور دباؤ سے کام لیکر زیادہ سے زیادہ وصول کر لینا ہی بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ

بعض جگہ دوامی چندہ کا وعدہ کرنے والے کی موت کے بعد وارث اس چندہ کو جاری رکھتے ہیں اور اہل مدارس اس کی تحقیق نہیں کرتے کہ ان لوگوں نے اپنے ملک خاص سے جاری رکھا ہے یا ترکۂ مشترکہ سے اور اس ترکۂ مشترکہ میں کوئی یتیم یا غائب یا غیر راضی کی ملک تو نہیں شریک ہے، اسی طرح میت کے کپڑوں کو مدرسہ میں لیتے وقت میت کے ورثہ اور ان کے بلوغ و رضا کی تحقیق نہیں کی جاتی "

لہ کسی کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر لینا حلال نہیں ۱۲

دوامی چندہ میں جو آخر سال بقایا واجب رہ جاتا ہے اس بقایا کا طلب
کرنا (جس کا عام رواج ہے) امر منکر معلوم ہوتا ہے اس سے
صاحب چندہ کی ناد ہندگی اور خلاف وعدگی کا اظہار ہے۔ مدرسہ
کانپور میں (جو خود حضرت کی نگرانی میں تھا) اس کی اصلاح اس طرح
کی گئی تھی کہ روئداد میں صرف وصول شدہ چندہ لکھا جاتا اور بقایا
کو مدرسہ کے خاص رجسٹر میں رکھ کر بذریعہ خط یاد دہانی کر دی جاتی تھی
اور یاد دہانی میں بھی میرے نزدیک ضروری ہے کہ لزوم و تاکید کے
الفاظ نہ ہوں بلکہ تصریح کر دی جائے کہ اطلاع دی جاتی ہے اگر
رغبت ہو تو بھیج دیجئے ورنہ آپ آزاد ہیں اور یہ کبھی نہ خیال کیا جائے
کہ اس طرح کون دیتا ہے یہ خیال غلط ہے جتنا آتا ہوتا ہے آتا
ہے اس کا کامل تجربہ ہو چکا ہے ہرگز وسوسہ نہ کیا جائے"

جب خود مدرسہ چلانے والے علماء و اکابر میں اتنا غناء و توکل بھی نہیں ہوتا تو
وہاں کے پڑھنے والوں میں خدا اور دین سے کسی خاص تعلق کی توقع کہاں تک ہو سکتی ہے
بعض لوگ چندہ کی رقموں میں اس طرح بیجا اخراجات اور خلافِ
اذن تصرفات کرتے ہیں جیسے گویا ان کی ملک ہے اس میں بہت
احتیاط کرنا چاہیئے۔

لیکن اس کی احتیاط اتنی کم کی جاتی ہے کہ ایک مشہور مدرسہ میں تو مسجد تک
کا روپیہ بے تکلف دوسری مدوں میں صرف کیا جاتا رہا جو نہیں معلوم مسجد بنتے وقت
پھر کس کس طرح ادا کیا اور کرایا گیا بھلا ایسی درسگاہوں میں ظاہری تدابیر و انتظام
کے باوجود اگر تقویٰ و تدین نہ پیدا ہو تو کیا تعجب ؟

طلبائے دین کی ذلت سے حفاظت

اگر جگہ جہاں طلبہ کو لوگ ذلیل وحقیر سمجھتے ہوں طلبہ کسی کے گھر کھانا لینے نہ جائیں اس میں علم اور اہل علم کی سخت اہانت ہے، نیز ایک اخلاقی خرابی یہ ہے کہ اس عادت کی بدولت دوسروں سے مانگنے میں طبعی انقباض یعنی جھجک نہیں رہتی اور یہی طبعی انقباض حیا کی ایک بڑی فرد ہے جو ذلت کے سوال سے انسان کو روکتی ہے جب یہ نہ رہی تو رکنا طبعًا نہ ہوگا عقلاً ہوگا اور غرض ایسی چیز ہے جو عقلی مانع کو جلد رفع کر دیتی ہے ایسے وقت طبعی مانع ہی کی ضرورت ہوتی ہے جب وہ نہ رہا تو اس شخص کو جب موقع ہوگا ہاتھ پھیلا دے گا۔ نیز جب دل میں ایسے شخص کی قدر و منزلت نہ رہی تو اس کا وعظ کیا نافع ہوگا۔

اس لئے جو طالب علم کو کھانا دینا چاہے مدرسہ میں بھیج دے اسی طرح دعوت میں بھی طلبہ کو نہ بھیجا جائے جس کو کھلانا ہو مدرسہ میں لاکر کھلائے اور ہر چند کہ پہلے بزرگوں نے اس کو جائز رکھا تھا لیکن اس وقت کے دنیادار عوام اہل علم کو ذلیل نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کے آنے کو اپنے گھر کے لئے موجب برکت سمجھتے تھے، تو یہ مفسدہ نہ تھا اور خود طلبہ کے کبر کا معالجہ بھی اس میں ہوتا تھا اور اسی کی ایک صورت طلبہ کو چندہ کی فراہمی کے لئے بھیجنا ہے اس کے بھی وہی آثار و مفاسد ہیں جو کھانا لینے کے لئے گھروں پر جانے کے۔

طلباء کی وضع و لباس

بعض مدرسوں میں طلبہ کے اعمال اور وضع و لباس پر روک ٹوک نہیں

ہوتی، اس سے جو اثر عوام و خود طلبہ پر ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں "
لیکن اس حسن فہم کو کیا کہیئے کہ جس چیز کی ضرورت حضرت علیہ الرحمۃ کے نزدیک محتاج بیان نہیں وہ بعض بڑے مشہور دینی مدارس اور ان کے اکابر کے نزدیک سرے سے چنداں محتاجِ توجہ نہیں، حالانکہ اہل فہم کے لئے الناس باللباس کا اصول دونوں اعتبار سے نہایت حکیمانہ و نفسیاتی ہے جیسا آدمی ویسا لباس اور جیسا لباس ویسا آدمی، یعنی جس طرح باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے اور ظاہر کی وضع و لباس کو باطن کے خیالات و رجحانات کے بنانے بگاڑنے میں دخل ہوتا ہے۔ موٹی بات ہے کہ ہماری وضع و قطع ہماری اندرونی پسند و ناپسند کے تابع ہوتی ہے جیسے اور جن عادات و اخلاق کے لوگوں کو ہم پسند کرتے اور جن کی ہمارے دل میں کسی اعتبار سے عظمت و محبت ہوتی ہے انہی کی وضع و لباس اور طور و طریق کو ترجیح دیتے اور اختیار کرتے ہیں،
آج کل کے اکثر جوان اور بوڑھے تک جو امرد بنے پھرتے ہیں ان سے راقم احقر یہی عرض کرتا ہے کہ یہ ڈاڑھی مونچھ کے چند بالوں یا مرد ہو کر امرد بننے کا سوال نہیں بلکہ دل کے اس چور کا اظہار بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے قلب میں خدا نخواستہ کرزن اور کرزنیوں کی وقعت و عظمت معاذ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور محمدیوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے اور کرزن کی شکل و صورت معاذ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت سے زیادہ پسندیدہ و محبوب ہے کون نہیں جانتا کہ جس کی ہمارے دل میں جتنی زیادہ محبت و عظمت ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ ہم طبعاً اس کی ایک ایک ادا اور نقل و حرکت کی نقالی کرتے ہیں اور اس کی حرکات و سکنات کے معقول یا نامعقول ضروری اور غیر ضروری ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، نہ فرض و وجوب، استحباب و اباحت کی بحث کی

جاتی ہے صحابہ رضوان اللہ علیہم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا پر جان دیتے اور اتباع کا اہتمام فرماتے تھے اس میں شرعی بحث سے زیادہ طبعی راز یہی ہے کہ ان کے رگ و ریشہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت پیوست تھی ۔

اب دوسری طرف لیجئے کہ اگر کسی بزدل و نامرد کو بھی پولیس یا فوج کی وردی پہنا کر کھڑا کر دیں تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے اندر بھی مردانگی کی ایک جھرجھری سی پیدا ہو جائے گی فوج و پولیس کے سپاہی جب گھریلو لباس اتار کر اپنی وردی یا یونیفارم پہن لیتے ہیں تو اپنے فرائض و منصب کا شعور قدرۃً تیز و تازہ ہو جاتا ہے پولیس کا کوئی سپاہی اگر وردی میں چوری کرتے پکڑا جائے تو زیادہ مجرم و محجوب ہوگا کہ جو وردی چوروں کے پکڑنے کو پہنائی گئی تھی اس میں خود چوری کرتے پکڑا گیا۔ کافروں اور فاسقوں کی وضع و قطع ہیئت و صورت اختیار کی جاتے تو کفر و فسق ہی کے میلانات کو تقویت ہو گی، اور اگر آدمی مختوم القلب نہ ہو گیا ہو تو نیکوں و متقیوں کے ریائی لباس میں بھی فسق و فجور کے ارتکاب سے قدرۃً شرم و جھجک ہوگی، ظاہر کے تغیرات کا باطن کے میلانات و جذبات پر اثر پڑنا نفسیات کی مسلمہ و بدیہی حقیقت ہے

افسوس کہ فکر و فہم کے قحط اور تقلید و نقالی کی وباء کی بدولت ایسی موٹی باتوں کی بھی اتنی تفصیل کرنی پڑی جو واقعاً حضرت علیہ الرحمۃ کے بقول سرے سے محتاج بیان ہی نہ تھیں۔ بہرحال اب یہ وبا اچھے اچھے عربی و دینی مدارس میں پھیل رہی ہے کہ اپنے بزرگوں اور صلحاء و اتقیاء کی صورت کے بجائے اغیار اور کفار و فساق کی سج دھج کی کھلے چھپے نقالی ہوتی ہے ڈاڑھیوں پر اگر استرے کا وار کسی مجبوری و مصلحت سے نہیں ہوتا تو قینچی کی نوازش اس کو مسنون حد تک

تو مشکل ہی سے آنے دیتی ہے بہت سے طلبہ اور بعض اساتذہ تک کے انگریزی بال ٹوپیوں کے اندر اہتمام کے ساتھ چھپاتے جاتے ہیں، محبوب وضع کی حفاظت بہرحال لازم ہے خواہ اظہار کی بے تابی کے باوجود کسی مجبوری سے اخفاء کی مصیبت ہی جھیلنا پڑے، پائجاموں کا ٹخنوں سے اوپر رکھنا بھی اکثر بادل نخواستہ ہوتا ہے اس لئے ان کی کتر بیونت جدید ہی رہتی ہے کہ جب موقع ملا نیچے کھسکایا اور پر چڑھالیا پھر بھی مولویت کی ذلت کو کرتا خصوصًا اگر ذرا سا لمبا ہو فاش کر دیتا تھا، سو اس کی جگہ قمیص تو گویا اب عربی طلبہ بلکہ اساتذہ تک میں ایک بالکل بے عیب فیشن ہے اور بعض عربی مدارس جو زیادہ روشن خیال و ترقی یافتہ ہیں ان کی ورزشوں اور کھیلوں میں ہاکی فٹ بال وغیرہ ہی مقبول ہیں اور نام کی اصلاحی انجمن (یونین کی نقالی) کی ترقیوں کے سلسلے میں فخریہ اخبار میں شائع ہوتا ہے کہ انعام میں ورلڈ کپ اور مڈل تقسیم ہوئے، غرض اب قرآن و حدیث پڑھنے والے یہ طالب علم اپنے نزدیک ملٹن اور شکسپیر پڑھنے والی برادری کی نگاہ میں زیادہ رسوا نہیں۔

خوب یاد رکھنا چاہئے کہ اس روش کی شرعی حیثیت جو بھی ہو لیکن اس سے کوئی حقیقی عزت غیروں کی نگاہ میں تو کیا ہوتی خود اپنی نگاہ میں اپنی ذلت اور احساسِ کمتری کا پکار پکار کر اعلان ہے اور دنیا کی نظر میں دنیا کی عزت بھی طبعًا و عقلًا انہیں کی ہوتی ہے جن کی نظر میں خود اپنی اور اپنے دینی و قومی شعار وضع و لباس کی عزت ہو۔

اس کے علاوہ جو مولوی یا مدارس دینیہ کا جو طالب علم، اسکول ماسٹر یا اسٹوڈنٹ کی وضع قطع میں نظر آتا ہو اس سے قدرتًا ایک عامی آدمی انگریزی کا خط یا تار ہی پڑھوانا چاہیگا نہ کہ کوئی فتویٰ یا دینی مسئلہ دریافت کرنے کا

خیال کریگا۔ آخر جن کے بنائے ہوئے مسٹروں کی بوزنہ وار تقلید میں ہم دیوانے ہیں ان کے مولویوں (پادریوں) کی بھی کم از کم اب تک تو ایک خاص وضع ہی محمود خیال کی جاتی ہے بلکہ داڑھی تک وہ بھی ایک مشت سے زائد مقدار ہی کی ان کے چہروں کو بھی ایک مذہبی و مقدس جماعت کا چہرہ ظاہر کرتی ہے اس سے بھی بڑھ کر یونیورسٹیاں اپنے طلبہ تک کے لئے خاص خاص یونیفارم مقرر کرتی ہیں لہٰذا اس ذوق تقلید ہی کی دلیل سے سہی اگر ہمارے علماء اور دینی طلبہ کا بھی کوئی یونیفارم ہو تو آخر اس میں کیوں ذلت محسوس کریں۔

حاصل یہ کہ لباس و وضع کا معاملہ خفیف و حقیر ہرگز نہیں اس کے مصالح و مفاسد دونوں اشد بھی ہیں، اور جنہوں نے اپنے دین کو اغیار کے دباؤ سے کچھ آزاد کر لیا ہے ان کی نگاہ میں اظہر بھی اور اتنی تفصیل محض ہماری مغرب زدہ مرعوبیت و غباوت کی بناء پر ضروری ہوئی

عطائے سند میں بے احتیاطی و نقالی

ایک اور بہت بڑا خطرناک مرض تمام مدارس میں نقالی ہی کی راہ سے یہ پھیل گیا ہے کہ پاس فیل کے کچھ نمبر مقرر کر لئے گئے ہیں جس نے ان کو الٹے سیدھے کسی طرح حاصل کر لیا۔ بس اس کے ہاتھ میں عالم و فاضل اور مقتدائے دین ہونے کی ایک سند پکڑا دی گئی، نہ سند پکڑاتے وقت علم کی استعداد و صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے نہ عمل کے صلاح و تقویٰ کو، اس کی نسبت ارشاد ہے کہ

بعض مدارس میں ایسے لوگوں کو سند فراغ دیدی جاتی ہے یا دستار بندی کر دیجاتی ہے جو باعتبار علم یا صلاح و عمل کے اس کے اہل نہیں ہوتے جب ان لوگوں کی علمی و عملی کوتاہیاں دوسروں پر ظاہر ہوتی

ہیں تو سارے علماء کو ان پر قیاس کر کے سب سے بدظنی ہو جاتی ہے تو دین کے معاملات میں پھر کس سے رجوع کریں گے۔ کس کے قول پر عمل کریں گے پھر دین کا کیا حشر ہو گا۔ تو ان مفاسد کا سبب وہ بے احتیاط لوگ ہوتے جو نا اہلوں کو قوم کے سامنے سند دے کر اہل ظاہر کرتے ہیں

شاید اس رسالہ کی تحریک کے وقت حضرت علیہ الرحمۃ کی نظر میں بعض مدارس ہی ایسے رہے ہوں اب تو کوئی استثناء نظر نہیں آتا اگر اس ایک بات ہی کی اصلاح کا پورا اہتمام مدارس دینیہ کر لیں تو انشاء اللہ علم و عمل دونوں اعتبار سے خدمتِ دین کے لئے اوسط درجہ کے علماء کا اوسط بہت بڑھ جائے۔

قواعد کی پابندی میں سستی

تعلیم و تعلم وغیرہ کے معاملات میں اب اکثر عربی مدرسوں میں طلبہ کی خواہش و مذاق اور کثرت تعداد کے مقابلہ میں اصول و قواعد کی پروا کم کیجاتی ہے اس سے بھی وہی مذکورۂ بالا قسم کے مفاسد پرورش پاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ طلبہ کو قواعد کا پابند بنایا جائے خواہ ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو جائے، کام کے دو چار ناکارہ سو دو سو سے افضل ہیں

تجوید و اخلاق کی تعلیم سے غفلت

اکثر مدارس میں تجوید کا علم و عمل داخل نصاب نہیں، اسی طرح اخلاق کی کوئی کتاب درس میں نہیں اول کی کمی کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر طلبہ بلکہ علماء بھی افسوس ہے کہ قرآن مجید اچھا نہیں پڑھتے جس پر عوام بھی ہنستے ہیں کتنا بڑا ظلم ہے کہ امام

عالم ہو اور نماز فقہ کی رو سے درست نہ ہو، لہذا طلبہ پر لازم کیا جائے کہ تجوید علماً و عملاً حاصل کریں۔

راقم سطور اس معاملہ میں ایک بڑی نامی عربی درسگاہ کا تلخ تجربہ درج کر چکا ہے کہ بچوں کے لئے مکتب تو قائم کر دیا گیا اور اس میں قرآن مجید لازم بھی ہے لیکن تجوید کیا معمولی تصحیح مخارج تک کا انتظام نہیں تھا اور نیچے سے اوپر تک کے ذمہ داروں سے عرض کرتے کرتے تھک گیا یہاں تک کہ خود اپنے بچے کو وہاں سے ہٹا لینے کا بڑا سبب یہی ہوا۔

بُرا نہ مانا جاتے تو اصل یہ ہے کہ ایسی درسگاہوں کے خود اساتذہ و منتظمین اور اکابر کے اندر دین کی فکر و عظمت دونوں کا ایسا زوال ہے کہ سمجھتے ہی نہیں کہ کس کوتاہی کا اثر کتنی دور تک جاتا ہے یہ تو فکر کی کمی ہے، اور اگر سمجھے بھی تو عظمت کی کمی کی وجہ اس کی اصلاح و تدبیر میں مستعدی نہیں فرماتے بلکہ رکیک رکیک عذرات کرتے ہیں

"دوسری کمی (یعنی تعلیم اخلاق کو درس سے خارج کر دینے) کی مضرتیں اس قدر کثیر ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ کہ علماء کی اس فن سے بےخبری کی بدولت جھوٹے مکار پیر بن گئے ہیں جو خلقت و دنیا کو ذبح کر رہے ہیں اس لئے چاہئے کہ اخلاق کی کتابوں کو درس میں داخل کریں (اور صرف درس اخلاق ہی کافی نہیں) بعد فراغ التزاماً طلبہ محققین اہل اللہ کی خدمت میں حسب گنجائش قیام کریں اور ان سے عملاً آداب اخلاق سیکھیں اور ان کی صحبت سے برکت حاصل کریں اور چندے ان کی خدمت میں آمد و رفت رکھیں جس سے کہ نسبتِ باطنہ ایک گونہ راسخ ہو جائے، تب خلق اللہ کے ارشاد کو اپنے ہاتھ میں لیں

انشاء اللہ عموماً عوام اہل اسلام ان سے وابستہ ہو کر جھوٹوں کو چھوڑ دیں گے اور مضمون قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ؕ آنکھوں سے نظر آجائے گا۔

بات یہ ہے کہ باطنی اخلاق کی اصلاح و درستی جس کا اصطلاحی نام فقر و درویشی یا تصوف پڑ گیا ہے یہ دین کی روح ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ سے قلبی و روحانی تعلق پیدا نہیں ہوتا اور دین بے جان یا نیم جان رہتا ہے لوگوں کو سوکھے ساکھے دین میں خدا کی بو نہیں محسوس ہوتی ورنہ انسان کی عام فطرت تو یہ ہے کہ

ہر کجا بوئے خدا می آید خلق را بیں بے سروپا می آید

اس لئے جہاں جہل کے باوجود یہ بو کچھ موجود ہوتی ہے خواہ زیادہ تر نقلی و نمائشی ہی ہو لوگ پھنس جاتے اور جہل کی گمراہیوں کے ہاتھ تباہ ہوتے ہیں اس لئے علم کے ساتھ تزکیۂ اخلاق کا اہتمام ضروری ہے۔

اس آخر دور میں بھی دہلی کے شاہ ولی اللّٰہی خاندان میں اس اجتماع کے کیسی کیسی عظیم برکات و اثرات کا مشاہدہ ہو چکا ہے، دیوبند کا سلسلۂ خیر و برکت بھی اسی اجتماع کا فیض ہے وہاں کے اکثر اکابر و اساتذہ ظاہر و باطن کے جامع کمالات رہے ہیں، فرنگی محل لکھنؤ کے بھی بہت سے اکابر دونوں رنگوں کے جامع تھے لیکن اب ہر جگہ اس رنگ کے اکابر کی روز بروز کمی بلکہ فقدان ہے، دیوبند و فرنگی محل دونوں پر تو مسلمانوں کا موروثی حق ہے اس لئے ان دونوں حضرات کو خصوصاً اور عام مدارس عربیہ کے حضرات کو عموماً اس جامعیت کے رنگ کو پیدا اور قوی کرنے کی طرف پوری توجہ فرمانے کی ضرورت ہے۔

اصلاح درس و تدریس

قدیم طرز کے مدارس عربیہ کا درس و تدریس بھی بہت کچھ محتاج اصلاح ہو گیا ہے، مولانا عبداللہ گنگوہی کا بالکل حضرت ہی کے اصول ورنگ کا ناصح الطلبہ نام ایک مضمون ہے اس میں درس و تدریس سے متعلق اصلاح طلب امور کی جو تفصیل ہے وہ ہمارے تمام قدیم طرز کے مدارس کے اساتذہ و منتظمین کے لئے لفظ بہ لفظ پڑھنے اور توجہ فرمانے کے لائق ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایک طرف تو تحصیل علم کے سامان پہلے کے مقابلہ میں زیادہ فراہم ہیں۔ کتابوں کو لیجئے کہ حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ کے درس میں ۲۲ آدمی بخاری شریف میں شریک تھے اور صرف ایک نسخہ تھا سب اس سے نقل کر کے پڑھتے تھے آج ہر درس کی کتاب بلا اس محنت و مشقت کے ہر طالب علم کے پاس موجود ہے لیکن دوسری طرف یہ حال کہ نہ کتاب کی طرف توجہ، نہ اساتذہ سے اُنس، نہ شوقِ طلب، نہ مطالعہ، نہ تکرار، دستار فضیلت زیب سر ہو جاتی ہے اور استعداد کی یہ حالت کہ عبارت صحیح نہیں پڑھ سکتے، املا تک درست نہیں (الا ما شاء اللہ)

اس قابلیت کے ثمرات ظاہر ہے کہ درس و تدریس یا افتاء وغیرہ کسی اعلیٰ خدمتِ علم کے قابل نہیں ہوتے کہیں وعظ کو پیشہ بنا لیا کہیں مسجد کے امام بن گئے کہیں الٹی سیدھی طب پڑھ لی وہ بھی چلتی نہیں۔ ان نتائج کو دیکھ کر کم عقلوں نے سمجھ لیا کہ علم دین کا نتیجہ جب یہی ہے تو اپنی اولاد کو پڑھا کر کیوں برباد و رسوا کریں۔ اس کم عقلی کا جواب تو یہ ہے کہ:۔

مدارسِ اسلامیہ میں بیکار پڑے رہنا بھی انگریزی میں مشغول ہونے
سے لاکھوں کروڑوں درجے بہتر ہے اس لئے کہ گو لیاقت اور کمال
حاصل نہ ہو لیکن کم از کم عقائد تو خراب نہ ہوں گے اور مسجد کی جاروب
کشی اس وکالت و بیرسٹری سے بہتر ہے، جس سے ایمان میں تزلزل
ہو اور خدا و رسول، صحابہ اور بزرگانِ دین کی شان میں بے ادبی ہو،
جو انگریزی کا اس زمانہ میں اکثری بلکہ لازمی نتیجہ ہے ہاں جس کو دین
ہی کے جانے کا غم نہیں وہ جو چاہے کرے اور کہے،،

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عربی مدارس کی اصلاح نہ ہو یہ اصلاح بہت ضروری
ہے اگر ان کی اصلاح ہو گئی تو ایک عالم کی اصلاح ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ
کہ پرانے طریقِ تدریس سے بڑے بڑے علما پیدا ہوتے اور اب بھی کچھ نہ کچھ ذی
استعداد نکل آتے ہیں گو کم ہی سہی، لیکن اس زمانہ میں طلبہ کی کم توجہی اور قوتِ
فہم کی کمزوری کی وجہ سے یہ طریقِ تدریس کافی نہیں۔

اب تک طریقہ یہ ہے کہ پہلے طالب علم عبارت پڑھتا اور مدرس مطلب
بیان کر دیتا ہے اگر کسی کو کچھ شبہ ہوا اور دریافت کر لیا ورنہ آگے چل پڑے۔
یہ طریق مبتدیوں بلکہ متوسطین کے لئے بھی غیر نافع ہے صرف ایسے منتہی طلبہ
کے لئے نافع ہے جو فاضلانہ استعداد حاصل کر چکے ہیں اور بڑے اساتذہ کے
ہاں مستفید ہو رہے ہیں۔

اس میں اصلاح کی ضرورت یہ ہے کہ خود طلبہ کی استعداد سے کام لیا جائے
بلا ضرورت ان کی امداد نہ کیجائے خود ان ہی سے یہ مطلب کی تقریر کرائی جاتے
نیز ہر قاعدہ و مسئلہ کی کثرتِ امثلہ سے مشق کرائی جائے البتہ جو مقام طلبہ کی
استعداد سے باہر ہو اس کی خود تقریر کر دے، یہ طریقہ یوں تو سارے درس

کے لئے مفید ہے ورنہ ابتدائی کتابوں میں تو بہت ضروری ہے، مثلاً میزان منشعب میں ایسا نہ کیا جائے کہ سبق پڑھایا اور اس کو رٹوا کر سن لیا اس سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ ہر سبق کی بکثرت مثالوں سے مشق کرائی جائے مثلاً ماضی کی بحث پڑھائی جائے تو کم سے کم اس کے تین چار سو مختلف صیغوں کی مشق کرائی جائے اور مصادر دے کر ماضی کے صیغے بنوائے جائیں، اور ماضی کے صیغوں کی اردو دیجائے۔ کہ اس کی عربی بنادیں اگرچہ اس اجراء میں ایک ہی سبق میں کئی روز صرف ہوجائیں۔

اسی طرح جب نحو میر تک پہنچے تو ہر قاعدہ کے متعلق چھوٹے چھوٹے عربی جملے دیکر اردو ترجمہ اور اردو کے جملے دیکر عربی بنوائی جائے حتی کہ نحو میر کے ختم پر طویل طویل سلیس عبارتیں اردو کی دے کر عربی بنوائی جائے اور سلیس عربی کا ترجمہ کرایا جائے۔ اس طرح جب نحو میر ختم ہوگی تو شرح مائۃ وہدایت النحو کی عبارت طالب علم خود صحیح پڑھے گا اور اگر کہیں غلطی کرے تو بتلایا نہ جائے اس سے خود قاعدہ پر جواب طلب کیا جائے

اس میں شبہ نہیں کہ اگر قدیم طریق میں اتنی اصلاح کرلی جائے تو وہ جدید کے بہت قریب آجاتا ہے اور دونوں کا نفع بڑی خوبی سے جمع ہوجاتا ہے نحو وصرف کی قواعددانی پر پرانوں کا جو اصرار ہے اور جو نفع اس کا بتلاتے ہیں وہ بھی قائم رہتا ہے اور نیوں کا نحو وصرف کو بے سمجھے خالی رٹانے اور وقت وذہن کو خراب کرنے کا اعتراض بھی جاتا رہتا ہے اور ہدایت النحو تک پہنچ کر یقیناً عبارت خوانی کی کافی استعداد حاصل ہوجائے گی جو رائج الوقت کافیہ وشرح جامی تک پڑھ کر بھی حاصل نہیں ہوتی۔

آگے چل کر ہر فن کی تعلیم اسی طریقہ پر ہو، مثلاً بلاغت شروع ہو تو

ہر قاعدہ کے متعلق قرآن مجید کی آیات اور اشعار جاہلیت دے کر قواعد بلاغت کو جاری کرایا جاتے، اسی طرح فقہ میں ہر کتاب کے موافق چھوٹے چھوٹے مسئلے دیئے جائیں کہ بحوالۂ کتب ان کے جواب لکھیں وقس علیٰ ھٰذا۔

اس میں گو پہلے مدت زیادہ لگے گی لیکن استعداد بڑھنے سے جی بڑھیگا اور توجہ زیادہ ہوگی تو آگے چل کر وقت بھی کم صرف ہوگا اور ابتداء کی کسر انتہاء میں نکل آوے گی۔

البتہ اس طریق اصلاح میں اصلی محنت و توجہ استاذ کو کرنا ہوگی اور ہر مدرس پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا اس لئے اس میں آسانی پیدا کرنے کے لئے بھی یہ تجویز فرمائی گئی ہے کہ ایسی درسی کتابیں شائع و مرتب کردی جائیں جن کے حواشی پر مشقی مثالیں سلیقہ اور حسن ترتیب کے ساتھ جمع ہوں اور جہاں ہر چھوٹے بڑے کام کے لئے جو کچھ بھی ضروری ہو چندہ کرکے اس کا اہتمام کیا جاتا ہے تو یہ اس اعتبار سے سب سے ضروری کام ہے کہ لائق وذی استعداد علماء کے کم ہوتے ہوتے بالآخر علوم دین ہی کے گم ہو جانے کا اندیشہ ہے جس پر سارے دین کا مدار ہے۔

بلکہ اگر ایک دفعہ کچھ سرمایہ فراہم کرکے ایسی درسی کتابوں کی اشاعت کا صرف آغاز کردیا جائے تو بار بار کسی چندہ کی ضرورت نہیں ہوگی انہی کی فروخت سے آگے کا کام انشاء اللہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔

نیز اس قسم کی اصلاحات سے وحشت و استنکاف کی کوئی وجہ نہیں ایسی ایسی ترمیمات تو ہمیشہ ہوتی رہی ہیں، سلف صالحین و محدثین کا طرز یہ تھا کہ شیخ خود پڑھتے اور تلامذہ سنتے تھے اس وقت یہی نافع و کافی تھا پھر علماء نے اس طرز کو بدل دیا تلامذہ میں ایک پڑھتا اور شیخ سنتے، اس کے بعد

نمبر مقرر کیا گیا کہ نمبر وار سب پڑھیں اس میں یہ شبہ ہوا کہ جس کا نمبر ہوگا وہی مطالعہ دیکھے گا باقی نہ دیکھیں گے اس لئے یہ کیا گیا کہ جس کو استاد کہے وہی پڑھے، غرض حسب ضرورت طرق تدریس میں ترمیم و اصلاح ہمیشہ سلف سے آج تک ہوتی رہی تو اب اس سے خواہ مخواہ بھڑکنے کی کیا وجہ؟

اصلاح اعمال و اخلاق

یہ تو علمی و تدریسی اصلاحات کے متعلق تھا عملی و اخلاقی اعتبار سے بھی بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کی اصلاح و تدارک کی طرف بہت خاص توجہ و اہتمام کی ضرورت ہے ان میں دو باتوں کا خصوصاً ذکر فرمایا گیا ہے۔

(۱) ایک بے ریش لڑکوں کا فتنہ ہے اس لئے مدارس میں یہ انتظام ہونا ضروری ہے کہ دس دس، بیس بیس لڑکوں پر ایک معمر نگران مقرر ہو جو ان امور کی نگرانی رکھے کہ کسی بڑے طالب علم سے نہ ملنے دے، نگران سے الگ ہو کر آپس میں باتیں نہ کریں ان کے نام جو خطوط آئیں وہ بھی دیکھ کر دے ان کے سر منڈاتا رہے پان نہ کھانے دے لباس سادہ ہو، اگرچہ امراء کے بچوں کا قیمتی ہو نماز و جماعت میں ان کی حاضری کی فکر رکھے، تفریح یا کسی ضرورت سے بازار جائیں تو ان کے ساتھ رہے ان باتوں کی خلاف ورزی پر مناسب سزا دے۔

نئی روشنی کے اثرات

دوسری نہایت قابل افسوس چیز نئی روشنی یا نیچریت کے اثرات ہیں جو ہیضہ و طاعون کی طرح پھیل گئے ہیں جس سے بہت کم نفوس محفوظ ہیں عربی مدرسوں کے طلبہ بھی ان اثرات کو قبول کر رہے ہیں الحمد للہ کہ ابھی عقائد پر تو زیادہ اثر نہیں پہنچا ہے لیکن پہلی سی سادگی و بے تکلفی جاتی رہی ہے وضع قطع سے مسٹر یا نیم مسٹر معلوم ہوتے ہیں نہ چہرہ پر تقویٰ کے انوار نہ بات چیت میں تواضع کے آثار، کتابوں میں جی نہیں لگاتے نہ مطالعہ سے کام نہ تکرار سبق سے سروکار، مقرر بننے کی فکر، اخباروں اور پرچوں میں مضمون نگاری کی دھن، تاویل یہ کہ ضرورت زمانہ سے مجبوری ہے کہ تبلیغ کے لئے تحریر و تقریر نئے رنگ و مذاق کی ہو۔ اس کی ضرورت مسلم، لیکن اس کے اندر جو خفیہ مقاصد ہیں ان پر اطلاع ضروری ہے تجربہ یہ ہے کہ ایسی تحریر و تقریر بالعموم حب جاہ پیدا کرتی اور اخلاص کے رنگ کو مٹاتی ہے اور طالب علمانہ رنگ و سادگی قلب سے دور ہو کر صرف عبارت آرائی اور دعوے ہی دعوے رہ جاتے ہیں اس لئے عام طلبہ کو عموماً ایسی تقریر و تحریر اور نئی روشنی والوں کے ساتھ افادہ یا استفادہ کی نیت سے ملنے سے قطعاً روکا جائے کچھ اپنا رنگ چڑھانے کے بجائے خود ان کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں البتہ تبلیغ احکام اور مخالفین کے مضامین کو تحریراً و تقریراً رد کرنے کے لئے ایسے منتہی طلبہ کو منتخب کیا جائے جن کے ظاہر

و باطن میں کچھ تو دین کی طرف خاص میلان موجود ہو اور پھر ان کو حضرات اہل اللہ کی خدمت میں رکھا جائے جس سے ان کا اخلاص راسخ اور ان کے اخلاق کی درستی ہو، یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ عرفی صوفی ہو جائیں اور ضربیں لگانے لگیں بلکہ ان کی صحبت سے انشاء اللہ اخلاص کا کچھ حصہ ضرور مل جائیگا حسب استعداد جب کافی مدت تک ان کی خدمت سے مستفید ہو لیں تب ان کو تحریری و تقریری تبلیغ کے منصب پر مقرر کیا جائے، اس وقت ان کی تقریر و تحریر نئے پرانے کسی طرز کی بھی انشاء اللہ مفید ہی ہوگی مضر نہ ہوگی باقی جو لوگ اس کے آج کل کے مذاق کی تحریر و تقریر کے عادی ہو رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ خود کاتب و مقرر کی بڑائی کا کچھ اثر بے وقوفوں پر ہو جاتا ہے ورنہ اصلاح یا تبلیغ جو بتائی جاتی ہے اس کا اثر برائے نام ہی ہوتا ہے"

عام مدارس کے ساتھ کاش یہ چند سطریں خاص طور سے اکابر ندوہ کو اپنی جانب متوجہ کر سکیں، راقم احقر کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر کے وقت اگر علماً و تجربتہ نہیں تو کشفاً و الہاماً خصوصیت کے ساتھ ندوہ ہی پیش نظر تھا

مختصر نصاب

علوم دینیہ کے نصاب تعلیم و تدریس میں ایک اور بڑی اہم اصلاح و تجدید کی ضرورت یہ تھی کہ اس کے لئے کوئی ایسا مختصر سا نصاب تجویز کیا جائے جو بقدر ضرورت کافی بھی ہو اور اتنی مدت نہ صرف ہو کہ علوم معاش کی تحصیل کا عذر اس کی تحصیل سے لوگوں کو مانع ہو۔ حضرت جامع المجددین کی تجدیدی جامعیت نے اس ضرورت کا بھی پورا احساس فرمایا اور صرف نظری خاکہ پیش نہیں کیا بلکہ "تلخیصات عشر" کے نام سے مروجہ نصاب کا دیگر ضروری اضافوں مثلاً اخلاق

وفلسفہ جدیدہ وغیرہ کے ساتھ ہم ایسا عطر کھینچ دیا ہے کہ اس بحث کی گنجائش بھی نہیں رہی کہ کونسا علم و فن قدیم نصاب کا تقلیل مدت کی ضرورت سے سرے سے خارج کر دیا جاتے اور لوگوں کو یہ وسوسہ و اعتراض باقی رہے کہ فلاں چیز کے بالکلیہ نکل جانے سے فلاں خاص خامی رہ جائے گی۔

اس نصاب میں تمام چیزیں تجوید سے لے کر صرف و نحو، معانی و بلاغت، منطق و فلسفہ، عقائد و کلام، مناظرہ و ہیئت، تفسیر و حدیث، اصول فقہ، اخلاق و تصوف، سب ہی کا اتنا ضروری حصہ اور ایسا ملخص موجود ہے کہ ضروری ضروری مسائل سب کے آگئے ہیں اور حضرت کی مقررہ ہدایات کے مطابق ان کی تعلیم ہو تو انشاء اللہ العزیز ہر فن سے اتنی مناسبت حاصل ہو جائے گی کہ پھر جس میں چاہے آگے تکمیل کر سکتا ہے یا ذاتی مطالعہ سے استعداد بڑھا سکتا ہے یہ پورا نصاب کم و بیش تین سال کی مدت میں پورا ہو جاتا ہے۔

یہی نہیں کہ اس کی بدولت اس قلیل مدت میں سارے علوم دینیہ عربیہ سے فی الجملہ واقفیت و مناسبت پیدا ہو سکتی ہے اور ساتھ ہی دینی تربیت کا بھی ان تین سالوں میں اگر پورا اہتمام رکھا جائے تو پھر علوم معاش یا دنیوی علوم میں مشغول ہونے سے بھی انشاء اللہ ایمان و عمل ایسا برباد نہ ہوگا۔ کہ اسلام کے نام کے سوا اس کا کام کوئی نہ رہ جائے بلکہ خود ان دنیوی و معاشی علوم کی فہم و قابلیت اور ان میں سرعت ترقی کے لئے ذہن میں ایک مضبوط و مستحکم بنیاد قائم ہو جائے گی اس پر بھی امراء و غرباء اگر سب ہی معاش و معاد دونوں کے جامع منافع کے لئے اس کو لبیک نہ کہیں تو ع

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل

ذیل میں اس تجویز و تجدید کے مقصد و مطلب کو مختصراً خود حضرت مجدد کی زبان

سے بھی سن لینا چاہئے جو اسی تلخیصات عشر کی تمہید سے ماخوذ ہے سب سے پہلے اس پر تنبیہ فرمایا گیا ہے کہ یہ نصاب کوئی ایسی جدت طرازی نہیں جو قدامت پسند حضرات کے لئے موجب وحشت ہو۔

" بلکہ نصاب قدیم کی دینیات مقصودہ یعنی تفسیر و حدیث و فقہ و کلام و فرائض کی ضروری کتابوں کی تحصیل کو زوائد پر مقدم کر دیا گیا ہے اور چونکہ یہ علوم بعض فنونِ آلیہ صرف و نحو و معقول و اصول پر موقوف ہیں لہٰذا ان سے پہلے پہلے یہ رکھ دیئے گئے ہیں اس لئے یہ نصاب قدیم ہی کا ایک جزو ہے "

اس کے بعد اسی تجویز کا اصل مقصد ملاحظہ ہو جس کی دو غرضیں بیان فرمائی گئی ہیں۔

" اول جن لوگوں کو تحصیل معاش کی ضرورت یا کسی اور وجہ سے مہلت کم ہے اور ساتھ ہی علوم دینیہ میں فاضلانہ استعداد حاصل کرنے کی رغبت اور شوق ہے مگر متعارف درسیات کی تطویل دیکھ کر ہمت پست ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ ترکِ محض ہوتا ہے ان کی تنگی رفع ہو جائے گی۔ دوسرے جو لوگ علوم دینیہ کے لئے فارغ بھی ہیں ان کو بھی اتفاقاتِ زمانہ سے کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کا وقت نہیں ملتا اور درمیان ہی سے چھوڑ دینا پڑتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس قدر وقت ملا تھا وہ علوم آلیہ میں صرف ہو گیا اور اصل مقصود سے محروم ہی رہے اس جدید نصاب یا طریق سے اس محرومی کا بھی تدارک ہو جاتا ہے "

لہٰذا اس مصلحت کے پیش نظر عام اور رائج الوقت طویل نصاب پر ہر حال میں اس مختصر نصاب کو مقدم رکھنا انسب ہے، اس کے پورا کرنے کے بعد :۔

اگر وقت مساعد ہو تو بقیہ درسیات کو پورا کر لیا جا سکتا ہے نیز چونکہ اس شخص کی استعداد میں ایک گونہ قوت زیادہ ہو گی اس لئے بقیہ درسیات پر سرعت و بصیرت سے عبور کر سکیگا اور اگر وقت نہ ملا تو اصل مقصود تو حاصل ہی ہو چکا اگر توجہ کرے گا تو چونکہ مطالعہ کا ملکہ پیدا ہو چکا ہے کتب بینی سے اپنی استعداد و تبحر کو جہاں تک چاہے ترقی دے سکتا ہے"

ایسی صورت میں چاہیئے تو یہ تھا کہ دیوبند، سہارنپور، نظامیہ (فرنگی محل) ندوہ وغیرہ سب ہی بڑی بڑی درسگاہیں اپنے ہاں بطور ایک شاخ بلکہ بطور ایک جز اور بنیاد اس کا التزام لازماً کرتیں تاکہ ایک طرف طالبانِ دنیا پر طلب دین کی حجت قائم ہوتی اور دوسری طرف خود ان درسگاہوں کے فیض و افادہ میں وسعت ہوتی اور جو لوگ تین چار سال سے آگے کی ہمت و فراغت رکھ کر پوری تکمیل کرنا چاہتے ان کے لئے یہ شاخ اسی طرح جز کا کام دیتی جس طرح دنیوی تعلیم کا میٹریکولیشن معمولی نوکریوں وغیرہ سے زیادہ حوصلہ رکھنے والوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کی بنیاد کا بھی کام دیتا ہے۔ بلکہ اگر اس طرز کے سہ سالہ مدارس مستقلاً جا بجا ملک میں کثرت سے قائم ہو سکیں اور دنیوی یا معاشی مدارس میں جانے والے مسلمان بچے پہلے اس کی تکمیل کر لیا کریں تو انشاء اللہ ایک ہی نسل میں اس "یک کرشمہ دو کار" کے دینی و دنیوی منافع کا مشاہدہ ہو جائے گا۔ ان سہ سالہ بنیادی مدرسوں میں دینی تعلیم کے ساتھ دینی تربیت کا بھی اہتمام لازم ہو تو ان کے طلبہ دین و دنیا جدھر بھی جائیں گے خدا سے امید ہے کہ وہی آگے ہوں گے

کاش ہمارے پاکستانی علماء اور دین دوست حضرات حکومت پاکستان کو اس طرف متوجہ فرما سکتے تو ایک ہی نسل میں پاکستان تمام ناپاکیوں سے پاک ہو کر واقعی پاکستان بن جاتا۔ ذہنی و قلبی انقلاب کا بڑا دارومدار تعلیم و تربیت

ہی پر ہے اگر مسلمانوں کو مسلمان بنانے کا کوئی انقلاب پیدا کرنا ہے تو اس کا راستہ پاکستان و ہندوستان بلکہ ساری دنیا تے اسلام کے لئے اس کے سوا نہیں کہ ان کی تعلیم و تربیت کی اساس اسلام ہو، یہ بنیاد اگر کج ہے تو پھر تا ثریا می رود دیوار کج کے نتیجہ کو کوئی سیاسی و انتظامی طاقت نہیں روک سکتی۔

لیکن اس محرومی کا کیا علاج کہ ساری دنیا کے مسلمانوں ہی کے سر پر مغربیت یا فرنگیت کا جادو ایسا سوار ہے کہ اسلام کا نام لے کر بھی ان کی سمجھ میں کام غیروں ہی کا آتا ہے۔

تجربہ یہ ہے کہ خود اہل دین اور دینی مدارس کے اکابر تک کا دل و دماغ اس درجہ مسحور ہو رہا ہے کہ دین کی سیدھی بات سمجھنا اور سیدھی راہ پر چلنا ان پر شاق ہو رہا ہے، اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا وَّاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ط (اعاذنا اللہ منہ)

بہر حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کی ایک صورت اور حضرت جامع المجددین کی زندہ کرامت ہے کہ حضرت ہی کے ایک مستعد جوان صالح خادم اور مجاز بعیت (مولانا ابرار الحق سلمہ اللہ تعالیٰ) نے اللہ کا نام لے کر اس راہ میں قدم اٹھایا ہے اور اپنے وطن ہردوئی میں اشرف المدارس کے نام سے رہنمائی کا نشان کھڑا کر دیا ہے جس کا اصل مقصود حضرت مجدد وقت کی اس مذکورۂ بالا مجددانہ تعلیمی تجویز کی تکمیل ہے بڑی بات یہ ہے کہ تربیت کی طرف تعلیم سے کم نہیں زیادہ توجہ ہے یہ سنی سنائی نہیں بلکہ ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی بناء پر عرض کیا جا رہا ہے اور خود اپنے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کے باب میں بڑی بڑی نامی گرامی جگہوں سے ٹھوکریں کھا کر اور مایوس ہو کر بالآخر حضرت جامع المجددین کی اس زندہ کرامت کے دامن میں پناہ ملی[1]، ورنہ ایک بڑے خاندانی مشائخ زادہ اور خود دین دار صاحب علم و فضل

---

[1] مگر اہل ثروت کی بے توجہی اور مدرسہ کا خود اپنا مکان وغیرہ نہ ہونے سے قریبًا سارے مصارف کا [بقیہ حاشیہ]

نے تو اس سلسلہ میں ایک مخدوم بزرگ کی مثال پیش کر کے یہاں تک تحریر فرما دیا تھا کہ فلاں صاحبِ دین و دولت بزرگ باوصف غایت دینداری اپنی اولاد کو کالج ہی میں تعلیم دلا رہے ہیں۔ اور متوسط و غریب طبقہ کے لئے اس سے چارہ نہیں کہ موجودہ تعلیم کو اختیار کرے یا اولاد کو نرا جاہل رکھ کر کارخانوں کا مزدور بننے پر مجبور کرے جہاں بے علمی کے ساتھ بے اخلاقی و بداخلاقی کا بھی شکار ہوں باقی ایمان اور اعمال صالحہ کے لئے دعا کریں۔" اِنّا للہ۔ ایمان اور اعمال صالحہ کے لئے صرف دعا۔

مگر یہ نادان اس فتوے پر کیسے عمل کرتا جب کہ اس کے مشاہدہ و تجربہ میں خود ابناء کے لئے بھی خالی دنیا کے علم سے نرا جہل بہتر اور دین کے حق میں کمتر ضرر رساں ہے کیونکہ اس جہل میں کچھ بُرا بھلا ایمان و اعتقاد تو سلامت رہ جاتا ہے اور اس اعتبار سے کارخانہ کا مزدور بن جانا کونسل کے ممبر بن جانے سے بدرجہا اچھا ہے خود حضرت مجدد کے افادات اس بارے میں آگے تعلیم انگریزی کی تحقیق میں آتے ہیں

ہماری عام عربی و دینی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی بڑی کمزوری و غفلت یہی ہے کہ تعلیم کے ساتھ تربیت و عمل کا بہت کم اہتمام و التزام فرمایا جاتا ہے بلکہ گویا طالب علمانہ زندگی کو عملی آزادی کا پروانہ (لائسنس) خیال کیا جاتا ہے یہ تصور بھی فرنگی طالب علمی کی برکات میں ہے۔ اور اگر کوئی اس پر معترض ہو تو غلطی کو غلطی کے لئے حجت بنایا جاتا ہے کہ "آپ بھی اپنی طالب علمی کو یاد کریں۔ حالانکہ موٹی بات ہے کہ تربیت کی بنیاد کو پختہ کرنے کا زمانہ تو طالب علمی کے سن سے بھی پہلے شروع ہو جاتا ہے تو عین علم دین کی تحصیل کے زمانہ میں عملِ دین سے غفلت و مسامحت کیسے روا ہو سکتی ہے

(بقیہ از صفحہ سابقہ حاشیہ) بار طلباء ہی پر پڑ رہا ہے جس کو معمولی کیا متوسط درجہ کے سرپرست بھی برداشت نہیں کر سکتے جس کی وجہ سے نفع محدود ترقی مسدود اور بقاء خطرہ میں ہے۔

خود حضرت علیہ الرحمۃ نے تو بے عمل طالب علموں کو سند فراغ وتکمیل دے دینا موجب مؤاخذہ قرار دیا ہے تلخیصات عشر کی تمہید میں اس مختصر نصاب کی تحصیل کا جو دستور العمل تحریر فرمایا ہے اس کا آخری نمبر (۱۰) بھی یہی ہے کہ جو کچھ پڑھے اس پر پورا عمل کرتا رہے۔

دینی نصاب وتعلیم کی مقدار ومدت میں اختصار وتقلیل کی اس مجددانہ تجویز کی جو اہمیت وحاجت حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی نگاہ میں ہے اس کا مزید اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض چیزوں کو حذف فرما کر یا ان کا بدل تجویز فرما کر ارشاد ہے کہ:۔

اگر کوئی شخص کسی سبب سے اور زیادہ اختصار کا طالب ہو تو ایسے شخص کے لئے یقیناً تین سال میں سے اور چھ ماہ گھٹ جاویں گے،،

پھر آگے ارشاد ہے کہ:۔

اگر کوئی شخص صرف اپنی اصلاح ونجات آخرت کے لئے کتب دینیہ کو عربی زبان میں پڑھنا چاہے تحقیق وتدقیق کی ضرورت نہ سمجھے یا علوم عقلیہ سے دلچسپی نہ ہو اس کے لئے اس درس کا اور بھی اختصار ہو سکتا ہے یعنی صرف ونحو کی کتب مندرجہ کے بعد قدوری کامل اور سراجی اور متن معانی اور تجوید اور تلخیص البدایہ اور متن عقائد نسفیہ اور تفسیر یا مشکوٰۃ اور جلالین کافی ہے،،

جن کی عمر زیادہ ہو چکی اور مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم کی نہ رہی ہو اور عربی ہی کے ذریعہ سے علوم دینیہ کے حصول کا شوق ہو جس میں وقت بھی زیادہ صرف نہ ہو اور قابلیت بقدر ضرورت پیدا ہو جائے اس کے لئے بھی ایک بے حد مختصر ومناسب نصاب تجویز فرمایا ہے کہ

اول ایک کتاب ادب کی پڑھاوے خواہ مفید الطالبین ہی ہو

مگر اس میں صرف و نحو کے قواعد کو بھی ساتھ ساتھ جاری کرتا جائے اور ایسے قواعد کچھ زیادہ نہیں پندرہ بیس ہوں گے جس سے صرف اتنا معلوم ہو جائے کہ اس کلمہ پر زیر زبر کیوں ہے اس کے بعد قرآن شریف کا ترجمہ اسی طرح ہو کہ اس میں بھی قواعد جاری کرائیں اور ایک کتاب حدیث شریف کی پڑھا دی جائے مثلاً مشارق الانوار کہ بہت بڑی بھی نہیں اور ایک کتاب فقہ جیسے قدوری اس کے بعد یا ساتھ دو تین کتابیں صرف و نحو کی بھی پڑھا دی جائیں اس سے مناسبت پیدا ہو کر ضروری کتابوں کا مطالعہ بہت سہل ہو جائے گا۔

ادارہ تعلیمات اسلام (لکھنؤ) نے مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے زیر نگرانی وہدایت قریب قریب یہی نصاب و طریق اختیار کر رکھا ہے بلکہ اس میں ابتداء ہی کلام مجید سے ہوتی ہے اور قواعد کے ساتھ ساتھ اجراء کے علاوہ مستقل نحو و صرف کی کسی کتاب کی بھی تجربہ سے ضرورت ثابت نہیں ہوئی اور الحمدللہ کامیابی ہوئی لیکن افسوس کہ یہ تعلیمی ادارہ ہے تربیت کا کوئی اہتمام و انتظام نہیں نہ مدرسہ کی شکل ہے نہ کوئی دارالاقامہ، اس لئے افادہ بہت محدود اور تعلیم بالغان کے ایک مختصر ادارہ کی شکل ہے

لیکن نفس اپنی اصلاح و نجات آخرت کے لئے چونکہ عربی زبان میں بھی پڑھنا لازم نہیں۔ اس لئے مزید ارشاد ہے کہ

جو عربی زبان کی قید بھی ضروری نہ سمجھے اس کے لئے صرف بہشتی زیور کے پانچ حصے اور مفتاح الجنہ اور صفائی معاملات اور تعلیم الدین اور فروع الایمان اور جزاء الاعمال اور اصلاح الرسوم اور قیامت نامہ اردو شاہ رفیع الدین اور حقوق الاسلام اور

سراج السالکین اور تواریخ حبیب اللہ اور مآل تہذیب کے سب حصے
اور عورتوں کے لئے بلکہ کم فرصت مردوں کے لئے بھی بہشتی زیور
کے سب حصے پڑھ لینا اور ضرورت کے وقت علماء سے رجوع کرتے
رہنا کافی ہے۔

بہر نوع دینی تعلیم اختصارِ نصاب و تقلیل مدت کی یہ اصلاح و تجدید اتنی ضروری
ہے کہ حضرت علیہ الرحمۃ کے نزدیک سارے عربی مدارس اور ان کے سارے طلبہ کیلئے
اس کی تقدیم مناسب ہے حتی کہ اگر

کسی وجہ سے سب کے لئے علی الاطلاق تقدیم نہ ہو تو اقل درجہ حضرات
علماء و اہل مدارس اسلامیہ دامت فیوضہم و برکاتہم اس قدر التزام کی
تکلیف گوارا فرمائیں کہ جن کی حالت اپنی تحقیق یا ان کے استفسار سے
اس تجویز کے مصالح مذکورۂ بالا کی بناء پر تقدیم کی مقتضی پادیں تو ان
کے لئے ایک جداگانہ جماعت قائم کردیں تو اس سے اہل حاجت
کی رعایت کا ثواب بھی ملیگا اور امید ہے کہ مدارس میں طلبہ بالخصوص
امیرزادوں کی ترقی ہو جائے اور کوئی طالب علم باوجود کمی وقت کے
محروم نہ رہے اور جو اہل وسعت اساتذہ کو مکان پر بٹھلا کر اس طرز
سے تعلیم دلانا چاہیں استاد کو یہ نقشہ دے کر اس کی پابندی کیلئے
فرمائش کردیں"

کاش امراء اور اہل وسعت میں دین کی اتنی حس ہو کہ وہ اس رعایت کو رعایت
سمجھیں اور دنیا کی ترقی کے ساتھ اپنی اور اپنی اولاد کی آخرت کی فلاح و نجات سے
اتنی بے فکری نہ ہو کہ گویا مرنے کے بعد کچھ ہونا ہی نہیں۔ اگر اس دنیا کی ۶۰/۷۰ سال
کی غیر یقینی زندگی کے لئے (اور اتنی غیر یقینی کہ یقین ایک پل کا بھی نہیں) ہم اپنی اولاد

کو ۲۵۔ ۳۰ سال تک مسلسل تعلیم میں جوتے رہتے ہیں تو کس منہ سے آخرت پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں جب کہ آخرت کی یقینی و ابدی زندگی کو سنوارنے والی تعلیم و تربیت کے لئے ڈھائی تین سال بلکہ ڈھائی تین ماہ دینے سے بھی گریز کریں

.....

مسئلہ معاش

ایک مخدوم بزرگ جو خود ماشاء اللہ عالم باعمل ہیں اور ایک معروف بزرگ و شیخ کی قائم کردہ خالص دینی درسگاہ میں ناظم ہیں اور اسی درسگاہ میں خود اپنے ایک بچے کو قرآن حفظ کرا رہے ہیں، باوجود اس کے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ

"یہ تو بتاؤ کہ آخر حافظ و عالم ہو کر کھائیں گے کیا"

اسی طرح ایک اور مخدوم و مخدوم زادہ بزرگ جن کا ہندوستان کے ایک ایسے مشہور و مسلم خاندان سے قریب ترین تعلق ہے جس کا فخر و امتیاز نسلہا نسل تک علوم دینیہ ہی کی طلب و خدمت رہا اور جو ابھی ایک ہی پشت پہلے کے ایک ایسے صاحب تقویٰ و توکل مشہور و مسلم شیخ وقت کے صاحب سجادہ ہیں جن کے یہاں فاقہ ہو جانا بھی کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی۔ ان مخدوم کے ایک صاحبزادے جب ایم اے ہو کر ملازمت اور اس کے لئے سعی و سفارش میں سرگردان و پریشان تھے تو ایک موقع پر احقر نے اپنے ان مخدوم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت نے آخر اپنے خاندان کے دینی علم و توکل کے راستہ سے اولاد کو ہٹا کر اس دنیوی تعلیم و تذلیل کو پسند کیوں فرمایا جواب وہی کہ دین اور علم دین کا پوچھنے والا اب کون ہے اور اس کو حاصل کر کے کھاتے کہاں سے؟ احقر نے عرض کیا کہ اس سے تو تجارت اور کاروبار کی کوئی راہ اہون و اسلم

ہوتی۔ اس کا جواب واقعی بڑا پر معنیٰ اور پر لطف عطا فرمایا کہ

میاں تجارت بڑی محنت و مشقت، ہوشیاری و بیداری کا کام ہے
ہم تو بس ملازمت ہی کے رہ گئے ہیں کہ سوتے جاگتے بُری بھلی طرح تیس
دن کے بعد کسی پر کچھ واجب ہو جائے "

اس میں شک نہیں کہ ملازمت کا یہ بہترین ترجمہ ہے، میمن، بوہرے وغیرہ نسلہا
نسل کی تجارت پیشہ مسلمان جماعتوں کا ذکر نہیں ورنہ عام مسلمانوں خصوصاً "آخوندزادوں"
کو دیکھا کہ نوکری تو وہ بُری بھلی طرح نباہ کر اور تیس دن کے بعد کسی پر کچھ واجب کر کے
وصول کر لیتے ہیں لیکن تجارت میں اکثروں کا دیوالہ ہی نکلتے دیکھا۔

غرض جب خود ایسے ایسے خاندانی مشائخ اور دیندار علمائے دین تک اپنی اولاد
کو تعلیم دین سے یہ ڈر کر دور رکھتے ہیں کہ علم دین کو حاصل کر کے کھائیں گے کہاں سے
تو پھر بادشاہ یا امراء کا ذکر ہی کیا جو خاندانی دنیادار اور دینی تعلیم و روایات سے یکسر محروم ہیں
ایسے دیندار اور دنیادار دونوں قسم کے مسلمانوں کی خدمت میں عرض ہے کہ
"کھائیں گے کہاں سے" یہ خوف وہی خشیت املاق (خوف افلاس) ہے جس کی
بنا پر جاہلیت کے مشرکین اپنی اولاد کو قتل تک کر ڈالتے تھے اتنا فرق ہے کہ وہ اس
خوف سے اپنی اولاد کی چند روزہ دنیوی زندگی کا خاتمہ کر دیتے تھے اور ہم ہمیشہ کی
اخروی زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔ آج بھی جاہلیت جدیدہ میں ضبط تولید کی (جو قتل
اولاد کی خفی شکل ہے) بڑی دلیل یہی بیان کی جاتی ہے کہ آبادی بڑھتی جاتی ہے
اتنے آدمی آخر کھائیں گے کہاں سے۔

اس کا حقیقی جواب نئے اور پرانے سب جاہلوں کو قرآن نے جو دیا ہے وہ
ایسے مسلمانوں کے لئے اور زیادہ حقیقی ہے جو خوف افلاس کی بناء پر اپنی اولاد کو
تعلیم دین سے محروم رکھ کر دنیا کی غیر یقینی زندگی کو بنانے سے زیادہ آخرت کی یقینی

زندگی بگاڑتے ہیں، جواب یہ ہے کہ تمہاری اولاد کو بھی وہی خدا رزق دے گا جس نے تم کو دے رکھا ہے (نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ) اگر ہم کسی درجہ میں مسلمان ہیں اور قرآن پر ہمارا کچھ بھی ایمان ہے تو خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کے خدا نے انسان کو کھانے کمانے کی فکر میں فنا ہو کر مرنے کے لئے پیدا نہیں فرمایا۔ ہمارا "زیستن برائے خوردن" نہیں بلکہ خوردن برائے زیستن ہے اور زندگی کا اصل مقصود عبدیت و بندگی کے فرائض کی ادائی ہے، صاف صاف دوٹوک ارشاد ہے کہ

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَا اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝

میں نے جن و انس کو محض عبدیت و بندگی کے لئے پیدا کیا ہے رزق کی فکر کے لئے نہیں پیدا کیا ہے اور نہ اس لئے کہ مجھ کو کھلائیں، رازق تو سب کا صرف اللہ ہی ہے، وہی رزق رسانی کی پختہ قوت رکھتا ہے۔

باقی اپنی بندگی و عبدیت کو بھلا کر رزاقیت کی تدبیر و قوت کے مدعی انسان کی درماندگی کا تماشہ جو مسلسل سالہا سال سے دیکھا دکھلایا جا رہا ہے تاریخ نے تو کب دیکھا ہو گا لیکن آج ہر آنکھ والے کی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ ایک طرف تو زیستن کا مطلب تمامتر خوردن قرار دے لیا گیا ہے اور حکومت و سیاست سب کا اصل مطلب و مقصود پکار پکار کر فخریہ روٹی کپڑا بتایا جاتا ہے دوسری طرف عالمگیر جنگ کے سلسلہ میں اور خصوصًا اس کے بعد ساری دنیا جس طرح عالمگیر قحط کے چنگل میں پھنسی ہے اس کے ازالہ کی ہر روز ہر حکومت کی جانب سے طرح طرح کی تدبیروں کا اعلان کیا جاتا ہے فراہمی غذا کی مستقل وزارتیں اور محکمے قائم ہیں ہر دن قومی و بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں ساری حکومتوں نے راشن بندی

کر رکھی ہے یعنی ناپ تول کر دو وقت کا بُرا بھلا غلہ حوالہ کر دیا جاتا ہے جو اکثر صورتوں
میں انسان کی معمولی مقدار غذا کا نصف سے زیادہ نہیں ہوتا ہے اس پر بھی وقتاً فوقتاً
تخفیف و تقلیل کی دھمکی اور اطلاع شائع ہوتی رہتی ہے کہ بس ایک مہینہ یا دو مہینہ
کا غلہ رہ گیا ہے اور آئندہ فلاں مہینہ بڑا نازک آنیوالا ہے امریکہ جو دنیا کا سب سے دولتمند
و خوشحال ملک ہے ابھی (۲۴ راکتوبر ۱۹۴۷ء کے) پانیر میں وہاں کے غذا و زراعت
کے ڈائریکٹر جنرل کا بیان چھپا ہے کہ

> اس موسم سرما میں ایسے شدید قحط سے دوچار ہونا ہے جو دنیا میں کبھی
> نہ پڑا ہو گا اور جس کا مقابلہ ہر طرح کی معاشی تدابیر اور قومی و بین الاقوامی
> اجتماعی جدوجہد ہی سے ممکن ہو گا۔"

انسان نے جس طرح اپنے خالق سے منہ موڑا ہے اس کی سمجھ میں تو آنا اب مشکل ہے
لیکن راقم ہذا کو یہ روز افزوں و عالمگیر قحط نہیں بلکہ عالمگیر قہر ہی نظر آرہا ہے اور قرآن
مجید میں جابجا جو رزق و رزاقیت کا ذمہ بالکلیہ حق تعالیٰ اپنے خود لے کر، نہ صرف یہ کہ
انسان کو عبدیت و بندگی کے لئے فارغ و بے فکر فرمانا چاہا ہے بلکہ غور کیجئے تو اس
دنیا میں اس کی سب سے جامع الصفات صفت ربوبیت کا سب سے بڑا اور نمایاں
مظہر رزاقیت ہی ہے اور انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر بالکلیہ اپنے کو اس کا
ذمہ دار ٹھہرا کر نہ صرف اللہ تعالیٰ کی اس صفت خاصہ میں اپنے کو شریک و سہیم
ٹھہرا رہا ہے بلکہ دراصل خدا کی خدائی چھین کر خود خدا بن بیٹھا ہے اس کے بعد
اگر اس کا قہر و عذاب اسی قبض رزق کی راہ سے ظاہر ہو تو عین سنۃ اللہ ہے۔

اپنا تجربہ تو یہ اپنے عزیزوں دوستوں کے انفرادی واقعات تک میں یہی
ہے اور جو بھی غور کریگا اس کو بھی تجربہ ہو گا کہ معاش و رزق کا معاملہ کچھ مِنْ
حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ہی ظاہر ہوتا ہے اور تدبیر کے تیر بالعموم اپنے نشانہ

سے ہٹ کر ہی گرتے ہیں بارہا دیکھا کہ انگریزی تعلیم میں بھی طالب علمی میں جن کو بڑا ہونہار خیال کیا جاتا تھا وہ کچھ نہ ہوئے اور جن کو انہوں سمجھا گیا وہ ان ہونہاروں سے میدان معاش میں کہیں آگے نکل گئے، یہی تجارت وغیرہ ہر چیز میں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بارہا جس شخص اور جس چیز کی تجارت کے چلنے کے ظاہری اسباب زیادہ ہوتے ہیں وہ رہ جاتی ہے اور جس کے ظاہری امکانات کم ہوتے ہیں وہ چل جاتی ہے باقی یوں نکات بعد الوقوع تو ہر واقعہ میں نکال ہی لئے جاتے ہیں

بڑی ایمانی خامی

الغرض کوئی اور سمجھے نہ سمجھے مگر مسلمان کو اس کے سوا سمجھنے کا کیا حق ہے کہ رزق یا معاش کی تنگی و فراخی، قبض و بسط، عطا و منع بالکلیہ ان کے رب کی ربوبیت و مشیت پر منحصر ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ

اَوَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۔ وغیرہ آیات کثیرہ نے اس باب میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ رزق کے ظاہری اسباب بس ظاہری سے زیادہ نہیں اس لئے غیروں کی طرح ان میں اتنا غلو و فنا کہ گویا اسباب و تدابیر ہی حقیقی رزاق ہیں نہ اسلام ہے نہ اسلام کے خدا پر ایمان اور نہ حقیقی اسلام اور نہ حقیقی مسلمانوں کی تاریخ و زندگی سے اس کی شہادت ملتی ہے یہ تو دراصل زبان سے خدا کا اقرار اور عمل سے اپنی خدائی کا اعلان ہے اس قسم کے تصورات کو جب تک دماغ سے بدر نہ کر دیا جاتے اس وقت تک اسلام کی دینی و دنیوی برکات اور انفرادی و اجتماعی ثمرات کی توقع کا حق ہی کیا حاصل ہے۔

بڑی خودفریبی

یہ تو اس سوال کی کہ عربی یا دینی تعلیم حاصل کرکے کھائیں گے کیا۔ بڑی خطرناک ایمانی و اعتقادی خامی تھی۔

ایک دوسری بڑی خودفریبی اور مغالطہ یہ ہے کہ کھانے سے مراد ضروریاتِ زندگی سے زیادہ فضولیاتِ زندگی ہوتی ہیں یعنی ہم نے کھانے پہننے، رہنے سہنے شادی بیاہ، مکان اور سامانِ زندگی کے تمام جاری و وقتی مصارف کا ایک خود ساختہ معیار مقرر کر رکھا ہے جب تک وہ پورا نہ ہو اس وقت تک ہم سمجھتے اور کہتے ہیں کہ کھانے ہی کو نہیں مل رہا ہے حد یہ کہ امراء تک سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر آپ کو اس کی کیا حاجت ہے کہ دینی تعلیم سے محروم رکھ کر اولاد کو ججی و کلکٹری کے لئے دنیاوی تعلیم دلاتے ہیں تو جواب یہی ملتا ہے کہ اگر ہماری آمدنی زیادہ ہے تو ہماری حیثیت و مصارف بھی تو ویسے ہی ہیں یعنی اس حیثیتِ جاہ و مال کو موجودہ آمدنی میں اضافہ اور جاہی مناصب حاصل کئے بغیر کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے یہ ایسی منطق ہے کہ جاہ و مال کے کسی اونچے سے اونچے مقام پر پہنچ کر بھی لاجواب نہیں ہو سکتی۔

ورنہ ابھی عالمگیر حب جاہ و مال کی اس عالمگیر جنگ سے پہلے اسی ہندوستان میں زندگی کی نفس ضروریات پانچ سات روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھیں یعنی چھوٹے بڑے چار پانچ آدمیوں کے گھر کے لئے پچیس تیس روپیہ ماہوار نفس ضروریات کی حد تک بلا کسی تکلیف و تنگی کے کافی ہوتے تھے اور بہتیرے مولوی بلکہ اچھے اچھے علماء اس سے بھی کم میں گذر فرماتے تھے۔ خود حضرت علیہ الرحمۃ کی تنخواہ کانپور میں پچیس روپیہ ماہوار تھی جو حضرت کے علم و فضل کے لحاظ سے کیا تھی، پھر بھی حضرت نے اس کو بہت بڑی تنخواہ سمجھا تھا اور

فرماتے کہ:-

میں طالب علمی میں سوچا کرتا تھا تو زیادہ سے زیادہ دس روپیہ ماہوار کی مدرسی اپنی ضروریاتِ معاشی کے لئے کافی سمجھتا تھا (اس میں بھی) پانچ روپیہ اپنے خرچ کے لئے اور پانچ گھر کے خرچ کے لئے اس سے زیادہ کی تنخواہ پر کبھی نظر ہی نہ جاتی نہ اس سے زیادہ کا اپنے کو مستحق سمجھتا تھا۔ (اشرف السوانح حصہ اول ص۳۷)

آپ بیتی

خود راقم ہٰذا کو اپنے گھر کا تجربہ ہے کہ حضرت والد مرحوم دیہاتی اور وہ بھی نہایت قانع ومتوکل طبیعت کے طبیب تھے خرچ اوسطاً ۷، ۸ آدمیوں کا اندر باہر دو ایک نوکر چاکر بھی، کھانے پینے رہنے سہنے، شادی بیاہ سب کا معیار اوسط درجہ کے شرفاء اور اہل برادری کا۔ مگر آمدنی کا اوسط شاید ہی کبھی ۳۰/۴۰ روپیہ سے بڑھتا ہو، نہ آمدنی میں ترقی کی کبھی فکر فرمائی۔ البتہ اللہ اور اللہ والوں سے تعلق میں ترقی کی فکر آخر دم تک رہی۔ حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت واجازت کے باوجود ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے آخر تک برابر اصلاح واستفادہ کا تعلق جاری رہا۔ زیادہ عبرت وسبق کی بات یہ کہ گھر بھر میں چھوٹے بڑے سب کو قلب کی جو راحت وطمانیت یا دل کا جو سکھ چین نصیب تھا وہ اس نالائق نام لیوا اور اس کے متعلقین کو سینکڑوں ہزاروں کی آمدنی اور کوٹھی وموٹر میں بھی میسر نہ ہوا۔ ہاں گھر بھر میں والد علیہ الرحمۃ کے اس رنگ وبرکت کا وارث والدہ صاحبہ مدظلہا کا دم رہ گیا ہے (رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ

صَغِیرًا) برکت کی حقیقت بھی ان اللہ والے والدین ہی کی زندگی و آمدنی کو دیکھ کر سمجھ میں آئی۔

باقی اپنی سینکڑوں ہزاروں کی آمدنی، کوٹھی، موٹر، نوکر چاکر، سب کے چوتھائی صدی کے تجربات کی میزان اپنے ایک حکیم اور حکیم طبع استاد (مولانا شیر علی صاحب مرحوم) کے ایک بڑے ہی حکیمانہ فقرہ کے سوا کچھ نہ نکلی۔ مولانا ندوہ میں جب کہ راقم الحروف آخری جماعت میں تھا صدر مدرس و مہتمم تھے پھر جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ دینیات میں علم کلام کے استاد مقرر ہو گئے تھے مشاہرہ چھ سو ماہوار تھا ابھی تک موٹروں کے بجائے گھوڑا گاڑی کا چلن وہاں زیادہ تھا اکثر عہدہ دار خود اپنا گھوڑا گاڑی رکھتے تھے مولانا کے پاس بھی تھی جس پر یونیورسٹی تشریف لاتے تھے کچھ دن بعد دیکھا کہ کرایہ کی گاڑی پر تشریف لانے لگے عرض کیا کہ حضرت گھر کی گاڑی کیا ہوئی؟ فرمایا نکال دیا، دو گھنٹے اس پہ میں سوار ہوتا تھا اور چوبیس گھنٹے وہ میرے اوپر سوار رہتی تھی۔

اُس وقت تو یہ حکیمانہ بات میری سمجھ میں نہ آئی اور مولانا کی پیرانہ سالی اور کم ہمتی کا تقاضا معلوم ہوئی، لیکن اس کے بعد خود گھوڑا گاڑی رکھی اور موٹر بھی رکھا، سو روپیہ ماہوار تک کی کوٹھی، بنگلہ کا مزا بھی چکھا، لکھنؤ میں ایکڑ بھر زمین میں خود اپنی دو منزلہ لمبی چوڑی کوٹھی بنوائی لان اور پھلواری، نوکر چاکر، سامان اور فرنیچر سب ہی کا ٹھاٹھ اپنی حیثیت و حوصلہ سے بڑھ کر دیکھا دکھلایا مگر خدا کو گواہ کر کے گواہی دیتا ہوں کہ جیسا جیسا حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی جوتیوں کے تعلق سے کچھ عقل ٹھکانے ہونے لگی، ویسا ہی ویسا اس سارے فخر و نمائش کے ساز و سامان کو راحت و آسائش سے زیادہ خود اپنے دل و دماغ پر سوار پانے لگا اور بالآخر کچھ عرصہ بعد حیدر آباد ہی میں جب ایک محب[1] و محسن کی ہمت و احسان سے جامعہ کے قریب ایک نو تعمیر مسجد

---

[1] ڈاکٹر محمد عثمان صاحب رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ جو اپنی ذات صفات سے سراپا کرم و احسان ہیں۔

سکے احاطہ میں خاص اس راقم احقر کے لئے دو حجرے تیار ہو کر ان میں قیام نصیب ہوا تو بلا مبالغہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل و دماغ قید کی کوئی بڑی سزا جھیل کر باہر آگیا ہے اور آج بھی لکھنؤ کی ذاتی طویل و عریض کوٹھی میں بیٹھ کر حیدر آباد کی کوئی چیز یاد آجاتی ہے تو شہر و شہریت سے دور مسجد اقصٰی[1] کے یہی دو حجرے اور اسی زاویہ کے دو چار انے گنے عنایت فرما۔ لکھنؤ کی اپنی کوٹھی کا معاملہ بھی دارم چرا نپوشم کا ہو رہا ہے ورنہ اب کوٹھی کے بجائے کوٹھری ہی کو دل ڈھونڈھتا ہے یہ تو آپ بیتی تھی، جگ بیتی بھی جو کچھ وطن و دکن ہر جگہ دیکھی اور سنی، وہ یہی کہ بڑے بڑے عہدہ دار اور بلند مناصب وزراء و امراء بظاہر جاہ و مال سب کچھ رکھ کر بھی سب کے سینہ کے اندر ہل من مزید کے مقابلہ و مسابقت کی بھٹی دہکتی رہتی ہے اور بالعموم اسی کے انگاروں میں لوٹتے لوٹتے دم نکل جاتا ہے

گویا خدا سے کوئی واسطہ نہیں

یہ اپنی پراتی بظاہر طویل داستان اپنے مقصد و مفاد کے اعتبار سے طویل نہیں قصیر ہی ہے اس لئے کہ دنیا کی جس طلب میں دین و آخرت کا ہوش نہ رہے، جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ جائے، دوزخ و جنت کا خوف و شوق دل سے نکل جائے خدا کی رضا و ناراضی کا غم نہ ہو تو یہ تو (معاذ اللہ) مومن و ایمان کے منافی کافر و کفر کی دنیا کے سوا

---

[1] یہ مسجد شہر کے بالکل کنارے اور دور (جو لفظ اقصٰی کے معنی ہیں) واقع ہے جہاں اب جامعہ کی بدولت کچھ آبادی ہو چلی ہے مولانا گیلانی احقر کے سالہا سال کے رفیق قیام و طعام بھی اسی مسجد کی جوار میں تشریف فرما تھے اور اس مسجد کا "مسجد اقصٰی" نام تو ایک دوست نے تجویز کیا تھا مگر اس کا تاریخی نام ثابت ہونا مولانا ہی کی یادگار ہے۔

کیا ہے اور یہ دنیا کی طلب نہیں، دنیا کا عشق بلکہ جنون ہے بقول حضرت علیہ الرحمۃ کے کسب دنیا یا دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں مگر یہ نہ ہو کہ اس میں بالکل کھپ جائے کہ گویا خدا تعالیٰ سے بالکل واسطہ ہی نہیں یہ تو کافر ہی کی زندگی کی خاص شان ہے کہ گویا خدا سے کوئی واسطہ نہیں۔

مومن کی شان

اور مومن کی زندگی کی خاص شان یہ ہے کہ وہ اس دنیا سے بس مسافر اور سرائے کا سا تعلق رکھتا ہے باقی فکر و عمل جد و جہد کا اصل تعلق خدا و آخرت سے ہوتا ہے اور جو دنیا میں جو ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہو جائے وہ بھی ہو جائے "یہ حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ :۔

پورا خلل دماغ

ایسا ہی ہے جیسے کوئی سرائے میں یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ فانوس سب لگا دیئے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا بھی دے تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے خاص کر جب یہ حکم ہو، مثلاً اس سرائے میں چار دن سے زیادہ کوئی قیام نہ کر سکے گا۔ اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی تزئین میں لگانا پورا خلل دماغ ہے اور دنیا ایسی ہی محدود قیام کی سرائے ہے کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا تو اول تو سرائے میں قیام اگر اختیاری بھی ہو تب بھی یہی ہونا چاہئے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے۔ اور جب اختیاری بھی نہیں تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہئے۔

اَلدُّنیا سِجنُ المُؤمِنِ

اور یہی معنی ہیں میرے نزدیک الدنیا سجن المؤمن کے۔ لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنی لئے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ جیل خانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا بلکہ اس لئے کہ جیل خانہ میں جی کبھی نہیں لگا کرتا خواہ کیسا ہی عیش ہو، تو مسلمان کی شان ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو، کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے اور دنیا گھر نہیں۔ پھر جب جی نہ لگے گا تو کیوں ہوسیں ہوں گی اور کیوں سوچیگا کہ یوں ہو اور یہ ہو اور وہ ہو، بلکہ اب یوں سوچیگا کہ دنیا تو پردیس ہے یہاں جس طرح بھی گذر جائے اور دنیا کی بجائے آخرت کی سوچ ہونی چاہیئے۔ اور یہ سوچیگا کہ اگر یہ سامان ہوگیا تو پھر وہاں یوں بہار ہوگی یوں عیش ہوگا ورنہ یوں پریشانی ہوگی، یوں مصیبت ہوگی۔

لیکن ہماری زندگی ہمارے برتاؤ اور معاملات سے (الا ما شاء اللہ) بس ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ

جیسے کوئی منکر آخرت ہو

کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے آخرت کی نہیں نہ اس کا اتنا شوق ہے چنانچہ دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں کہ یوں رہیں گے یوں کریں گے جائداد ہوگی ملازم ہونگے ڈپٹی کلکٹر ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

اب انصاف سے دیکھو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگیں ہوتی ہیں کہ مرجائیں گے تو خدا کے سامنے جائیں گے یوں جنت ہوگی

اس میں باغات ہوں گے مکانات ہوں گے حوریں ہوں گی، غالباً کبھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں بلکہ خیال بھی بہت کم آتا ہے۔

بعض ایسے ہیں کہ جن کے پاس دنیا کی خوشی کا کوئی سامان نہیں اور وہ یوں کہیں گے کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیاں نہیں مناتے بلکہ ہم تو سوچا کرتے ہیں کہ کوئی والی وارث نہیں زندگی کیسے کٹے گی تو ان سے یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیاوی زندگی کو سوچا کبھی آخرت کو بھی سوچا اور وہاں کی مصیبت کا بھی خیال کیا کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی دوزخ میں جانا پڑا تو وہ مصیبت کیسے سہی جائے گی پھر جیسے یہاں تکلیف کو سوچ کر تدبیر کو سوچتے ہو کہ شاید فلاں تدبیر سے یہ تکلیف کٹ جائے یا فلاں تدبیر سے مشکل آسان ہو جائے ایسے کبھی آخرت کی مصیبت کے لئے بھی سوچا

آخرت کی کوئی مصیبت لاعلاج نہیں

حالانکہ دنیا کے مصائب بعض ایسے ہیں جن کی کوئی تدبیر ہی نہیں اور اس لئے اس کو سوچنا ہی عبث ہے مگر پھر سوچتے ہو، اور آخرت کی کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں جو لاعلاج ہو، بلکہ ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے لیکن پھر اس کا ذکر نہ فکر" (الرفیق ص ۳۳/۳۴)

خدا و آخرت سے بے تعلقی و بے فکری کا یہ حال صرف عام دنیاداروں ہی کا نہیں بلکہ جو لوگ اپنے کو دیندار سمجھتے اور سمجھے جاتے ہیں ان کا حال بھی اس معاملہ میں کچھ بہتر نہیں، ارشاد ہے کہ:-

"دنیادار تو الگ رہے، دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق نہ امنگیں پیدا ہوتی ہیں نہ اندیشے، حالانکہ خداتعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ زندگی

پھر جو لوگ علم بھی دنیا کا نہیں دین ہی کا حاصل کرتے ہیں ان کو بھی اگر دین و آخرت کی امنگوں اور اندیشوں کے بجائے اس کی فکر دامن گیر رہے کہ کھائیں گے کہاں سے تو یہ کیسے ظلم و حسرت کی بات ہے ان کی زندگی تو امت کے لئے مثال و اسوہ ہونی چاہیئے اور ان کا اسوۂ حسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہونی چاہیئے کہ حضورؐ کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے کیسی زندگی پسند و مامور تھی اس کا اندازہ اس سے کرو کہ لوگوں کی آسودہ حالی سے متاثر ہو کر ازواج مطہرات کو بھی طبعاً کچھ اس طرف میلان ہوا۔ اور حضور سے کچھ مزید نان نفقہ اور سامان کی درخواست کی، جو حضورؐ کے قلب مبارک پر اتنی گراں گذری کہ ایک مہینہ گھر میں نہ جانے کی قسم کھالی بالآخر یہ آیت اتری۔ جس کا خلاصہ یہ کہ حضورؐ کو امر ہوا کہ

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۚ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا

صاف صاف اپنی بیبیوں سے فرمادیں کہ اگر تم کو دنیا اور اس کا ساز و سامان مطلوب ہے، تو میرا تمہارا نباہ نہیں ہو سکتا اور اگر تم خدا اور رسول کی رضا و خوشنودی اور آخرت کے مراتب و انعامات کی طالب ہو تو ایسی نیک بیبیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں عظیم الشان اجر و انعام مہیا فرما رکھا ہے۔

ازواج مطہرات آخر ازواج مطہرات تھیں سب کی آنکھیں اتنی ہی تنبیہ سے کھل گئیں اور پھر مدت العمر حضورؐ کے ساتھ خوشی خوشی فقر وفاقہ میں گذار دی کیونکہ حضورؐ کے ہاں بارہا فاقہ ہو جاتا تھا قرض لینے کی نوبت آجاتی تھی اور حضور کا یہ فقر وفاقہ اضطراری نہیں بالکل اختیاری تھا، جس کو حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ نے فقرِ صادق سے تعبیر فرمایا ہے۔

فقرِ صادق

جس کی علامت یہ ہے کہ اس کے ساتھ دلچسپی ہو اور دل چسپی اس کو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر محبوب تھا، حتیٰ کہ اپنی اولاد کے لئے بھی اس کو قولاً وعملاً اختیار کر کے دکھلایا۔ قولاً تو یہ کہ خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ	اے اللہ محمدؐ کی اولاد کو رزق بقدر
اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا ؕ	گذر اوقات عطا فرما ،،

اور عملاً یہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو سب خاندان سے زیادہ محبوب تھیں لیکن ایک مرتبہ جب ان کے ہاتھوں میں چکی چلانے سے چھالے پڑ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمانے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی لونڈی، غلام کی .... درخواست کی تاکہ کچھ مدد ملے آپ نے فرمایا کہو تو لونڈی غلام دوں اور کہو تو اس سے بھی اچھی چیز دے دوں۔ یہ سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پھر نہ پوچھا کہ وہ اچھی چیز کیا ہے بلکہ فوراً عرض کیا کہ اچھی چیز ہی دیدیجئے آپ نے فرمایا کہ سوتے وقت سُبْحَانَ اللّٰہِ ؕ تینتیس بار، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تینتیس بار، اور

اللہ اکبر چونتیس بار پڑھ لیا کرو، بس یہ لونڈی غلام سے بہتر ہے
اس خدا کی بندی نے خوشی خوشی قبول کر لیا، تو دیکھئے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کو فقر محبوب تھا تو اپنی اولاد کے لئے بھی اس کو تجویز کر کے
دکھلا دیا۔" (المرفیق فی سوار الطریق ص ۴۳)

اور جو اولاد کے لئے محبوب تھا، محبوب اصل میں وہی امت کے لئے بھی تھا۔
جیسا کہ اس عمومی ارشاد سے ظاہر ہے کہ

من اصبح منکم معافیً	یعنی جس کو جسم کی صحت وعافیت اور
فی جسمه وامناً فی سربه	دل کا امن وچین نصیب ہو اور ایک
عنده قوت یوم فکانما	دن کا کھانا پاس ہو تو گویا ساری دنیا
حیزت له الدنیا بحذافیرها	جمع ہو گئی۔

البتہ یہ ضعفائے امت کے حال پر ارحم الراحمین ورحمۃ للعالمین کی شان رحمت
تھی کہ جائز حد تک دنیا کے کسب وطلب کی اجازت واباحت فرما دی لیکن دنیا
کا ایسا عشق وجنون کہ جیسے کوئی منکر آخرت ہو، یا جیسے خدا سے کوئی واسطہ ہی
نہیں اس کی اگر اجازت ہو تو پھر دین ودنیا، کافر ومومن کا جھگڑا ہی کیا رہا!

مومن کی معاشی منطق

(۱) الغرض اسلامی ودینی زندگی کے لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ہر کام میں یوم دین
اور مالک یوم الدین سے معاملہ وواسطہ پیش نظر ہو، اس کے بعد دنیاوی زندگی کے
سارے مسائل ومشکلات از خود حل وسہل ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ان کی قدر
وقیمت وزن واہمیت ہی مستقل مسائل ومقاصد کی نہیں رہ جاتی نہ اپنی سعی و
عمل کا سارا زور کوئی ہوشمند اس دنیا کے کھانے پینے عیش وآرام پر اس طرح لگا دینے

کو راضی ہو سکتا ہے کہ ساری جدوجہد اسی ادنیٰ یا خسیس وحقیر زندگی میں گم ہو کر رہ جائے اور پھر حسنِ فہم یہ کہ بڑا کارِ نمایاں انجام دے رہے ہیں اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُہُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ؁ یہ تو بقول حضرت علیہ الرحمۃ کے ویسا ہی خلل دماغ ہوگا جیسا کوئی شخص کسی منزلِ مقصود کو بھلا کر ویٹنگ روم، ہوٹل یا مسافر خانہ اور سرائے کے چند ساعت یا چند دن کے قیام کے لئے اپنے فکر و عمل کی ساری قوت اس کی زینت و راحت پر خرچ کر ڈالے، سرائے و سفر میں تو آدمی کو اگر ایک دو وقت کا کھانا بھی نہ ملے اور فاقہ ہو جائے تو بھی زیادہ پروا نہیں کرتا چہ جائیکہ کسی ایسی سرائے میں مستقل جی لگا بیٹھے جہاں سے نکال دیا جانا یقینی ہے یہ وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا تو خاص کافر و منکرِ آخرت ہی کا شیوہ ہے اور انہی کو مبارک ہو۔

(۲) دوسری بات جو منکر کے مقابلہ میں مومن بالخصوص اہل علم مومن کے پیشِ نظر رہنے کی ہے وہ ہمارا یہ ایمان و اعتقاد ہے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کی طرح رزق اور اس کا قبض و بسط، یا فراخی و تنگی بھی بالکلیہ حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اور پہلے ہی سے اس کا سارا پروگرام یا نظام عمل متعین و مقدر ہو چکا ہے اس طرح اصل نظر اسباب کے بجائے مسبب الاسباب اور تدبیر کے بجائے تقدیر پر رہنا عین ایمان ہے جس کے بغیر ایمان ہی صحیح اور پورا نہیں ہوتا۔ جو کچھ خدا دینا چاہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور جو کچھ وہی نہ دینا چاہے تو کوئی دے نہیں سکتا (لا معطی لما منعت ولا مانع لما اعطیت)

حدیث میں تو صاف صاف ہے کہ کوئی بندہ بلا ان چار باتوں پر ایمان لائے مومن نہیں ہو سکتا ایک توحید (لا الٰہ الا اللہ) دوسرے رسالتِ محمدیہ

رصلی اللہ علیہ وسلم) تیسرے آخرت یا البعث بعد الموت اور چوتھے تقدیر۔ الفاظ حدیث یہ ہیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِاَرْبَعٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ وَيُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَيُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ ط

(۳) تیسرے جو ان دونوں مقدمات کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں مومن بس زیادہ سے زیادہ اپنی سعی وطلب کو ضروریاتِ زندگی تک محدود رکھے اور فضولیاتِ زندگی کی فکر وسعی قطعاً وقت عزیز کو گنوانا ہے اور طفلانہ لہو ولعب سے زیادہ نہیں، البتہ بلا اضاعتِ وقت اور بلا ابتلاء لہو ولعب کچھ راحت کا سامان بھی میسر ہو جائے تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کا اس طرح ایک انعام واحسان جان کر متمتع ہو۔ جس سے خدا وآخرت کا تعلق اور بیدار، ویا ئدار ہو، البتہ راحت بھی یاد رہے کہ اصل میں قلب کی راحت کا نام ہے اور یہ بات کان کھول کر دینداروں ہی کو نہیں دنیاداروں کو بھی سن اور سمجھ لینی چاہئے جیسا اوپر اپنے اور پرائے سب کے تجربات سے واضح کیا جا چکا کہ قلب کی راحت یا دل کے سکھ چین کا راز مادی ساز وسامان یا فضولیات کی بہتات میں نہیں بلکہ ضروریات زندگی پر قناعت ہی میں پوشیدہ ہے اور ساتھ ہی اگر ایمان وعمل صالح یا دینداری کی زندگی بھی نصیب ہو تو حیوٰۃ طیبہ کی موعودہ زندگی کا تجربہ اسی دنیا میں ہو جاتا ہے جس کا جی چاہے آزما کر دیکھ لے

مومن کی معاشی بے فکری

سو آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ مومن کامل کے اس سوال کا کہ کھائیں گے کہاں سے کیسا کامل و سہل حل موجود ہے، بلکہ جس کو معاش کی فکر و پریشانی کہا جاتا ہے ایمانی زندگی سے جسم و جان کو گھلانے والی یہ فکر معاش دراصل سرے سے خارج ہو جاتی ہے اور یہ سوال سرے سے بے معنی ہو جاتا ہے کہ دینی یا عربی تعلیم حاصل کر کے کھائیں گے کیا خصوصاً علم دین کی تحصیل و تعلیم کی ہمت و سعادت رکھنے والوں کا یہ سوال تو اور بھی بے معنی ہے اس کے معنی تو صرف یہ ہیں کہ ابھی علم دین کی ابجد بھی نہیں سمجھی اور دستار فضیلت باندھ لی اس لئے جیسا کہ اوپر تصریح و تاکید کے ساتھ عرض کیا گیا ہے زندگی میں دین پیدا کرنے کے لئے تعلیم دین کے ساتھ ساتھ تربیتِ دین بھی لازم بلکہ الزم ہے کیونکہ تربیتِ بلا تعلیم تو دیندار بنا دیتی ہے لیکن تعلیم بلا تربیت سے شاذ و نادر ہی دین پیدا ہوتا ہے۔

تعلیم دین کے ساتھ تحصیل معاش

تاہم انسان ایک گونہ بالطبع اس عالمِ اسباب میں اسباب و تدابیر کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اور اس سے تسلی پاتا ہے دوسرے وقت کے حالات جب کہ ہر طرف پیٹ ہی پیٹ کی پکار ہے اور پھر ہمارے عام ایمانی و اعتقادی ضعف و اضمحلال کی بنا پر حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے تعلیم کے ساتھ بقدر ضرورت تحصیل معاش کے ظاہری اسباب کا بھی جابجا مشورہ دیا ہے اگرچہ ایسے غیر مستطیع علمائے دین کی جو اپنا سارا وقت خدمت دین میں صرف فرماتے ہوں معاشی کفالت اسلامی حکومت یا بیت المال اور اغنیائے امت کے ذمہ ہے جیسا

کہ اوپر[1] خود حضرت علیہ الرحمۃ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کی تفسیر سے بالتفصیل واضح و ثابت فرما چکے ہیں۔ لیکن جب نہ ایسی اسلامی حکومت نہ بیت المال نہ اغنیائے امّت کو اس کا ادراک نہ ہمت تو علمائے امت کی مزید سعادت اسی میں ہے کہ گذر اوقات کے بقدر تدبیر معاش کی خود ہی ہمت فرمائیں اس ہمت افزائی کی مثالیں اسلافِ امت کے اکابر ائمہ میں بے شمار موجود ہیں اور تلخیصاتِ عشر کی تمہید کو بھی حضرت نے اس مشورہ پر ختم فرمایا ہے کہ جو لوگ صرف اردو کتب دینیات کے ذریعہ احکام دین حاصل کرنے کے بجائے اور علوم دینیہ حاصل کرنا چاہیں

(۱) تو صنعت و حرفت یعنی دستکاری دپیشہ سے معاش حاصل کرنے میں بہت آسانی و سلامتی ہے

(۲) اور عربی کی تکمیل کرنے والوں کے لئے چند صورتیں معاش کی مناسب ہیں اسکول میں نوکری کر لینا، مطب کرنا، مفید رسالے یا حواشی تصنیف کر کے یا درسی کتابیں چھپوا کر ان کی تجارت کرنا، کاپی نویسی کرنا کسی مطبع میں تصحیح کی نوکری کرنا اور سب صورتوں میں اوقات فراغ میں مطالعہ و تدریس کا شغل رکھنا یا کسی اسلامی مدرسہ میں مدرسی کرنا۔ بشرطیکہ چندہ کی درآمد و برآمد سے تعلق نہ ہو

باقی اصل راہ علم دین حاصل کرنے والوں کی وہی ہے کہ

اگر غنائے ظاہری و باطنی یعنی ثروت یا قوتِ توکل حاصل ہو تو محض حسبۃً لِلّٰہ اپنے کو دینی خدمات تدریس و تالیف وعظ و افتا وغیرہ کے لئے وقف کر دیں۔

---

[1] باب ہذا ص۳

اس مشورہ کے پیش نظر اور اس میں آسانی و سہولت پیدا کرنے کے لئے راقم ہذا کے خیال میں مدت سے یہ بات ہے کہ خود عربی و دینی مدارس ہی میں اور زمانۂ تعلیم و تعلّم ہی میں طلبہ میں صنعت و حرفت اور تجارت کی مختلف و مناسب صورتوں مناسبت و ذوق پیدا کر دیا جائے جس کی تدبیر یہ ہے کہ کم از کم ہر بڑے مدرسہ میں ساتھ ساتھ ایک مطبع بھی ہو جس میں مفید درسی و غیر درسی دینی کتابیں شائع ہوں جس کے ذیل میں طلبا کو کاپی نویسی، تصحیح، جلد سازی، وغیرہ طباعت و اشاعت کے مختلف متعلقات سے گنجائش وقت کے بقدر واقفیت کا موقع دیا جائے

اسی طرح ایسی ضروریاتِ زندگی نہ کہ فضولیاتِ زندگی جن کی صنعت کا بآسانی انتظام ہو سکتا ہو، مثلاً کفش سازی، ان کی صنعت کا بھی انتظام ہو اور کھانے پینے کپڑے وغیرہ دیگر ضروریات زندگی کی بڑی چھوٹی حسب موقع و محل دوکان ہو جس سے بیرونی خریداروں کے علاوہ خود طلبہ و اساتذہ وغیرہ تمام متعلقین مدرسہ کی ضروریات بھی فراہم ہوں اور باری باری طلبہ اس میں تھوڑا تھوڑا وقت دے کر اس قسم کی صنعت و تجارت سے مناسبت پیدا کریں تاکہ حسبِ مناسبت آئندہ زندگی میں اس سے تحصیل معاش کا کام لے سکیں۔

اگر کچھ زمین دستیاب ہو سکے تو باغبانی اور غلہ اور ترکاریوں وغیرہ کی کاشت کا بھی کچھ ضرور انتظام ہو جس سے معاشی مشغلہ کے علاوہ ورزشی و تفریحی مشغلہ کا کام بھی لیا جا سکتا ہے

اگر طالب علمی ہی کے زمانہ سے ایسی چیزوں کا مذاق پیدا کرا دیا گیا تو انشاء اللہ پھر ظاہری اسباب کی حد تک دین کے طلبا و علمار کے متعلق ضروریاتِ زندگی کے بقدر نہ یہ سوال ہوگا کہ کھائیں گے کہاں سے اور نہ انشاء اللہ مخلوق کی بندگی اور ملازمت کی ذلت سے ان کو دوچار ہونا پڑے گا۔

ایک تنبیہ

نہایت ضروری اس معاملہ میں یہ ہے کہ ایک درس گاہ نے دوکان وغیرہ کی قسم کی چیزیں کچھ جاری بھی کیں جن میں احقر کے مشورہ کو بھی مصالح مذکورہ کی بنا پر کچھ دخل تھا لیکن ہوا یہ کہ نظر طلبہ کی معاشی تربیت کے بجائے زیادہ تر مالی منفعت پر رہنے لگی اور آگے چل کر عربی و دینی مدرسہ کے مناسب مطبع و مکتبہ وغیرہ کی کچھ مزید مفید تر تجاویز جو پیدا ہوئیں ان کے نقشے میں بھی مالی منفعت کا رنگ زیادہ بھرا تھا اس کے علاوہ مزید نقص یہ تھا کہ اصل مقصد یعنی درس و تدریس کے فرائض میں خلل واقع ہونے کا قوی اندیشہ تھا لہٰذا جس طرح ایک طرف وقت کے تقاضوں کی بناء پر دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ معاشی تربیت کا خیال رکھنا ضروری ہے اسی طرح یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ مقصود بالذات دین کے طلبہ و علماء کو ملک التجار بنانا نہیں ہے بلکہ وہی گذر اوقات بقدر ضروریاتِ زندگی کے لئے کوئی حیلہ فراہم کردینا ہے تاکہ خدمتِ دین استغناء کے ساتھ کرسکیں نہ یہ کہ تاجرانہ منفعت کی فکر و تدبیر میں دینی تعلیم و تعلم کے اصل مقصد ہی میں خلل واقع ہونے لگے ۔ ماحصل یہ کہ اہل دین خصوصًا علمائے دین کی دنیا کا زندگی کے ہر شعبہ میں دین اور مقاصدِ دین کے تابع رہنا ضروری ہے ۔

وعظ و افتاء و تصنیف کے متعلق اصلاحات

علماء سے متعلق تین خدمات اور ہیں وعظ، افتاء اور تصنیف ان میں بھی جو ضروری باتیں اصلاح طلب ہیں ان کی طرف بھی حقوق العلم کی ایک خاص فصل میں متوجہ فرمایا گیا ہے۔

وعظ میں کوتاہی ایک تو وعظ نہ کہنے کی ہے اکثر اہل علم کو دیکھا کہ وعظ کے صرف تارک ہی نہیں بلکہ اس کی تحقیر کرتے اور علم کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں حالانکہ تعلیم دین کا اصلی طریقہ جس کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے یہی وعظ وارشاد ہے جس کے ذریعہ تبلیغ دین فرماتے تھے باقی تدریس وتالیف وغیرہ تو اس کے تابع ہیں سلف میں قوت حفظ وتدین کی بنا پر زبانی روایات اور خطبات عام پر قناعت و وثوق تھا بعد میں علوم کی حفاظت کے لئے تدریس وتالیف کی ضرورت ہوئی اس سے بھی اصل مقصود تبلیغ ہی ہے جس کی خطاب عام کی صورت کو وعظ کہا جاتا ہے۔

باقی جو کوتاہیاں خود وعظ کہنے کے متعلق ہیں وہ یہ ہیں (۱) وعظ پر نذرانہ لینا یا پہلے سے ٹھہرا لینا جس کی بدولت وعظ کا اثر نہیں ہوتا دوسرے واعظ فوتِ مال کے خوف سے اظہارِ حق سے رُکتا ہے تنخواہ لے کر وعظ کہنا اس سے مستثنیٰ ہے جس کا اوپر مبسوط بیان ہو چکا (۲) وعظ میں غیر ضروری یا عوام کے حق میں مضر مضامین مثلاً دقائق تصوف وغیرہ بیان کرنا (۳) مغلق تقریر کرنا (۴) کسی خاص شخص پر وعظ میں تعریض کرنا جس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے (۵) وعظ میں کسی کی فرمائش کے تابع بن جانا۔

ظاہر ہے کہ وعظ وہی ہے جو ان شرائط کے ساتھ ہو ورنہ وعظ کی نقالی بلکہ اس کا تمسخر ہے۔

افتاء میں یہ کوتاہیاں ہیں حصولِ زر کا اس کو آلہ بنانا۔ البتہ اگر اس کی تکمیل وانتظام میں کچھ خرچ ہوتا ہو تو اس کے بقدر وہ بھی اہل استطاعت

پر کچھ فیس کے بطور لگا دینے میں مضائقہ نہیں، ہر سوال کے جواب کی کوشش کرنا نہ بھی معلوم ہو تو یہ نہ کہنا کہ نہیں جانتا بلکہ کھینچ تان کر کچھ لکھ دینا۔ اسی طرح معلوم ہونے پر بھی ہر سائل کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں اس کا عوام پر بُرا اثر پڑتا ہے علما کو اپنے تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہذا جو سوال فی نفسہٖ یا کسی سائل کے اعتبار سے غیر ضروری ہو صاف کہدیا جائے کہ یہ سوال غیر ضروری ہے یا جو سائل دلیل سمجھنے کی لیاقت نہ رکھتا ہو اور دلیل معلوم کرنا چاہے اس کو بھی صاف جواب دیدینا چاہیئے سمجھانے کی کوشش نہ کرنے لگے۔

جب دلیل اِنّی کے متعلق یہ مشورہ ہے تو دلیل لمّی یعنی علّت دریافت کرنے کی عوام کو گنجائش ہی نہ دے کہ اس کا علم تو خود علما کو پورا پورا نہیں الا ماشاء اللہ مثلاً نماز کے پانچ وقت فرض ہونے کی دلیل اِنّی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور لمّی اس کی وہ حکمتیں ہیں جن کی بناء پر نماز فرض کی گئی۔

بعضے فرمائش کرتے ہیں کہ قرآن مجید سے پانچ وقت کی نماز کا ثبوت لاؤ، اب مجیب صاحب ہیں کہ قرآن مجید میں اس کی تلاش کرتے اور دوسروں سے مدد لیتے پھرتے ہیں حالانکہ حکم شرعی کے لئے مطلق دلیل شرعی کافی ہے خاص دلیل کی حاجت نہیں اور ادلۂ شرعیہ چار ہیں کتاب[۱] و سنت[۲] اور اجماع[۳] و قیاس[۴] مجتہد، ان میں سے کسی ایک دلیل سے بھی جو حکم ثابت ہو جائے، وہ ثابت ہے البتہ حسب تفاوتِ ادلہ ثبوتِ احکام کا درجہ متفاوت ہوگا۔

بعضے استفتا کرنے والے حیلے پوچھا کرتے ہیں جو ہرگز نہ بتلانا چاہیئے

بعض اوقات سوال مہمل یا نا صاف ہوتا اور دو صورتوں کو محتمل ہوتا ہے وہاں اکثر اہل علم تشقیق سے جواب دیدیتے ہیں کہ یہ صورت ہو تو یہ حکم اور وہ صورت ہو تو وہ حکم، اس سے تجربہ کاروں نے منع فرمایا ہے کیونکہ ناخدا ترس لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق سوال تراش لینے کی گنجائش ملتی ہے کہ وہ مفید مطلب ہی شق کے مدعی بن جاتے ہیں اور اصل واقعہ ملتبس ہو جاتا ہے۔

تصنیف میں بھی چند کوتاہیاں ہوتی ہیں غیر مفید فنون میں تصنیف کرنا، ردّ و قدح اور مجادلہ کو تصنیف کا بڑا مقصود بنا لینا، ایسے مباحث لکھنا جن کی ضرورت عوام کو نہ ہو یا جن سے وہ تشویش میں پڑ جائیں مثلاً تصوّف و کلام کے نازک مسائل، اور اگر خواص کی نفع رسانی کے لئے ایسی ہی ضرورت ہو تو خاص زبان مثلاً عربی میں لکھے کہ عوام کی نظر تک نہ پہنچے، محض تجارت کے لئے عوام کے مذاق کی کتابیں لکھ کر اُس سے روپیہ کمانا یا حق تصنیف کی بیع کرنا "

یہ تصنیف و تالیف کی وہ موٹی موٹی خرابیاں ہیں یا کوتاہیاں ہیں جو دینی کتابوں تک میں سرایت کر گئی ہیں اور جن سے اس زمانہ میں بس اللہ کا کوئی خاص بندہ ہی محفوظ ہوگا۔

متفرق اصلاحات

سب سے آخر فصل میں کچھ متفرق اصلاحات بیان فرمائی گئی ہیں
مثلاً بعض اہلِ علم اپنے کو خوب بناؤ سنگار سے رکھتے ہیں جو شانِ علم کے خلاف اور ضروری خدمات علم سے بے فکری کی علامت ہے کیونکہ اس فکر کے ساتھ لباس وطعام وغیرہ کے تکلفات کی طرف التفات نہیں ہوتا اسی طرح مجلس میں صدر یا ممتاز جگہ پر بیٹھنے کا شوق چلنے میں تقدم کی فکر، مجمع میں امام ہونے کا خیال، یہ سب ریار و کبر کے شعبے ہیں تواضع و بے تکلفی اور سادگی ہی میں علم و دین کی شان ہے حدیث میں ہے البذاذة من الایمان اس سے مساکین کو بُعد و توحش نہیں ہوتا اور یہی لوگ دین کے زیادہ قبول کرنے والے ہیں البتہ سادگی کے ساتھ طہارت و نظافت ضروری ہے۔

اور مثلاً دوسرے مولویوں کو بُرا کہنا جس میں بعض اوقات معصیت کے علاوہ عوام پر بُرا اثر ہوتا ہے وہ سب سے بدگمان ہو جاتے ہیں اگر کسی صاحبِ باطل کے شر سے بچانا ہی ضروری ہو تو تہذیب کے ساتھ اصلاح کر دینا کافی ہے اسی طرح دوسروں سے مولویوں کی بلکہ غیر مولویوں کی بُرائی سننا بھی گو کسی حالت میں جائز بھی ہو، مگر علماء کی شان کے مناسب نہیں بعض دفعہ اس کے مفاسد سے خود اپنے دین میں حرج ہونے لگتا ہے

اور مثلاً کسی کے فیصلہ میں پڑنا گو فی نفسہٖ طاعت ہے لیکن حسبِ ارشاد

نبوی کہ حضرت ابوذر رضؓ کو فرمایا لا تقضین بین اثنین ان علماء کو جو حکام نہیں اس میں پڑنا مناسب نہیں، طرفداری کا شبہ اور بدنامی بھی ہوتی ہے اور جو دینی نفع مسلمانوں کے ساتھ یکساں تعلق رکھنے سے ہوتا وہ فوت ہو جاتا ہے البتہ ایک صورت اسلم ہے کہ اگر فریقین درخواست کریں تو ان سے کہے کہ دونوں سوال لکھ کر اپنے اپنے دستخط کر دو پھر بطور جواب کے اس پر حکم شرعی لکھ کر حوالہ کر دے کہ اس پر دونوں عمل کر لو۔ یا کسی ثالث کو مقرر کر کے اس سے نافذ کرا لو۔

اور اسی مصلحت سے مناسب ہے کہ کسی شخص کے دنیوی معاملہ میں دخل نہ دے اور مالی معاملات سے بھی الگ رہے مثلاً چندہ وصول کرنا اس کا تحویل دار بننا یا اس کے صرف کا اہتمام لینا، یہ سب صورتیں بدگمانی اور تہمت کی ہیں۔ ایسے کام متدین رؤسا کے متعلق ہوں البتہ ان کو چاہئے کہ جو کام کریں علماء سے شرعی احکام دریافت کر کے کریں۔

اہل دنیا اور علماء کے تعلقات

سب سے آخر میں خاتمہ کے تحت ان باہمی تعلقات کا بیان ہے جو اہل دنیا اور علماء میں ہونے چاہئیں جو مختصراً یہ ہیں کہ:۔

" دنیا دار علماء کو مخدوم سمجھیں وہ جو کام دین کا کر رہے ہوں بدوں ان کی استدعا کے اس میں اعانت کریں مالی بھی (اور غیر مالی بھی) جو بات پوچھیں ادب سے پوچھیں، دلائل نہ دریافت کریں اگر کوئی شبہ رہے معاندانہ سوال نہ کریں مستفیدانہ پوچھیں ان سے کوئی لغزش ہو جائے تو ان کی مذمت نہ کریں آخر وہ بھی بشر ہیں اور اس حال میں بھی تمہارے نفع اور ہدایت کے لئے کافی ہیں تم ان کے اقوال پر عمل کرو۔

افعال کو مت دیکھو تمہارا شبہ ایک سے حل نہ ہو تو دوسرے سے حل کر و،
مگر ایک کا قول دوسرے کے روبرو مت نقل کرو

اور علماء کو چاہیئے کہ دنیا داروں کو اپنا برابر کا بھائی سمجھیں ان سے تعظیم و خدمت کے متوقع نہ ہوں اگر بلا توقع کچھ کر دیں تو سمجھیں کہ علم دین کی خدمت تو ہمارے ذمہ حقی ہی انہوں نے احسان کیا کہ ہماری اعانت کی، اس میں قیل و قال نہ کریں جیسے کہ بعض کی عادت ہے کہ کہیں تنخواہ پر تکرار ہے کہیں ترقی کا تقاضا، کہیں نذرانہ پر بحث، اگر کسی سے کچھ بے تمیزی ہو جاتے صبر کریں کہ جب ان کو ہمارے برابر علم نہیں تو ہمارے برابر تمیز کیسے ہو گی؟ اگر کسی کو قولاً یا فعلاً شرع کے خلاف دیکھیں تو جس پر قدرت و حکومت نہ ہو اس پر تشدد نہ کریں، نرمی سے بہت اصلاح ہوتی ہے اگر عامی کوئی حق بات کہے قبول سے عار نہ کریں۔ اگر کسی مسئلہ میں اپنی غلطی ظاہر ہو اعلان کر دیں"

معلم و متعلم و شرکائے علم کے باہمی حقوق

اس رسالہ حقوق العلم میں چونکہ معلم و متعلم اور شریک تعلیم کے حقوق کا ذکر نہیں فرمایا گیا تھا اس لئے بعد میں اصلاحِ انقلاب حصہ اوّل کے آخر میں اس کی تفصیل فرمائی گئی ہے۔ کیونکہ

علوم دینیہ کی جس طرح تعلیم و تعلم ضروری ہے اسی طرح اس تعلیم و تعلم کے سبب جن لوگوں کے ساتھ تعلقات ہوتے ہیں ان تعلقات کے حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے۔ اور یہ تمام حقوق آیات و احادیث سے مستنبط فرماتے ہیں

حقوق معلّم

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ الیٰ قولہٖ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ ۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے نعمت و منت ہونے کی علت تعلیم کتاب وحکمت کو قرار دیا گیا ہے جو اس امر کی صاف دلیل ہے کہ جو شخص کسی کو دین کی تعلیم دے وہ اس کے حق میں نعمت الٰہی ہے اور اس کی قدر و تعظیم لازم ہے اور اس تعلیم میں نہ صرف باقاعدہ سبق پڑھانا بلکہ مسئلہ وغیرہ تبلانا بھی سب داخل ہیں حتیٰ کہ کسی کی تصنیف سے انتفاع یہ بھی مصنف کے شاگردوں میں داخل ہو جاتا ہے

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا جو قصہ قرآن میں مذکور ہے اس میں بھی استاد کے کئی آداب وحقوق ثابت ہوتے ہیں اوّل یہ کہ استاد کی خدمت میں خود شاگرد جایا کرے ، دوم اگر استاد کسی اعتبار سے مرتبہ میں شاگرد سے کم ہو تب بھی اس کا اتباع کرے سوم جس بات کے پوچھنے کو استاد منع کرے نہ پوچھے ، چہارم اگر غلطی سے استاد کے خلاف مزاج کوئی بات ہو جائے تو معذرت کر لے پنجم اس کے تنگ ہونے یا مرض وغیرہ کی وجہ سے کسلمند ہونے کے وقت سبق بند کر دے ۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص تم پر احسان کرے ، اگر اس کی مکافات کر سکتے ہو تو مکافات کرو ، ورنہ دعا کرو ، تعلیم دین کے احسان ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے لہٰذا اس کے مکافات میں

ہر قسم کی جانی و مالی خدمت سے سعی کرنا چاہئے اور جب کسی قسم کی استطاعت نہ ہو یا استاد سے جدائی کے بعد نہ رہے تو کم از کم دعا ہی سے یاد رکھنا چاہیئے

بعض طلبہ کی عادت ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ احتمالات نکال کر استاد کے سامنے بطور اعتراض پیش کیا کرتے ہیں حالانکہ خود بھی اس کو مہمل سمجھتے ہیں مگر محض اپنی ذہانت جتلانے اور استاد کا امتحان کرنے کے لئے ایسی نامعقول باتیں کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ مغالطہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور سے منع فرمایا ہے کہ (نہی عن الاغلوطات) چہ جائیکہ استاد کو مغالطہ دینا،،

ایک حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جانتے ہو سب سے زیادہ سخی کون ہے انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اللہ کا رسول زیادہ دانائے حال ہے تو آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ سخی اللہ تعالیٰ ہے پھر تمام بنی آدم میں سب سے زیادہ میں، پھر وہ جس نے علم دین سکھلایا اور اس کو پھیلایا، یہ شخص قیامت میں تنہا بمنزلہ ایک امیر کے آوے گا

اس حدیث میں تمام وہ لوگ داخل ہیں جو تدریس و تلقین و وعظ و تصنیف کسی طرح بھی دین کی تعلیم و اشاعت کرتے ہوں اور ظاہر ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ سخاوت وجود کرے، اس کا کتنا حق ہوتا ہے

حجۃ الوداع کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریر سے فرمایا کہ لوگوں کو چپ کرادو، جس سے معلوم ہوا کہ استاد کی تقریر کے وقت بالکل خاموش و متوجہ رہنا چاہئے کسی سے بات یا کسی کی طرف التفات نہ کرے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ توراۃ کا ایک نسخہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور اس کو پڑھنا شروع کیا۔ جس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوا۔ حضرت ابوبکر رض نے فرمایا کہ اے عمر رض، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کو تو دیکھو کہ ناخوشی کے آثار پائے جاتے ہیں حضرت عمر رض نے دیکھتے ہی فرمایا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں

اس سے ثابت ہوا کہ اگر استاد کسی بات پر غصہ کرے تو شاگرد کو معذرت کرنا چاہیئے۔ دوسرا حق شاگرد کا یہ ثابت ہوا کہ اس سے کوئی امر نامناسب صادر ہو تو اس کو تنبیہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس کی اصلاح ہو اور تیسرا حق شریک علم یا رفیقِ سبق کا یہ ثابت ہوا کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو جس پر وہ خود مطلع نہ ہو تو خیر خواہی کے ساتھ اس کو مطلع کر دے تاکہ تدارک کر لے۔

راقم ہذا کے نزدیک ایک ضروری امر اور بھی اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ اگر کسی کتاب کے متعلق شاگرد کو معلوم ہو جائے کہ استاد کسی وجہ سے اس کے لئے اس کا پڑھنا پسند نہیں کرتا۔ خواہ کم استعدادی یا اور کسی مضرت و مصلحت کی وجہ سے تو اس سے باز رہنا چاہیئے۔

ایک اور حدیث میں استاد کا یہ ادب صراحتًہ مذکور ہے کہ علم سیکھو اور اس کے لئے سکینہ اور وقار اختیار کرو اور جس سے علم سیکھو اس کے ساتھ تواضع اور ادب سے پیش آو۔

آگے طلبہ کی ان مختلف موٹی موٹی کوتاہیوں پر یکجا متنبہ فرمایا گیا ہے جو محتاج

اصلاح ہیں مثلاً :۔
استاذ کے ظاہری ادب وسلام کا لحاظ نہ رکھنا، اس کی پوری اطاعت نہ کرنا۔ کوئی بات مان لی تو کسی کو بلا عذر ٹال دیا۔ خلوص میں کمی، بدنی یا مالی خدمت میں کمی، بلکہ بدنی خدمت پنکھا وغیرہ جھلنے کو تو اب بہت سے شاگرد ذلت وعار سمجھنے لگے ہیں۔

خاص طالب علمانہ کوتاہیاں

یہ ہیں کہ :۔ مثلاً مطالعہ نہ دیکھنا یا کم دیکھنا جس سے سبق سمجھنے میں دقت ہوتی ہے اور استاد کو بار بار تقریر کرنا پڑتی ہے یا اس کم سمجھنے کی بدولت فضول سوال کرنے سے استاد کو تنگی وپریشانی ہوتی ہے اور مثلاً تقریر کے وقت دوسری طرف التفات کرنا کہ استاد تو اس کی طرف متوجہ ہے اور وہ دوسری طرف جس سے استاد کو بہت کوفت ہوتی ہے یا بعض کا اپنی ذہانت جتلانے یا استاد کا امتحان کرنے کے لئے فضول سوالات کرنا، یا مقدار سبق وکتاب وغیرہ کے معاملہ میں استاد کی رائے نہ ماننا کہ ہم تو اتنا ہی سبق پڑھیں گے یا فلاں ہی کتاب شروع کریں گے یہ تو زمانہ طالب علمی کی بعض کوتاہیوں کا بیان تھا۔ بہت سے لوگ طالب علمی کے بعد یا استاذ سے جدائی کے بعد کوئی حق نہیں سمجھتے، یا سمجھتے ہیں مگر ادا کرنے کا اہتمام نہیں کرتے کبھی خط تک نہیں بھیجتے کہ استاد کی خیریت ہی معلوم کرلیں حالانکہ چاہیئے کہ استاد کی وفات کے بعد بھی اس کے حقوق ملحوظ رکھے جس کا خلاصہ دو باتیں ہیں ایک اس کے لئے دعائے مغفرت ہمیشہ کرتے رہنا، دوسرے اس کے اقارب

واجباب اور معاصرین کی تعظیم وخدمت کا خیال رکھنا جیساکہ والدین کے اس قسم کے حقوق کی حدیث میں تاکید ہے"

کچھ بدنصیب ایسے ہیں جو کسی نفسانی غرض سے استاد کے مخالف ہوجاتے ہیں اور تحریرًا یا تقریرًا ان کی شان میں گستاخی کرتے ہیں حالانکہ استاد وہ چیز ہے کہ اگر دینی ضرورت سے بھی اس کے خلاف کرنا پڑے تو بھی کافر باپ کی طرح دین میں مخالفت کرنے کے باوجود ادب واحترام ترک نہ کرے۔

جو اساتذہ کسی مدرسہ سے تنخواہ پاتے ہیں ان کے حقوق اور بھی ضعیف سمجھے جاتے ہیں اتنا نہیں سمجھتے کہ ان حقوق کی جو بنیاد ہے وہ تنخواہ پانے سے معدوم نہیں ہوگئی، کیا تنخواہ تعلیم دین جیسے احسان کا بدل ہو سکتی ہے اگر اس نے محض تنخواہ یا دنیا کی نیت سے بھی تعلیم دی تو بھی خواہ ثواب کم ہوجاتے مگر احسان تو ویسا ہی ہے"

بعض شاگرد استاد کی تعظیم وتکریم اس کی کسی دنیوی وجاہت و عظمت کی وجہ سے کرتے ہیں وہ بھی شاگردی کی خوبی نہیں چنانچہ اگر استاذ جاہ وشہرت میں شاگرد سے کم ہو تو بعض ناخلف اپنے کو اس کی طرف منسوب کرنے میں بھی عار سمجھتے ہیں مبارک ہے وہ جو ایسے استاد کا بھی حقِ استادی ادا کرے

متعلّم کے حقوق

اس کے بعد اب کچھ متعلم وشاگرد کے حقوق، معلم واستاذ بھی اپنے اوپر سن لیں۔ اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ

الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط اس آیت سے نصًا معلوم ہوا کہ مستفیدین کے ساتھ اگرچہ وہ طالب نہ ہوں (کیونکہ آیت میں مدعوین ایسے ہی لوگ ہیں) ان کے مذاق و استعداد اور رفق و ملاطفت کی رعایت ضروری ہے، ابتدائی خطاب (مثلاً کتاب کی تقریر) میں بھی جیسا کہ اُدْعُ سے مراد ہے اور سوالات کے جواب میں بھی جیسا کہ "جَادِلْهُمْ" سے یہی مقاولت مراد ہے۔

اور حدیث میں تو صاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ ہمارے پاس دور دراز ملکوں سے علم دین سیکھنے آویں گے ان کے بارے میں میری وصیت ہے کہ بھلائی سے پیش آنا

اسی طرح حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی بات بیان کرے اور جانتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹا ہے جس سے معلوم ہوا کہ سبق میں غلط سلط یا مستفتی کو غلط فتویٰ تبلا دینا حرام ہے۔ جیسا کہ بعضوں کی عادت ہے کہ اپنا جہل چھپانے کے لئے غلط سلط ہانک دیتے ہیں اتنا کہنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، سوچ کے بتائیں گے یا دوسرے سے پوچھ لیں، یا طالب علم ہی کو پوچھنے کی اجازت دیدیں اس سے عار آتی ہے۔ حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون عالم ہوگا آپ بارہا کسی سوال کے جواب میں فرما دیتے کہ نہیں معلوم اور جب وحی نازل ہوتی اس وقت تبلا دیتے اور حدیث ہی میں ہے کہ اگر کسی نے بلا علم کے مسئلہ تبلا دیا تو اس کا وبال بتانے والے پر ہوگا۔"

اس میں کئی خرابیاں ہیں اگر طالب علم کو پتہ لگ گیا کہ استاد نے غلط سلط
تبلا دیا ہے تو اس سے نفرت اور دل میں حقارت پیدا ہوگی جس سے استادی
کے حقوق ادا کرنا دشوار ہوگا اور اگر نہ پتہ لگا تو طالب علم بچارہ عمر بھر جہل میں
مبتلا رہا جس کا سلسلہ آگے معلوم نہیں کہاں تک جاتے پھر استاد
کے اخلاق اکثر شاگرد میں سرایت کر جاتے ہیں تو یہ ہٹ دھرمی اور سخن
پروری کا عیب شاگردوں میں بھی پیدا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر جمعرات کو وعظ
فرمایا کرتے تھے کسی نے عرض کیا کہ حضرت روزانہ فرمایا کریں۔ تو فرمایا میں تم
کو تھکانا نہیں چاہتا۔ اور میں تمہارا ایسا ہی خیال رکھنا چاہتا ہوں جیسا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا خیال فرماتے تھے کہ ہم تھک نہ جائیں

اس حدیث سے مستفیدین علم کا یہ حق بھی معلوم ہوا کہ ان کے
شوق ونشاط کو باقی رکھنے کا بھی خیال رکھے، مثلاً اتنا سبق نہ پڑھاتے
یا اتنی کتابیں نہ شروع کرادے کہ طالب علم اکتا جائیں۔ بعضے تعطیل
میں بھی طالبعلموں کی جان مارتے اور اس کو اپنی بڑی کارگذاری جانتے ہیں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے اور ایسے وقت
آکر ملے کہ نماز کا وقت آگیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے جلدی میں کسی وجہ سے
پاؤں دھونے میں کچھ سوکھا رہ گیا۔ تو آپ نے دو تین مرتبہ زور سے فرمایا
کہ خبردار عذاب ہے ان ایڑیوں کے لئے جو سوکھی رہ جائیں۔

اس سے تین حق شاگردوں کے ثابت ہوتے ایک تو یہ کہ صرف
تعلیم ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے اعمال کی بھی نگرانی رکھے۔ جس کی طرف

اب بالکل ہی توجہ نہیں کی جاتی۔ اساتذہ صرف سبق پڑھا دینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ دوسرا حق یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے اس کا احتمال ہو کہ بدوں آواز بلند کئے آواز نہ پہنچے گی مثلاً حلقۂ درس بڑا ہو تو تقریر بلند آواز سے کرے، تیسرے اگر احتمال ہو کہ ایک بار کی تقریر سے طلبہ نے نہ سمجھا ہو گا تو دوسری تیسری بار بھی تقریر کر دینا مناسب ہے، اور یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادتِ مبارکہ تھی کہ جب کوئی بات مہتم بالشان ہوتی تو تین بار فرماتے تاکہ لوگ خوب سمجھ لیں۔

بعض اہل علم کو ضرورت بلا ضرورت اپنے علم کے اظہار کا عارضہ ہوتا ہے جس سے بعض جماعتوں کو ضرر بھی ہوتا ہے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ جو شخص مرے اور خدا سے اس حال میں ملے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو تو وہ جنت میں داخل ہو گا تو حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ کیا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤں آپؐ نے فرمایا نہ سناؤ کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ اس پر تکیہ نہ کر لیں۔

دیکھو یہ مضمون اپنی جگہ صحیح اور شریعت کے مقاصدِ عظیمہ میں سے تھا پھر بھی آپ نے لوگوں کے ضرر کے خیال سے اس کی اشاعت ناپسند فرمائی، جس سے معلوم ہوا کہ جو مسئلہ یا کتاب کسی طالب علم کے لئے مضر یا نامناسب معلوم ہو اس سے روک دینا بھی استاذ کے ذمہ ہے اور طالب علم کو اس میں استاذ کی اطاعت لازم ہے"

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ خواب میں مجھے دودھ کا ایک پیالہ دیا گیا۔

میں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ کہ ناخن تک سیرابی کا اثر محسوس ہوا۔ پھر بچا ہوا دودھ عمر کو دیدیا۔ لوگوں نے عرض کیا حضور اس کی تعبیر کیا ہوئی؟ فرمایا دودھ سے مراد علم ہے۔

اس سے دو امر معلوم ہوئے ایک باعتبار صورت لبن کے اور ایک معنیٰ لبن کے۔ اول یہ کہ شاگرد کو گاہ گاہ اپنے کھانے پینے میں شریک کرلیا کرے جس سے اس کا دل بڑھتا اور محبت زائد ہوتی ہے اور جس قدر استاذ سے محبت ہوگی اسی قدر علم میں برکت ہوگی۔ دوسرا یہ کہ اگر حق تعالیٰ کسی کو کوئی باطنی نعمت عطا فرمائے تو شاگرد سے دریغ نہ کرے غرض ظاہری و باطنی غذا کا کچھ حصہ اس کو بھی دے

ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فلاں شخص کی نماز اتنی طویل ہوتی ہے کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ نہ پا سکوں (یعنی بددل ہو کر جماعت چھوڑ دوں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اتنا برافروختہ ہوئے کہ کبھی اتنا برافروختہ ہوتے نہ دیکھا تھا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو متنفر کرتے ہو، جو نماز میں امامت کرے اس کو چاہیئے کہ (قرارت) میں تخفیف سے کام لے، کیونکہ نماز میں مریض، ضعیف و حاجتمند سب قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

اس سے بھی دو امر ثابت ہوئے ایک یہ کہ اگر کچھ اسباق اپنے شاگرد یا ماتحت کے سپرد کئے جائیں اور اس کی شکایت ہو تو شکایت سننا اور تحقیق کے بعد انتظام کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ شکایت کرنے والے کو محض طالب علم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے

دوسرا یہ کہ اگر کسی شاگرد یا طالب علم سے کوئی نامناسب حرکت ہو اور

معلوم ہو کہ غصہ ہو کر کہنے سے زیادہ نفع ہو گا تو اس کی مصلحت سے غصہ ہی کرنا افضل ہے "

عورتوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم پر مرد غالب آگئے ہیں کہ آپ کا وعظ سننے کا ہم کو موقعہ نہیں ملتا ہمارا بھی ایک دن مقرر کر دیا جائے آپ نے مقرر فرما دیا اس سے اوقات کی تعیین و تقسیم اور طلبہ کی جماعت بندی کا مصلحت ہونا معلوم ہوا۔ ایک عظیم مصلحت یہی ہے، کہ جن کے لئے جدا سبق مناسب ہے وہ ایک ہی میں کیسے شریک ہوں اس قسم کی خاص خاص باتوں کے ساتھ ساتھ شاگردوں کا ایک عام اور بڑا حق یہ ہے کہ ان کے حق میں علم کی دعا بھی کیا کرے جیسا کہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو سینہ سے لگالیا اور فرمایا کہ یا اللہ اس کو قرآن کا علم عطا فرمائیے۔

شرکائے علم کے حقوق :- آگے شرکائے علم کے حقوق کا بقدر ضرورت بیان فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی عوالی مدینہ میں کچھ فاصلہ پر رہا کرتے تھے اور باری باری جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے جس دن میں جاتا جو کچھ سن کر آتا ان سے بیان کر دیتا جس دن وہ جاتے مجھ سے بیان کر دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنا شریک تعلیم اگر کسی سبق میں حاضر نہ ہو تو ناغہ شدہ سبق اس کو تکرار کرا دیا جائے اور یہ اس کا حق ہے، نیز مدرسوں میں باری باری سے پڑھنے کی بھی اس سے اصل نکلتی ہے، باقی خود کلام مجید میں والجار الجنب والصاحب بالجنب یعنی ہمسایہ و ہم صحبت یا ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کے ساتھ احسان کا جو حکم ہے وہ حسب موقع شرکائے تعلم کا بھی ایک دوسرے پر حق ہے جیسا کہ مفسرین نے شریک تعلیم کے ساتھ اس کی تفسیر بھی کی ہے۔

اس کے علاوہ شرکائے تعلم کے باہمی حقوق کی پوری

پوری تفصیل وتکمیل کے لئے حضرات صحابہ کی باہمی معاشرت وطرزِ عمل کا پیش نظر رکھنا کافی ہوگا اس لئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سب کے سب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد ہی تھے

ضروری تنبیہات

آخر میں تین ضروری تنبیہات فرمائی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ گو متعلم کے مفہوم میں متعارف استاد کی طرح پیر، واعظ اور مصنف جس سے بھی افادہ واستفادہ کا تعلق ہو سب داخل ہیں لیکن حقوق سب کے مساوی نہیں بلکہ متعارف معنی میں جس کو استاد کہا جاتا ہے اس کا حق زیادہ ہے اولاً تو اس لئے کہ یہ استاد شاگردوں کے لئے جتنی مشقت برداشت کرتا ہے دوسرے اہل افادہ نہیں کرتے بعض طرق افادہ میں تو چنداں مشقت ہی نہیں اور بعض میں اگرچہ مشقت ہے مگر وہ کسی خاص مستفید کے لئے برداشت نہیں کرتا۔ حالانکہ ووصینا الانسان بوالدیہ حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھًا کی نص قطعی سے مشقت کی بناء پر حق کا عظیم ہونا ثابت ہے۔ ثانیاً شاگرد استاد کی تابعیت کا التزام کرتا ہے اور التزام ایک وعدہ ہے اور وفائے عہد لازم ہے۔

عام لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں کہ پیر کی تعظیم اور خدمت واطاعت میں تو حدودِ شرعیہ سے بھی تجاوز کرتے ہیں لیکن استاذ کے حقوق ادا کرنے میں حد شرعی کے قریب بھی نہیں پہنچتے اور یہ شریعت کی تغییر کے سوا کیا ہے ؟

دوسری قابل تنبیہ بات یہ ہے کہ استاد اور پیر کا حق زیادہ ہے یا باپ کا اس میں بھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پیر اور استاد روحانی مربی ہیں اور باپ جسمانی اور روحانی مربی کا درجہ جسمانی سے بڑھا ہے اس دعویٰ کی غلطی اجمالاً اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ نصوص میں جس شد و مد سے باپ کے حقوق تبلائے گئے ہیں استاد اور پیر کے نہیں تبلاتے گئے

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ باپ نرا جسمانی مربّی ہے حالانکہ اس کے ذمہ روحانی تربیت بھی ہے خود نہ کر سکے تو کسی اور استاد کے پاس یا مدرسہ میں بھیجے جیسا بہت سے کرتے ہیں۔

اتنا بھی نہ کرے تو قابل مؤاخذہ ہے جیسے کوئی باپ جسمانی تربیت یا کھلانے پلانے میں کوتاہی کرے بہر حال باپ، باپ ہی ہے جہل کی اور بات ہے ورنہ اس کے برابر جسمانی و روحانی اعتبار سے خیر خواہ کون ہو سکتا ہے، پھر

سب سے بڑے روحانی مُربّی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور حق تعالیٰ تو جسم و روح دونوں کے مربّی ہیں اور جب خدا اور رسول نے ہی باپ کا حق زائد فرما دیا تو ان کی اطاعت بڑے مربی کی چھوٹے مربی کے حق پر تقدیم ہے۔ البتہ واجبات شرعیہ کی مخالفت میں نہ باپ کی اطاعت ہو گی نہ استاد و پیر کی اور مباحات میں باپ کا حق مقدم ہو گا، تیسری تنبیہ یہ ہے کہ آیا معقولات، فارسی اور حساب وغیرہ کے استاد بھی حقوق مذکورہ کے حقدار ہیں یا نہیں، اسی طرح کافر استاد بھی، اس میں قواعد سے تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو چیزیں مضر ہیں ان کا استاد تو خود مضر و مضل ہے اور استاد کا جو کچھ حق تھا وہ بوجہ مفید و محسن ہونے کے اور جو چیزیں مضر نہیں ہیں ان میں تفصیل ہے کہ اگر علوم دینیہ میں نافع و معین

ہیں تو چونکہ مقدمہ کا حکم مقصود کا ہوتا ہے اس لئے ایسے اساتذہ
حقوقِ مذکورہ کے مستحق ہوں گے گو استاد مقاصد کے درجہ میں نہ سہی
جس طرح اقارب کے حقوق میں قوتِ قرابت کے تفاوت سے حقوق میں
تفاوت ہوجاتا ہے اور اگر نہ مضر ہیں نہ مفید تب بھی ایک دنیاوی
احسان ہے اور دنیوی احسان پر شکر گذاری نصوص عامہ سے ثابت ہے
اس لئے اس کا بھی حق ثابت ہوگا گو دینی احسان کے برابر نہ سہی

اقتباساتِ بالا میں صریح نصوص سے جو استنباطات فرمائے گئے ہیں اور ان سے طلبہ و اساتذہ کو تعلیم و تعلم کے جن حقوق و آداب کی طرف متوجہ اور جن کوتاہیوں پر متنبہ فرمایا ہے، دنیوی درسگاہوں یا انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے اکابر و اصاغر کی خدمت میں تو اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنا ہی عبث ہے ان کی تو دنیا ہی الگ ہے، البتہ عربی و دینی مدارس کے اساتذہ و تلامذہ کی ان سے غفلت بلکہ الٹے انگریزی اسکولوں اور کالجوں ہی کے اساتذہ اور شاگردوں کی نقالی کو فخر جاننے کی جو وبا ان میں بھی پھیل گئی ہے اس کی بناء پر حضرت مجدد کی اس باب میں تجدیدات و اصلاحاتِ بالا کی کچھ مزید تفصیل و تشریح کا جی چاہتا تھا مگر کس کس چیز کی کہاں کہاں تک شرح کیجائے، ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

باقی مدارس دینیہ کے مخلص و اہلِ فکر حضرات کے لئے جن کو دل سے کچھ اصلاح کی فکر ہے حضرت کے یہ اجمالی ارشادات و اشارات بھی رہنمائی کے لئے کافی ہیں ورنہ اکثر دل سے اندیشہ تو ان باتوں کو محقراتِ امور کہہ کر ٹالدینے کا ہے کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی اور ان کی اصلاح سے بے فکری کا یہ بھی ایک چلتا ہوا بہانہ بنایا گیا ہے کہ یہ چھوٹی اور حقیر باتیں ہیں جس کا جواب وہی ہے جو حضرت ایسے مواقع پر فرمایا

کرتے تھے کہ "اچھا تو ایک چھوٹی سی چنگاری اپنے کپڑوں کے صندوق میں رکھ دو"

اصلاح تعلیم نسواں

وقت کی رائج و مقبول بولی اگر بولی جاتے تو کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظام تہذیب و تمدن میں عورت کو چونکہ اصلاً و اصولاً کسب معاش کی فکر و ذمہ داری سے آزاد رکھا گیا ہے اس لئے خالص معاشی و دنیوی تعلیم کی تو بجز استثنائی حالتوں کے اس کو حاجت ہی نہیں، زیادہ سے زیادہ کچھ گھریلو اور ہلکی قسم کی ایسی دستکاریوں کی تعلیم کافی ہے جو اتفاقی صورتوں میں عزت و آبرو کی حفاظت کے ساتھ گذر اوقات میں معین ہوں۔ اسی طرح دینی تعلیم میں بھی عام وعظ و تبلیغ یا مدارس میں درس و تدریس وغیرہ کی متعدی خدماتِ دین بھی عورت کے فرائض میں داخل نہیں اس لئے قدرۃً اس کی تعلیم کا معیار و معاملہ خود اپنے دین کی فکر و درستی، اپنے بچوں کی تربیت و نگرانی یا خاص شرطوں کے ساتھ خود اپنی ہمجنسوں کی دینی تعلیم و خدمت تک محدود رہ جاتا ہے اس محدود ضرورت کی تمام اطراف و جوانب کی جامعیت کے ساتھ خود حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ نے بڑی حد تک بہشتی زیور کے ذریعہ تکمیل فرما دی ہے لیکن عورتوں کی تعلیم کی یہ محدودیت مردوں کے مقابلہ میں اس کی اہمیت میں کمی کو ہرگز مستلزم نہیں بلکہ ابتدائی تربیت کے ذریعہ بچوں میں دین کو راسخ کرنے کے لئے یہ زیادہ اہم و الزم ہے اس لئے حضرت نے مختلف مواعظ و مضامین وغیرہ میں اس کی مستقلاً اور جا بجا تفصیل و تاکید فرمائی ہے۔ ایک طویل مضمون "اصلاح تعلیم نسواں" کے عنوان سے رسالہ القاسم میں شائع فرمایا تھا پھر کچھ رد و بدل کے

ساتھ بطور ضمیمہ بہشتی زیور میں شامل فرما دیا اس مضمون میں افراط و تفریط کی ان کوتاہیوں کی اصلاح فرمائی گئی ہے جو بالعموم عورتوں کی تعلیم کے معاملہ میں لوگ کرتے ہیں۔

مختلف خیالات

تین خیال کے لوگ ہیں ایک وہ جو نہ تعلیم نسواں کے مخالف ہیں نہ حامی مگر تعلیم کا اہتمام نہیں، دوسرے جو مخالف ہیں اور تیسرے حامی۔ ان سب سے مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

طبقہ اوّل

اس کی سب سے اشد و اعظم کوتاہی یہ ہے کہ ایسے خیال کے مردوں اور خود عورتوں کے نزدیک عورتوں کو تعلیم دینے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں اور دلیل یہ ہے کہ کیا عورتوں کو نوکری کرنا ہے، ان لوگوں نے نہ تعلیم کی غرض سمجھی اور نہ نصوص و روایات میں غور کیا۔ جو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے تحصیلِ علم کو ایک درجہ میں فرض و واجب قرار دے رہی ہیں ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ علم سے غرض نوکری نہیں کیونکہ جس علم کا حاصل کرنا ہر شخص پر واجب ہے وہ علم معاش نہیں علم دین ہے جس سے انسان کے عقائد و اعمال، معاملات، معاشرت، اور اخلاق درست ہوں جس کا ثمرہ دنیا میں اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ہے کہ یہی لوگ اپنے رب کی راہ پر ہیں اور آخرت میں اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کی بشارت کہ انہی کے لئے کامیابی ہے لہٰذا اس تعلیم کا وجوب نقلاً و عقلاً

ظاہر ہے نقلاً تو طلب العلم واجب علیٰ کل مسلم۔ طَلَبُ الْفِقْہِ حتم واجب علیٰ کل مسلم۔ یاایھا الناس علیکم بالعلم اور ویل لمن لا یعلم وغیرہ روایات ہیں۔

جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علم کے وجوب و فرضیت کی بنیاد نفس اسلام کے لئے ہے نہ کہ عورت یا مرد کی خاص جنس وصنف کے لئے، اس لئے کہ اسلام کی حقیقت ہی خاص عقائد و اعمال کے علم و عمل کے سوا کیا ہے اور عمل بلا علم کے کیسے ممکن ہے اس لئے عقلاً بھی ثابت ہے کہ جب اصلاح عقائد و اعمال فرض ہے اور وہ موقوف ہے ان کا علم حاصل کرنے پر اور فرض جس پر موقوف ہو اس کا فرض ہونا بدیہی ہے۔ البتہ اس کے لئے عرفی یا کتابی علم فی نفسہٖ واجب نہیں۔ صحیح اعمال و عقائد کا کسی نہ کسی طرح سن سُنا کر بھی جان لینا کافی ہے۔

لیکن یہاں تین باتیں قابل غور ہیں اول یہ کہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے جیسے جو شخص پیدل سفر حج کرنے پر قادر نہ ہو اور ریل وجہاز وغیرہ کی استطاعت رکھتا ہو تو اس پر واجب ہوگا۔ کہ سفر کا عزم کرے اور ریل وجہاز کا ٹکٹ لے کر اس پر سوار ہو، سو ریل یا جہاز کا ٹکٹ خریدنا اور اس پر سوار ہونا فی نفسہٖ شرعاً واجب نہیں لیکن ایک فرض کا ذریعہ ہے اس لئے یہ بھی فرض ہوگا مگر بالغیر، دوسرے تجربہ سے معلوم ہوا کہ اب علم کا محفوظ رہنا کتابوں ہی کے پڑھنے پڑھانے پر موقوف ہے جو تعلیم کا متعارف طریق ہے اور علم دین کا محفوظ رکھنا واجب ہے لہٰذا طریق متعارف تعلیم کا جاری رکھنا بھی واجب ہے البتہ یہ واجب علی الکفایہ ہے یعنی ہر مقام پر اتنے آدمی دینیات پڑھے ہوتے چاہئیں کہ اہل حاجت کے دینی سوالوں کا جواب دے سکیں۔

تیسری بات بھی تجربہ سے ثابت ہے کہ مرد علماء مستورات کی دینی ضروریات کے لئے کافی ووافی نہیں۔ اولاً پردہ کے سبب سے سب عورتوں کا علماء تک پہنچنا قریباً ناممکن، دوسرے اگر گھر کے مردوں کو واسطہ بنایا جاتے تو بعض گھروں میں تو ایسے مرد میسر ہی نہیں اور بعض مردوں کو خود اپنے ہی دین کی فکر نہیں ہوتی تو عورتوں کے لئے کیا اہتمام کریں گے۔ پھر گھر میں باپ بیٹا بھائی کوئی عالم ہو بھی تب بھی عورتیں بعض مسائل ان سے پوچھ نہیں سکتیں اور سب شوہروں کا عادۃً عالم ہونا ناممکن لہذا عورتوں کی عام احتیاج رفع ہونے کی صورت اس کے سوا نہیں کہ اگر سب نہیں تو کچھ عورتیں پڑھی ہوئی ہوں تاکہ عام مستورات ان سے دین کی ہر قسم کی تحقیقات کر لیا کریں۔ اس لئے لکھے پڑھے مردوں کی طرح عورتوں میں بھی ایسی تعلیم ہونا واجب وضروری ہے۔

دوسرا طبقہ

وہ ہے جو تعلیم نسواں کا بالکل مخالف اور اس کو نہایت مضر جانتا ہے۔ خصوصاً لکھنے کی تعلیم کو کہ جس کو چاہا خط لکھ دیا یا دوسروں نے اپنے نفسانی جذبات ان تک پہنچا دیئے ۔۔۔۔۔۔ تو اس راہ سے شیطان کا جال پھیل جانا زیادہ عجب نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ اور جب تعلیم زیادہ ہو تو یہ مفسدہ بھی اس صورت میں زیادہ ہوگا جب کہ کسی عورت کے مضامین نثر و نظم اخبار میں چھپنے لگیں جن کو دیکھ کر سخن شناس شیاطین کاتبہ کے رنگ اور جذبات و خیالات کا اندازہ کرتے اور شرارت کے شرارے زیادہ پھیلتے ہیں اور غضب یہ کہ فخر کے لئے صاحبہ مضمون کا نام و پتہ تک صاف لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں کی بیوی فلاں کی بیٹی فلاں مقام۔

ایک خرابی ان تعلیم یافتہ عورتوں میں یہ ہوتی ہے کہ ہر طرح کی کتابیں منگا کر پڑھتی ہیں

عشق بازی کے قصے، سازش اور لگاوٹ کے ناول، شوق انگیز غزلیں، پھر ان سے طبیعت بگڑتی ہے وغیرہ وغیرہ، ان واقعات سے انکار نہیں لیکن ان کی حقیقت کے سمجھنے میں کوتاہ نظری سے کام لیا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ان سب خرابیوں کی ذمہ دار تعلیم نہیں بلکہ نصاب تعلیم، طرز تعلیم، طرز عمل، یا سوء تدبیر ہے۔ یعنی یا تو ایسی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں جن سے حلال و حرام کے احکام، ثواب و عذاب کی تفصیل اور تہذیب اخلاق کا طریقہ معلوم ہو اور جن سے دل میں خوف و خشیت اور حق کی معرفت و عظمت پیدا ہو، یا یہ ہوا کہ نصاب تعلیم کے کافی و مفید ہونے کے باوجود مضامین کو قلب میں جمانے کی کوشش اور ان پر عمل کی نگرانی نہیں کی گئی مثلاً جس روز لڑکی یہ پڑھے کہ غیبت گناہ ہے اس کے بعد جب غیبت کرے تو فوراً اس کو ٹوکا اور یاد دلا جائے کہ دیکھو تم نے کیا پڑھا ہے اور اس کے خلاف کرتی ہو...... اس طرح اگر ان کو برابر متنبہ کیا جاتا ہے تو امید ہے کہ اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ کا ان میں ملکہ پیدا ہو جائیگا ہاں اگر طینت ہی میں خرابی ہو، تو

ع ناکس بہ تربیت نہ شود اے حکیم کس

غرض مفاسد کے اسباب یہ ہیں تو اس میں عورتوں کی کیا تخصیص، یہی اسباب مفاسد مردوں کو پیش آئیں تو وہ بھی ویسے ہوں گے۔ البتہ عرفاً ان قبائح کا عورتوں سے صدور، یا ان کی نسبت رسوائی و ذلت کا زیادہ موجب خیال کی جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس باب میں مرد و عورت یکساں ہیں اور عرف کو شرح پر اس طرح ترجیح دینا بہت بڑا شعبہ ہے جاہلیت کا..... جس کے معنی صاف یہ ہیں کہ مردوں کے لئے ایک معصیت کو ضعیف سمجھتے ہیں اور عورتوں کے لئے شدید، جس پر استخفافِ دین کے فتوے کا اندیشہ اور سخت اندیشہ ہے۔

تیسرا طبقہ

باقی جو تعلیم نسواں کے حامی ہیں ان سے اس تعلیم کی تعیین اور اس کے طریقہ کی تجویز میں غلطی ہوتی ہے ان کی بعض غلطیوں کا بیان اوپر طبقہ ثانیہ کی اصلاح کے ضمن میں گذر چکا۔ مثلاً ان کو صرف پڑھا کر چھوڑ دینا۔ کہ جس قسم کی واہیات، خرافات کتابوں اور رسالوں کا چاہیں آزادی سے مطالعہ کرتی رہیں، یا تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت اور عمل کی نگرانی کا خیال نہ رکھنا۔

ان کے علاوہ بعض یہ ہیں کہ مستورات کو بجائے علومِ دینیہ پڑھانے کے تاریخ جغرافیہ، یا اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انگریزی پڑھاتے ہیں جس کی وجہ صرف یورپ کی تقلید ہے حالانکہ ہم میں ان کے رسوم وعادات وغیرہ کے علاوہ سب سے بڑا فرق مذہب کا ہے وہ یا تو کوئی مذہب نہیں رکھتے، اور زیادہ ایسے ہی ہیں اور یا ان کا مذہب ہمارے مذہب سے الگ ہے اس لئے ان کو یا تو مذہبی تعلیم سے سروکار ہی نہیں یا اپنے مذہب کی تعلیم ہوگی یا صرف دنیوی معلومات۔

لہٰذا جب ان کی غرض تعلیم اور ہے اور ہماری اور، جس کا اوپر طبقہ اولیٰ کی اصلاح خیال میں ذکر ہوا۔ یعنی ہماری غرض تعلیم اسلامی عقائد واعمال، معاملات معاشرات اور اخلاق کا علم اور ان کی اصلاح ہے تو ظاہر ہے کہ ان کی تقلید کرنا ہمارے لئے بالکل بے جوڑ ہے۔

بعضے لوگ اپنی لڑکیوں کو آزاد وبیباک عورتوں سے تعلیم دلاتے ہیں اور صحبت کا اخلاق وجذبات پر ضرور اثر پڑتا ہے، خاص کر جب ہم صحبت بڑا اور ایسا ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ استاد کی عظمت واطاعت دونوں ہوتی ہیں ...... اگر استانی آزاد وبیباک نہ ہو لیکن ہم سبق لڑکیاں ایسی ہوں تب

بھی اسی کے قریب قریب مضرتیں واقع ہوں گی ۔

اس تقریر سے تعلیم کی دو خاص صورتوں کا حال بھی معلوم ہو گیا جن کا اس وقت بے تکلف رواج ہے، ایک لڑکیوں کے لئے عام زنانہ اسکول بنانا اور عام مدرسوں کی طرح اس میں مختلف قوم اور مختلف طبقات وخیالات کی لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا۔ گو استانی مسلمان ہی ہو اور پردہ کا بھی اہتمام ہو تاہم واقعات وتجربہ نے دکھلادیا کہ یہاں بھی ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جن کا اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے اور اگر استانی بھی کوئی مکار اور آزاد مل گئی تو کریلا نیم چڑھا۔

دوسری صورت یہ کہ اگر کہیں مشن کی میم صاحبہ سے بھی روزانہ یا ہفتہ وار تعلیم کی نگرانی یا صنعت سکھانے کے بہانہ سے اختلاط ہونے لگا تب تو نہ آبرو کی خیر ہے نہ ایمان کی، مگر افسوس صد افسوس کہ بعض لوگ ان آفات کو مایۂ افتخار سمجھ کر خود اپنے گھروں میں بلاتے ہیں ۔

اسلم طریقہ لڑکیوں کے لئے یہی ہے جو زمانہ دراز سے چلا آرہا ہے کہ دو دو چار چار لڑکیاں اپنے تعلقات کی جگہ آویں اور پڑھیں ۔ اگر ایسی استانی مل جائے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے یہ تعلیم زیادہ بابرکت وبااثر ثابت ہوئی ہے ورنہ بدرجۂ مجبوری تنخواہ کا بھی مضائقہ نہیں اور جہاں کوئی بھی استانی ایسی نہ ملے گھر کے مرد پڑھا دیا کریں ۔ نصاب تعلیم یہ ہو کہ اول کلام مجید حتی الامکان صحیح پڑھایا جائے پھر سہل زبان کی دینی کتابیں جن میں تمام اجزائے دین کی مکمل تعلیم ہو (اس وقت بہشتی زیور کے دسوں حصے ضرورت کے لئے کافی ہیں) اور اگر گھر کا مرد تعلیم دے تو جو مسائل شرم کے ہوں ان کو چھوڑ دے اور اپنی بیوی کے ذریعہ سمجھوا دے ۔ اور یہ انتظام بھی نہ ہو سکے تو ان پر نشان کرادے کہ وہ سیانی ہو کر خود سمجھ لیں، یا عالم شوہر میسر ہو تو اس سے پوچھ لیں گی یا شوہر کے ذریعہ عالم سے تحقیق کرالیں گی ۔

بہشتی زیور کے آخر میں کچھ اور مفید رسالوں کے نام بھی لکھ دیئے ہیں جن کا پڑھنا اور مطالعہ عورتوں کے لئے مفید ہے اگر سب نہ پڑھے تو ضروری مقدار پڑھ کر باقی کو مطالعہ میں ہمیشہ رکھیں، نیز تعلیم کے ساتھ عمل کی بھی نگرانی رکھیں اور اس کا اہتمام بھی رکھیں کہ ان کو پڑھنے پڑھانے کا شوق پیدا ہو تاکہ عمر بھر علمی شغل رہے تو اس سے علم وعمل کی تجدید وتحریص ہوتی رہتی ہے۔

اور ضروری نصاب کے بعد اگر طبیعت میں قابلیت دیکھیں تو عربی کی طرف متوجہ کریں تاکہ قرآن وحدیث وفقہ اصلی زبان میں سمجھنے کے قابل ہو جائیں البتہ قرآن کا خالی ترجمہ جو بعض لڑکیاں پڑھتی ہیں میرے خیال میں سمجھنے میں زیادہ غلطیاں کرتی ہیں اس لئے اکثر کے لئے مناسب نہیں۔

یہ تو سب پڑھنے کے متعلق بحث تھی، رہا لکھنا تو اگر قرائن سے طبیعت میں بیباکی معلوم نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ خانگی ضرورتوں کے لئے اس کی بھی حاجت ہوتی ہے اور اگر خرابی کا اندیشہ ہو تو مفاسد سے بچنا غیر واجب مصالح کے حاصل کرنے سے اہم ہے ایسی حالت میں لکھنا نہ سکھلادیں

تحقیق تعلیم انگریزی

یہ تو تفصیل تمامتر دینی تعلیم سے متعلق اصلاح وتجدید کی تھی جو تعلیم دین کے تمام اطراف وجوانب کو محیط ہے، دینی مدارس ان کے اساتذہ، وطلباء ان کے نصاب تعلیم وطرز تعلیم، علماء وعوام کا باہمی استفادہ وافادہ، وعظ و افتاء، تالیف وتصنیف، عورتوں کا مسئلہ تعلیم، غرض تعلیم دین کے جس گوشہ میں جو خلل وفساد نظر آیا اس پر تنبیہ اور اس کے انسداد کی تدبیر فرمائی گئی، اور مجدد دین کو اصلاً واصولاً تعلیم دین ہی کی تجدید سے سروکار تھا جو گویا اصلاح کا

ایجابی پہلو تھا۔

لیکن اس ایجاب کا ایک سلب بھی بہت تحقیق طلب تھا پرہیز کے بغیر کوئی علاج کارگر نہیں ہو سکتا۔ لادینی حکومت و سیاست کے غلبہ و تسلط کی بدولت ایک ایسا نظام تعلیم مسلط ہو گیا ہے جو اپنی فطرت و ساخت، اپنے آثار و نتائج کے اعتبار سے بالکلیہ دنیا پرستی کا معلم اور دین کی بالکلیہ ضد اور نفی واقع ہوا ہے یہ وہ جدید یا ہمارے ملک میں انگریزی تعلیم ہے جو دین کے لحاظ سے گویا مکھیوں کا پکا ہوا سالن ہے یا طاغوتی جراثیم میں لپٹا ہوا چوہا جس کو جلا دینے یا جس سے بھاگ کھڑے ہونے ہی میں جان کی سلامتی ہے اسی طرح ایمان کی سلامتی بھی، جس کو ایمان عزیز ہو اس جدید یا انگریزی تعلیم سے بُعد و فرار ہی میں ہے۔ یہی خلاصہ ہے اس مختصر و محققانہ مضمون کا جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ نے تحقیق تعلیم انگریزی کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے اور جو محض معنًی ہی محققانہ نہیں صورۃً بھی چند مسلّم و بدیہی مقدمات پیش فرما کر ان کے منطقی نتائج کو واضح فرما دیا گیا ہے۔ اس طرح کہ پہلے دس مقدمات پھر ایک ایک مقدمہ کے حوالہ سے ان کے لازمی نتائج بیان فرمائے گئے ہیں

لیکن چونکہ آج کل کے خطابت پسند دماغ بالعموم اتنی منطق کے متحمل نہیں رہے ہیں اس لئے ذیل میں خفیف لفظی رد و بدل کے ساتھ اس کو پیش کیا جاتا ہے خصوصًا نتائج کو سب مقدمات کے بعد نہیں بلکہ ساتھ ساتھ پیش کر دیا گیا ہے تاکہ ذہن کو ہر نتیجہ کی گرفت اور مقدمہ سے اس کے ربط میں دشواری نہ ہو۔

پہلا مقدمہ

کسی شے کا قبیح ہونا یا تو ذاتی ہوتا ہے یا عارضی، جیسے زنا و سرقہ کہ قباحت

ان کی ذات ہی میں داخل ہے کسی عارضی چیز کی وجہ سے نہیں آئی اس لئے یہ کبھی کسی حالت میں جائز و مباح نہیں ہو سکتے اور عارضی چیز کی مثال جیسے اذان جمعہ کے بعد خرید و فروخت ہے کہ یہاں نفس بیع میں کوئی خرابی نہیں بلکہ ایک عارضی سبب یعنی فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ کے حکم کی وجہ سے جمعہ کی اذان کے بعد بیع ناجائز و ممنوع ہوگی۔

تو اب ظاہر ہے کہ انگریزی اپنی ذات میں محض ایک زبان ہے اور اس کی تعلیم متعارف نصاب کے اعتبار سے چند علوم و فنون کا نام ہے اور کسی زبان یا علم و فن کا سیکھنا اپنی ذات میں ممنوع نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مقدمہ

البتہ جو چیز کسی عارضی و خارجی سبب سے مفاسد کا ذریعہ بن جائے تو بذاتِ خود مباح ہونے کے باوجود ان مفاسد کی وجہ سے عارضی طور پر حرام ہو سکتی ہے جیسے ہتھیار فروخت کرنا بذاتِ خود جائز ہے لیکن دشمن یا غداروں کے ہاتھ بوجہ غدر و دشمنی کے فساد کے حرام ہے۔

لہذا اگر انگریزی تعلیم پر بھی مفاسد مرتب ہوتے ہوں تو فی نفسہٖ جائز و مباح ہونے کے باوجود ان مفاسد کی وجہ سے حرام و ممنوع قرار پائے گی۔

تیسرا مقدمہ

دین، نماز روزہ حج و زکوٰۃ وغیرہ صرف ظاہری اعمال ہی کا نام نہیں بلکہ سب سے بڑھ کر عقائد کا جزء ہے جس پر نجات کا مدار ہے، اور ایک جزء صبر و شکر، اخلاص و تواضع وغیرہ اخلاقِ حمیدہ کا ہے وہ بھی محققین کے نزدیک نماز روزہ ہی کی

کی طرح فرض ہے اگر کوئی صرف چند اعمال ظاہری کو پورا کرلے نہ عقائد ٹھیک ہوں نہ اخلاق تو اس کو پورا مسلمان ظاہر ہے کہ نہ کہا جائے گا۔

اب انگریزی تعلیم کے جو آثار دن رات مشاہد ہیں وہ ملاحظہ ہوں کہ نماز روزہ میں کاہلی بلکہ اعراض، عقائد میں ضعف بلکہ تشویش و انکار، اخلاق میں تکبر و نمائش و تصنع اور کافروں کی تقلید، بلکہ دینداروں کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھنا۔

چوتھا مقدمہ

حب دنیا کی قرآن و حدیث میں ممانعت ہے اس کا خلاصہ دو چیزیں ہیں حبِ مال، اور حبِ جاہ، یعنی مال وجاہ کا ایسا محبوب ہونا کہ ان کے مقابلہ میں دین کے ضائع ہونے کا صدمہ نہ ہو، یعنی جس چیز سے مال وجاہ کی ترقی لیکن دین کا تنزل ہو تو مال وجاہ کو ترجیح دینا اور دین کی پرواہ نہ کرنا۔ قرآن و حدیث پر جن کی نظر ہے ان کے نزدیک یہ مقدمہ اجلی بدیہیات میں ہے

انگریزی تعلیم یافتہ دماغ کا کام دن رات مالی ترقی اور جاہ و منصب کے حصول کی ہوس پکانا۔ ان کی تحصیل کے پیچھے شرعی احکام کی ذرہ برابر بھی نظر میں وقعت نہ رہنا ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جو اللہ و رسول کے نزدیک مبغوض و ملعون ہے

پانچواں مقدمہ

شریعت کے احکام کا دار و مدار حقیقت پر ہے نہ کہ نام پر، پس اگر شراب کو شربت یا زنا کو نکاح کا نام دیدیا جائے تو اس سے حکم نہ بدل جائے گا دونوں

بدستور حرام ہی رہیں گی۔

تو گو اس وقت ہوسناکوں نے اسی ملعون ومبغوض دنیا کا نام اولوالعزمی وترقی رکھ لیا ہے لیکن نام یا عنوان بدل جانے سے حقیقت یا معنون تو نہیں بدل جاتا۔

چھٹا مقدمہ

کسی شے پر جو حکم لگایا جاتا ہے وہ غلبہ واکثریت کی بناء پر ایک آدھ استثناء اس حکم کو غلط نہ ٹھہرائے گا مثلاً سنکھیا کی ایک خاص مقدار عام طور سے مہلک ہوتی ہے لیکن اگر اتفاق سے کوئی شخص ہلاک نہ ہو تو اس سے سنکھیا کے مہلک یا زہر قاتل ہونے کے حکم میں فرق نہ آئے گا۔

اسی طرح اگر بعضے لوگوں میں انگریزی تعلیم کے مذکورۂ بالا آثار نہیں پیدا ہوتے ہیں تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

ساتواں مقدمہ

اگر کسی چیز پر کسی خاص اثر کے مرتب ہونے کا حکم لگایا جائے تو اس کے اسباب کا معلوم ہونا ضروری نہیں مشاہدہ وتجربہ ہی بالکل کافی ہے، مقناطیس کی علت وسبب نہ بھی معلوم ہو تو بھی اس کے اثر کا حکم لگانے کے لئے کشش کا مشاہدہ وتجربہ کافی ہے

لہذا صحت حکم کے لئے اس سے بحث ضروری نہیں کہ انگریزی تعلیم کے اثرات ملاحدہ کی صحبت، مصنفین کے خیالات، سائنس وغیرہ کسی خاص فن کی تعلیم، یا تعلیم دین کے عدم اہتمام وغیرہ کس سبب سے پیدا ہوتے ہیں جب تک یہ آثار پیدا ہوتے رہیں گے عدم جواز کا حکم بدستور قائم رہیگا۔ ہاں

اس کی اصلاح کے لئے ان اسباب پر بحث ہوگی جس کا ذکر راقم ہذا آگے کرتا ہے

آٹھواں مقدمہ

جس شے کو حاصل کیا جاتا ہے وہ یا تو خود مقصود ہوتی ہے یا مقصود کا ذریعہ ہوتی ہے ذریعہ تو بقدر ضرورت ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ مثلاً غذا، خود مقصود ہے تو وہ ہمیشہ حاصل کرنے کی چیز ہے بخلاف اس کے دوا تو وہ دفع مرض کا ذریعہ ہے جب مرض نہ رہیگا دوا سے روک دیا جائیگا اس لئے جو شخص دنیا کی ایسی ضرورت سے انگریزی پڑھنا چاہے جو شریعت کی نگاہ میں بھی ضرورت ہو (اور بڑے بڑے عہدوں کے لئے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنا جس میں شریعت کی طرح طرح کی مخالفت کرنا پڑتی ہے وہ حد ضرورت سے خارج ہے) یا کسی دینی ضرورت سے پڑھے مثلاً مخالفوں کو اسلام کی دعوت دینے یا ان کے اعتراضوں کو رفع کرنے کے لئے تو اس کے لئے بقدر ضرورت اجازت ہوگی۔

نواں مقدمہ

جس امر میں اہل رائے کا اختلاف ہو تو وہ دراصل دلیل کے کسی مقدمہ میں ہوگا، یہ نہیں ہو سکتا کہ دلیل تو مسلّم ہو اور پھر نتیجہ میں مخالفت رہے، مثلاً زید آدمی ہے اور جو آدمی ہو وہ لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے اس لئے زید لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص زید کسی گدھے کا نام رکھ دے۔ اور کہے کہ زید چونکہ گدھا ہے اور گدھا لکھ نہیں سکتا۔ اس لئے زید لکھ نہیں سکتا۔ تو یہ اختلاف نتیجہ میں نہیں مقدمہ یا دلیل میں ہے جو ذرا سے غور کے بعد اٹھ جا سکتا ہے کہ اگر زید آدمی کا نام ہے تو پہلا نتیجہ صحیح اور دوسرا غلط ہے

اور اگر زید گدھے کا نام ہے تو دوسرا صحیح اور پہلا غلط ہے

لہٰذا اگر کسی مستند عالم کا قول یا فتویٰ انگریزی تعلیم کے نتیجے یا جواز کے خلاف پایا جائے تو حقیقت میں یہ اختلاف کسی مقدمہ میں ہوگا نہ کہ نتیجہ میں، سو یہاں دو مقدمے ہیں ایک یہ کہ انگریزی کی مروجہ تعلیم سے فلاں فلاں خراب یا بے دینی کے اثرات پیدا ہوتے ہیں دوسرا یہ کہ جس تعلیم سے ایسے خراب اثرات پیدا ہوں وہ قبیح یا ناجائز ہے، سو پہلا مقدمہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں بلکہ ایک واقعہ کی تحقیق ہے جس میں مشاہدہ وتجربہ میں اختلاف کی بناء پر اختلاف ہو سکتا ہے اور اسی کی تحقیق سے ایک رائے کی صحت اور دوسری کی غلطی کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔
لیکن دوسرا مقدمہ شرعی مسئلہ اور کلی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف کوئی مستند عالم یہ بھی تسلیم کرے کہ انگریزی تعلیم سے الحاد و بے دینی پیدا ہوتی ہے اور پھر بھی اس کے جواز کا فتویٰ دے۔

آخری دسواں مقدمہ

یہ ہے کہ جو حکم یا فتویٰ کسی عارضی سبب سے ہوتا ہے وہ قدرۃً اس عارض کے بدل جانے سے بدل جاتا ہے اس لئے اگر کسی طرح انگریزی تعلیم کے ان خراب اور مخالف دین آثار کا انسداد ہو جائے جن کی اوپر تفصیل گذری اور اس تعلیم کی عام واکثری مضرت کا دفعیہ ہو جائے تو اس کے قبح یا عدم جواز کا حکم بھی اٹھ جاوے گا۔ گو موجودہ حالت میں اس کی امید بہت کم ہے۔
کم کیا بس منطقی امکان سے زیادہ نہیں، راقم ہذا چوتھائی صدی سے زیادہ انگریزی کی نئی تعلیم گاہوں کالج اور یونیورسٹی ہی میں خدمت کرتا رہا ہے

خصوصًا عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) میں اس تعلیم کی دینی مضرتوں کے انسداد کا دنیا بھر سے زیادہ ظاہری سامان فراہم، اسکول ہی سے دینیات کی تعلیم لازم جس کا سلسلہ برابر بی اے تک قائم۔ باقاعدہ امتحانات، جس میں کامیابی کے بغیر سند نہیں مل سکتی، پھر اسکول سے لے کر کالج اور میٹریکولیشن سے لے کر ایم اے تک بلکہ پی ایچ ڈی تک علوم جدیدہ کے پہلو بہ پہلو تفسیر وحدیث وغیرہ علوم دینیہ کا مستقل انتظام اور پورا شعبہ موجود، اساتذہ کی تنخواہیں بھی بیش قرار، اور قریب قریب وہی جو مغربی علوم وفنون کے اساتذہ کی، طلبہ کے لئے حکومت کے محکموں اور نوکریوں میں بھی وہی حقوق جو مغربیات کے طلبہ کے، وظائف کا دروازہ بھی یورپ تک کے لئے دینیات والوں کے حق میں بھی کھلا ہوا، شعبۂ دینیات کے اساتذہ بھی خصوصًا دور اول کے ماشاء اللہ ایسے کہ اپنے لائق سے لائق مغربی تعلیم کے ہم چشموں یا اپنے شاگردوں کے سامنے کسی طرح شرمندہ نہیں تعطیل اتوار کی نہیں جمعہ کی، رمضان شریف میں روزہ داروں کی رعایت میں اوقات صبح کے بلکہ گرمیوں کے رمضان میں سرے سے تعطیل، پھر حکمران کے متعلق سب کو معلوم کہ دینی علوم وروایات کے برقرار رکھنے پر مُصر۔

الٹا اثر

غرض مغربی علوم اور مغربیت کے دینی اثرات کے مقابلہ میں علوم دین کے لزوم واہتمام اور اہل دین کی وقعت وعظمت وغیرہ کے بہت کچھ ظاہری اسباب مہیا ہونے پر بھی غلبہ طلبا واساتذہ سب پر مغربیت اور لادینی اثرات ہی کا وہ بھی مغربی علوم وفنون ہی کی حد تک نہیں، شعبۂ دینیات کے تفسیر وحدیث وفقہ وکلام، خالص دینی علوم وفنون کے پڑھنے والے جن کے لئے انگریزی محض زبان

کی حد تک لازم، ان تک کے عادات واطوار، افکار و خیالات، صورت و سیرت ظاہر و باطن سب پر رنگ اپنے مغربی رفقاء ہی کا غالب ہے (الا ماشاء اللہ) طلباء تو طلباء اساتذہ میں بھی چند قدیم دینی درسگاہوں کی صورتیں رہ گئی ہیں جن کے رخصت ہونے پر دینی علوم کے اساتذہ کو صورۃً بھی لادینی علوم کے اساتذہ سے الگ کرنا دشوار ہوگا۔ رہا استثناء سو وہ استثناء ہی ہے۔ اور اب تو لادینی یا سیکولر حکومت شعبہ دینیات کے نام کی ہی روادار نہیں۔

جامعہ ملیہ

یہی حال کم وبیش جامعہ ملیہ دہلی کا۔ جو ملیہ سے زیادہ اپنی تعلیم و تربیت میں اسلامیہ ہونے کی مدعی ہے اور اس سے بڑھ کر حال نام نہاد مسلم یونیورسٹی (علیگڈھ) کا ہے ان تجربات سے بہرحال حضرت جامع المجدد دین علیہ الرحمۃ کی اس رائے کی توثیق ہوتی ہے کہ اس قسم کی انفرادی تدابیر کے باوجود۔ موجودہ حالات میں اس کی امید بہت کم ہے کہ انگریزی تعلیم کی ان عام و اکثری مضرتوں کا دفیعہ ہو سکے، جن کی تفصیل اوپر گذری۔ خصوصًا لادینی کے ساتھ ساتھ محض دینی تعلیم کا پیوند لگا دینا یہ تو تجربہ نے ثابت کر دیا کہ بالکل ہی ناکام ہے بلکہ اس پیوندکاری کا خود دینی تعلیم والوں پر الٹا ہی اثر پڑتا ہے کہ

وہی نماز روزہ میں کاہلی بلکہ اعراض، وہی عقائد میں ضعف و تشویش، وہی اخلاق میں تکبر و تصنع وہی کفار کی تقلید کا ذوق و شوق۔ وہی مال و جاہ کی محبت کہ ان کی طلب میں دین کے ضائع ہونے کا صدمہ نہ ہو، اور دن رات دماغ میں بس مالی ترقی اور جاہ و منصب کی ہوس پکاتے رہنا، جس چیز سے مال وجاہ کی ترقی لیکن دین کا

تنزل ہو تو مال و جاہ کو ترجیح دینا اور دین کی پرواہ نہ کرنا؎

دین کی پرواہ

جس کو دین کی کچھ بھی پرواہ ہے وہ خوب جانتا ہے کہ دین کا مطلوب دنیا نہیں ہے دنیا صرف راستہ ہے منزل نہیں - لہٰذا اگر ایسی صورت ہو کہ راستہ میں چند گھنٹوں یا ایک آدھ دن کی کھانے پینے کی تکلیف بھی ہو، سفر بھی تھرڈ کلاس ہی، بلکہ آج کل کی طرح ریل کے پائدان پر لٹک کر رہی (جس میں جان تک کا خطرہ ہے) طے کر لینا پڑے اور منزل پر پہنچ کر مستقل سکونت کے لئے باغ و بنگلہ

؎ بزرگانِ ندوہ نے نیک نیتی سے، اور لادینی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا نہیں بلکہ دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کا ذرا سا پیوند لگا دیا تھا اس نے بھی بعض اور اسباب کے ساتھ مل کر دینی و اخلاقی اعتبار سے کچھ اسی طرح کے آثار و رجحانات پیدا کئے جو حضرت مجددؒ نے ان چار سطروں میں خالص انگریزی تعلیم کے جمع فرما دیتے ہیں۔ الحمدللہ کہ اب نسبتہً کچھ اصلاح ہے مگر نسبتہً ہی علامات مرض کے ساتھ اسباب مرض کی طرف توجہ اب بھی نہیں۔

انگریزی اب بالکل نکال دی گئی ہے تمام طلبہ کے لئے اس کے لزوم کا ختم کر دینا یقیناً بڑا مستحسن اقدام ہے البتہ جن طلبہ میں ذہنی صلاحیت اور دینی استقامت کا تجربہ و اطمینان ہو اور جن سے امید ہو کہ جدید علوم و فنون و افکار و تصورات کے مقابلہ میں دین کی حمایت و تبلیغ کی کوئی تحریری یا تقریری خدمت انجام دے سکیں گے صرف ان کے لئے اس انتظام کا برقرار رہنا ضروری ہے کہ فراغ کے بعد دو تین سال صرف انگریزی اور اس جدید علم و فن کی تعلیم دلائی جاتی جس سے طبیعت کو خاص مناسبت ہو۔

نوکر چاکر عیش و راحت کے سارے لوازم مہیا ہوں تو اس سے بڑھ کر کون احمق ہوگا جو اس عیش و راحت کو قربان کر کے چند گھنٹوں کے سفر میں فسٹ یا سیلون و اسپیشل کے پیچھے جان دیتا پھرے اور منزل پر پہنچ کر جھونپڑا بھی نصیب نہ ہو بلکہ دن رات نیچے تپتی ہوئی صحرائے افریقہ کی ریت کا بستر ہو اور اوپر دماغ کھولانے والے خطِ استوار کے سورج کا سائبان ! ہاں اگر منزل کے کامل و دائم عیش و آرام میں کچھ خلل آئے بغیر سفر میں کچھ انٹر سیکنڈ کی راحت میسر آجائے تو مضائقہ نہیں نہ خواہ نخواہ سفر میں مصیبت اٹھانا فرض ہے۔

غرض جس شخص کو کچھ احساس ہے کہ مسلمان ہونے کے معنی اس حقیقت پر ایمان لانے کے ہیں کہ دنیا کی ساٹھ ستر سال کی عارضی زندگی (وہ بھی ایسی غیر یقینی کہ یقین ایک سانس کا بھی نہیں) کے سفر کے بعد ایک ابدی کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی ہماری اصلی منزل ہے جہاں کے روحانی انعامات و درجات کا تصور ہی کون کر سکتا ہے، لباس و طعام، تزک و احتشام، عیش و آرام جس کے لئے ہم اس دنیا میں مرتے ہیں وہ بھی یہاں سے ہزارہا ہزار درجہ بہتر ہوگا اور یہ تمامتر احکام شریعت کی متابعت اور خدا و رسول کی رضا و اطاعت پر موقوف ہے، تو وہاں کی جنت کے مقابلہ میں بھلا یہاں کی ہفت اقلیم کی سلطنت کو کون ہی ترجیح دے گا؟

غالباً حضرت ابراہیم ادہم کی حکایت ہے کہ ان سے کسی نے بہت تعجب سے کہا کہ آپ نے کمال ہی فرمایا کہ بادشاہی پر لات ماردی فرمایا میں نے کیا کمال کیا کمال اُن کا ہے جنہوں نے جنت پر لات ماردی جب تک دین و دنیا کے تعلق کا یہ دینی تصور دل و دماغ پر غالب نہ ہو اس وقت تک دنیوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا خالی پیوند لگا دینے سے ہرگز دل و دماغ میں دنیا پر دین

کی ترجیح و تفوق کا رنگ و رجحان پیدا نہیں ہو سکتا یہ رنگ پورا تو جب ہی چڑھ سکتا ہے کہ موجودہ لادینی تعلیم و تہذیب جس کا نصب العین سرتاسر حیاتِ دنیا کی زینت ہے اور اس نصب العین کی پشت پناہی کرنے والے نظامِ حکومت وسیاست کا سرے سے تختہ الٹ جائے۔ اور اس کی جگہ تعلیم و تمدن، حکومت وسیاست سارے ماحول پر عملاً دینی تصورات کی حکومت ہو جائے۔

باقی خالص دنیا پرستی کے موجودہ تعلیمی و تمدنی نظاماتؔ کے رہتے ہوئے ان کے لادینی اثرات کے انسداد کی تھوڑی بہت اگر کوئی صورت ہے تو باہمت اہلِ دین کے لئے تو یہ کہ اس تعلیم کے مقابلہ میں اپنی اولاد کو سرے سے جاہل رکھنا گوارا فرمائیں یا جو کچھ بری بھلی خالص دینی تعلیم دلا سکیں دلائیں خواہ اس کی بدولت دنیا میں اولاد کو کارخانوں کا مزدور ہی بننا پڑے لیکن اس مزدور کا اگر عمل نہیں تو انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ایمان سلامت رہ جائے گا۔

یا پھر دوسرے درجہ پر جن کو اتنی ہمت نہیں وہ اس موجودہ انگریزی تعلیم سے پہلے بقدرِ ضرورت دینی تعلیم اور اس کے ساتھ لیکن اس سے بڑھ کر دینی تربیت کا اہتمام کریں اور یہ اہتمام بالخصوص تربیت کا انگریزی تعلیم کے اختتام تک جاری رہے اور ولایت مآب (یورپ ریٹرن) بنانے کا نام تو کسی حال میں نہ لیں کیونکہ وہاں سے اپنے دین کو بس کوئی پیدائشی واقعی ولایت مآب ہی بچا لا سکتا ہے۔

دنیوی تعلیم سے پہلے بقدرِ ضرورت دینی تعلیم و تربیت کی عام صورت یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم اور ختمِ قرآن (ترجیحاً حافظہ ورنہ ناظرہ) کے بعد حضرت علیہ الرحمۃ کا سہ سالہ تلخیصاتِ عشرہ والا دینی تعلیم کا نصاب اس دینی تربیت کے اہتمام کے ساتھ

لہ جس میں ہندوستان و پاکستان کی سیاسی آزادی کے بعد بھی قطعاً ابتک کوئی فرق نہیں

پورا کرایا جائے جس کا نمونہ ہردوئی کا اشرف المدارس[1] ہے اور اس نمونہ پر جہاں جہاں اور جتنے زائد سے زائد مدارس قائم کئے جا سکیں کئے جائیں

اس لازمی دینی تعلیم اور تربیت کے معتد بہ رسوخ کے بعد اسکول و کالج میں اس شرط کے ساتھ داخل کیا جا سکتا ہے کہ قیام ہاسٹل میں ہرگز نہ ہو گھر ہی پر ہو اور سرپرست اس تربیت کی پوری حفاظت کریں جو اشرف المدارس یا اس کے ہم رنگ مدارس میں بچوں نے حاصل کی ہے یا ایسے ہی اسلامی اقامت خانے (ہاسٹل) قائم کئے جائیں جن میں اشرف المدارس کے رنگ کی دینی تربیت کا پورا انتظام ہو اور دنیوی تعلیم کے اس سارے دوران میں حضرت علیہ الرحمۃ کی کتابوں خصوصًا ملفوظات و مواعظ کا مطالعہ لازمًا بلاناغہ روزانہ کچھ نہ کچھ جاری رہے یا ایسے اقامت خانوں کا نگران روزانہ آدھ گھنٹہ لڑکوں کو جمع کر کے لازمًا سنا دیا کرے، باوجود اس کے پھر بھی اگر اسکول یا کالج میں کسی لڑکے کا رنگ بگڑتا دیکھے تو اس کو فورًا ہٹالے اور اس کے لئے جدید تعلیم کا خیال بالکل ہی ترک کر کے کسی اور معاشی راہ پر ڈال دے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے، انشاء اللہ وہ بھی دنیا میں محتاج و مضطر نہ ہوگا۔ گو کلکٹر و کمشنر نہ ہو، مگر خدا اور رسول کے حضور میں مسلمان کی حیثیت سے تو حاضر ہوگا۔ باقی جن قلوب میں دین کی اتنی بھی قیمت و وقعت نہیں اُن سے نہ خطاب ہے، نہ ان کی خدمت میں عرض کرنے کا کچھ حاصل فَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ، دنیا کی آنکھ بند ہوتے ہی دین کی آنکھ خود کھل جائے گی مگر اس وقت اس حسرت کے سوا کیا حاصل؟

---

[1] جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس کا اصل امتیاز خالص دینی تربیت ہے ۱۲

يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ پ الانعام

ہائے کیا اچھا ہوتا کہ ہم پھر دنیا میں واپس بھیج دیئے جائیں اور اگر ایسا ہو تو ہم اپنے رب کی آیات کی تکذیب پھر نہ کریں اور ضرور مومن ہو جائیں۔

انگریزی تعلیم اور اس کے اسکولوں کالجوں کی نسبت اوپر جو کچھ کہا گیا یہ انگریزی زبان و حکومت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو تعلیم بھی اسکولوں، کالجوں کے رنگ میں ہو گی اس کا اثر یہی ہو گا جیسا کہ ترکی اور مصر میں ہو رہا ہے اور اس اثر کے روک تھام کی ممکن تدابیر بھی وہی ہیں جو اوپر عرض کی گئیں۔

اُردو کی شرعی حیثیت

آخر میں چند سطریں اردو کے متعلق بھی لائق توجہ ہیں اوپر تعلیم سے متعلق جن تجدیدات و اصلاحات کو پیش کیا گیا وہ تو کم و بیش سب ہی ایسی ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ان کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اردو زبان کا معاملہ صرف پاکستان و ہندوستان کے مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے اور یہی نہیں کہ یہاں کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ اس زبان کو عموم و قبول حاصل ہے بلکہ اس نے اپنے اندر اسلامی و دینی علوم و فنون کا اتنا سرمایہ پیدا و منتقل کر لیا ہے جو نہ صرف مسلمانوں کی عام ضروری دینی تعلیم کے لئے کافی ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کے وسیع تر مطالعہ کا شوق رکھنے والوں کی تشفی کے لئے بھی عقلی و نقلی دونوں اعتبار سے بہت کچھ ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے اور راقم احقر کے نزدیک تو اردو کی اہمیت و فضیلت کے لئے یہی کافی ہے کہ مجدد وقت کی خدمات و تجدیدات کے قریب قریب سارے

خزانوں کی کنجی یہی ہے۔

غالباً اُردو ہی کے متعلق کسی کانفرنس میں اشتہار اور خاص خط کے ذریعہ حضرت سے شرکت کی درخواست کی گئی تھی۔ جواب میں تحریر فرمایا کہ

اس خط و اشتہار کو پڑھ کر قلب میں ایک حرکت پیدا ہوئی کہ اس خدمت میں کس قسم کی خدمت کا حصہ لیا جاوے، چونکہ متعارف خدمتوں کی نہ صلاحیت، نہ قوت اور غالباً ایک خاص خدمت کی طرف کسی نے توجہ بھی نہیں کی۔

ظاہر ہے کہ دینی اعتبار سے ہر چھوٹی بڑی چیز کی طرف توجہ تو وقت کے مجدّد اور جامع المجددین ہی کی ہو سکتی ہے بہرحال وہ خاص خدمت

اس کی تحقیق ہے کہ اس تحریک کا شرعی درجہ کیا ہے اس کی ضرورت بھی اس لئے محسوس ہوئی کہ اس وقت اس مسئلہ نے تمدن و قومیت سے آگے بڑھ کر مذہبیت کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس لئے خیال ہوا کہ اس کے متعلق ایک مختصر تحریر منضبط کر کے بھیج دی جائے۔

اس تحریر میں پہلے چند آیات اور حدیث و فقہ کی روایات نقل فرمائی گئی ہیں اور پھر ان سے اردو کی دینی و شرعی حیثیت و درجہ کے متعلق نتائج اخذ فرمائے گئے ہیں جو تلخیص و تسہیل کے ساتھ درج ذیل ہیں

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ زبانوں کے اختلاف و تنوع اور قدرت بیان کو خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و آیات و دلائل میں شمار فرمایا گیا ہے

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خلق السمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم۔ الآیۃ

اور قدرت بیان کی تعلیم کو بطور احسان و انعام جتلایا گیا ہے کہ الرَّحْمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان اس سے معلوم ہوا کہ تمام زبانوں کا استعمال بجائے خود جائز و مباح ہے۔ لیکن اسباب و خصوصیات عادیہ کی بناء پر جو بمنزلہ لوازم کے ہوگئی ہیں بعض زبانوں کو بعض پر فوقیت و فضیلت حاصل ہے چنانچہ عربی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کو تین وجہ سے محبوب رکھو ایک تو میں عربی ہوں، دوسرے قرآن عربی ہے اور تیسرے اہل جنت کی گفتگو عربی ہوگی،

احبوا العربیۃ لثلاث لانی عربیٌ والقرآن عربیٌ۔
وکلام اھل الجنۃ عربیٌ

اسی طرح مثلاً اعراب ردیہاتیوں کے بعض محاوروں کے استعمال سے منع فرمایا گیا ہے (لا تغلبنکم الاعراب علی اسم صلاتکم فانها فی کتاب اللہ العشاء وانہم یعتمون بحلاب الابل)

ان دونوں روایتوں میں غور کرنے سے صاف معلوم و مفہوم ہوتا ہے کہ کسی زبان کی فضیلت یا مذمت یا مدح و قبح کی بنیاد اس زبان کا کسی فضیلت یا مذمت کی چیز سے تعلق و تلبس ہے خواہ وہ چیز کوئی عین ہو یا معنی

فارسی کی فضیلت

عربی کے بعد فارسی کو اسی تعلق و تلبس کی بناء پر چند وجوہ سے فضیلت حاصل ہے ایک تو اس کا مقبولین کی جماعت سے تعلق، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ سورت جمعہ اور اس میں یہ آیت نازل ہوئی و آخرین منہم لما یلحقوا بہم

لوگوں نے سوال کیا کہ یارسول اللہ اس آیت میں کون لوگ مراد ہیں؟ اس وقت حضرت سلمان فارسی بھی حاضر تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے اوپر رکھا اور فرمایا کہ اگر ایمان ثریا میں ہوتا تو یہ لوگ اس کو ضرور حاصل کر لیتے۔

اس کی شرح لمعات میں ہے کہ مراد لما یلحقوا بھم سے عجمی یا فارسی حضرات تابعین رضی اللہ عنہم ہیں کیونکہ وہ صحابہ سے لاحق تھے اور اکثر تابعی اہل عجم میں سے ہی ہوتے ہیں اور علم و اجتہاد جس درجہ کا ان عجمی تابعین میں ظاہر ہوا دوسروں میں نہیں ہوا۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ فارسی کی اسی فضیلت کی بنا پر امام صاحب نے ایک وقت میں فارسی میں نماز کی قرآت کو جائز فرما دیا تھا۔ گو بعد میں رجوع فرمالیا لیکن رجوع فرمانے سے اصل بناء کا معدوم ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ یہ رجوع کسی اور قوی تر معارض کے سبب ہے نہ کہ اصل بناء کے ضعف کے سبب"

اسی طرح بخاری وغیرہ کی بعض روایات نقل فرمائی ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا فارسی الفاظ کا استعمال فرمانا ثابت ہے اور بعض روایات میں فارسی کے استعمال کی جو کراہت آئی ہے اس کی سند خود امام بخاریؒ نے واہی یا پوچ قرار دیا ہے اس کے علاوہ یہ کراہت جب ہے کہ کوئی فارسی کو عربی پر ترجیح دے

اسی طرح درمختار وغیرہ فقہ کی کتابوں میں فارسی کو عربی سے اقرب اور دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اس کی فصاحت کی بنا پر اشرف قرار دیا ہے بخلاف بعض دوسری زبانوں کے جن میں ثقل و تنافر بکثرت ہے۔

ان تمہیدی مقدمات سے حضرت علیہ الرحمۃ نے اردو کے متعلق جو تفریع فرمائی ہے وہ کم و بیش بالفاظہ ملاحظہ ہو۔

جس طرح فارسی کو عربی سے مناسبت ہونے کی بنا پر فضیلت حاصل ہے اور چونکہ اس فضیلت کا اثر احکام دینیہ میں بھی ہے اس لئے

وہ فضیلت دینیہ ہے اسی طرح بلاشبہ عربی وفارسی کے ساتھ ایسی ہی قوی مناسبت ہونے سے اُردو کو بھی دینی فضیلت حاصل ہے بلکہ فارسی کو تو عربی سے صرف مشابہت ہی کی مناسبت ہے اور اردو کو فارسی وعربی سے جزئیت کی مناسبت ہے فارسی وعربی کے جس قدر کثرت سے مفرد الفاظ اردو میں ہیں کسی زبان میں بھی نہیں، مفرد الفاظ ہی کیا بہت سے جملے ایسے ہوتے ہیں کہ بجز کا کی وغیرہ روابط کے پورا مادہ فارسی وعربی میں ہوتا ہے یہ تو فضیلت والی زبانوں سے اردو کا تعلق و تلبس ہوا

دوسری فضیلت اردو کی یہ ہے کہ دینی علوم خصوصًا صحیح ومقبول تصوّف کا اس میں غیر محدود وغیر محصور ذخیرہ ہے جس کو علماء ومشائخ نے صدیوں کی مشقت اور اہتمام سے جمع فرمایا ہے خدانخواستہ اگر یہ زبان ضائع ہو گئی تو یہ تمام ذخیرہ ضائع ہو جائے گا۔ بالخصوص عام مسلمانوں کے لئے تو علمِ دین کا کوئی ذریعہ ہی نہ رہے گا۔ کیونکہ عربی نہ جاننے کی وجہ سے ان کا استفادہ اردو ہی پر موقوف ہے اور کیا اس طرح ضائع ہوتے دیکھنا اور انسداد نہ کرنا شرعًا جائز ہے؟

ایک اور خصوصیت اردو کی اس کا سلیس وآسان ہونا ہے یہ بھی بڑی فضیلت ہے کیونکہ حصول دین کے لئے زبان کی آسانی اور تیسیر کو اللہ تعالیٰ نے بطور احسان کے ذکر فرمایا ہے جیسا کہ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وقال تعالیٰ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ۝ وغیرہ آیات سے ظاہر ہے۔

غرض اس وقت اردو زبان کی حفاظت دین کی حفاظت ہے اس بنا پر

یہ حفاظت حسب استطاعت واجب وطاعت ہے اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت کرنا معصیت وموجب مؤاخذۂ آخرت ہوگا۔

واللہ اعلم۔ (النور رمضان ۱۳۵۸ھ)

آخر میں بلکہ اول و آخر زیادہ یاد رکھنے کے قابل باتیں دو ہیں ایک یہ کہ جن علوم و فنون کا تعلق انسان کی خالص دنیاوی ومادی وحیوانی زندگی کی حاجات یا آرائش ونمائش سے ہو وہ دین کی نگاہ میں سرے سے علم ہی نہیں علم وہی ہے جو انسان کے انسانی مقصدِ وجود اور اس کی تکمیل کی راہ دکھلائے۔ ثانیاً اس زمانہ میں پتھر کے بتوں سے بڑھ کر جو نئے نئے بت تراش لئے گئے ہیں ان میں سے ایک علم برائے علم ہے یعنی علم وفن کو بذاتِ خود ایک صنمِ اعظم بنا لیا گیا ہے غیر ضروری سے غیر ضروری شئے کی تحقیقاتِ عالیہ (ریسرچ) بھی فی نفسہٖ مطلوب ومعبود بن گئی ہے۔ اگر فردوسی کی قبر کا پتہ لگا کر اس پر بھی کوئی ایک مقالہ لکھ ڈالے تو وہ بھی ڈاکٹر یعنی علم کا مستند محقق وماہر بن جا سکتا ہے۔

سو خوب معلوم رہنا چاہئے کہ توحید کامل کے دین (اسلام) میں خدا یا خدا کی رضا جوئی کے سوا کسی شئے کو بھی مطلوب ومقصود بنانا اگر جلی نہیں تو خفی شرک یقیناً ہے حتیٰ کہ خود علم دین بھی محض خدا شناسی اور خدا کی رضا طلبی ہی کے لئے مطلوب ہے نفس دینی معلومات کا جان لینا یا مسائل واصطلاحات کا یاد کر لینا قطعاً مقصود بالذات نہیں۔ بالفاظ دیگر علم علم کے لئے نہیں بلکہ علم عمل کے لئے مطلوب ہے، خواہ یہ عمل قلب کا ہو یا قالب کا۔ ایمانیات واعتقادیات تک کا فقط جان لینا مطلق نافع نہیں ان کا بھی اصل مطلوب ماننا یعنی قبول ویقین کرنا ہے جو قلب کا عمل ہے علم بلا عمل یا علم غیر نافع سے تو صراحۃً پناہ مانگی گئی ہے۔

ماننے کے دو درجے

ماننے کا بھی ایک نرا اعتقادی درجہ ہوتا ہے جیسا کہ عام مسلمانوں کا اور ایک حالی درجہ ہے جس میں قلب کا قبول ویقین پوری زندگی کا حال بن جاتا ہے اور زندگی کے سارے اعمال وافعال حرکات وسکنات میں ابھر آتا ہے کامل یا پورا علم پوری طرح کا ماننا ہے یعنی خدا کا تعلق یا اس کی رضا وناراضی، محبت وخشیت قلب کا ایسا حال بن جائے کہ نہ اختیار بھر طاعت میں کمی ہو اور نہ دیدہ دانستہ معصیت پر جرأت، العلم والخشیۃ نام کے وعظ میں ارشاد ہے کہ

علم کی دو قسمیں

اور یہی قسمیں خشیت میں بھی جاری ہیں ایک عقلی اور ایک حالی۔ عقلی کو کبھی اعتقادی اور حالی کو طبعی بھی کہتے ہیں پس جہاں علم اعتقادی ہے وہاں خشیت بھی اعتقادی ہے اور جہاں علم حالی ہے جس کو کہا ہے کہ

ع علم گر بر دل زنی یارے بود

وہاں خشیت بھی حالی ہو گی۔ مگر کمال دین کے لئے خشیت اعتقادی کافی نہیں بلکہ خشیتِ حالی کی ضرورت ہے اور اسی درجہ کمال کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمنٌ یہاں محض ایمان (یا علم وتصدیق) اعتقادی مراد نہیں بلکہ ایمان کامل مراد ہے جس کے ساتھ خشیت حالی ہوتی ہے۔ اب یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا کہ ہم بہت مسلمانوں کو زنا کار دیکھتے ہیں جواب یہ ہے کہ یہاں مراد مومن اعتقادی نہیں مومن حالی ہے

کون علم میراث انبیاء ہے

ایسا علم جو خشیت سے خالی ہو علم ہی نہیں ۔ صاحبو! علم کو میراث انبیاء کہا جاتا ہے تو اب دیکھ لو کہ انبیاء کی میراث کونسا علم ہے کیا انبیاء کا علم بھی نعوذ باللہ ایسا ہی تھا جس میں محض مسائل اور اصطلاحات کا تلفظ ہو ۔ اور خشیت کا نام نہ ہو ہرگز نہیں ، وہاں تو یہ حالت تھی کہ جتنا علم بڑھتا تھا اتنی ہی خشیت بڑھتی تھی ، حدیث میں ہے کہ انا اعلمکم باللہ واخشاکم للہ ط میں تم سب سے زیادہ خدا کو جاننے والا اور تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اب ہماری حالت یہ ہے کہ علم حاصل کرتے ہیں پھر پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اسی کو مقصود سمجھتے ہیں ، تحصیل خشیت کا اہتمام نہیں کرتے حالانکہ غیر مقصود کو مقصود بنا لینا مکروہ ہے ۔ فقہاء نے اس راز کو خوب سمجھا ۔ فرماتے ہیں کہ ایک وضو سے جب تک نماز نہ پڑھ لی جائے دوسرا وضو کرنا مکروہ ہے ، ظاہر میں تو شبہ ہوتا ہے کہ فقہاء نے ایک عبادت کو منع کیا ۔ مگر یہ لوگ حکمائے امت ہیں واقعی خوب سمجھے کہ جب اس نے غیر مقصود کو اداتے مقصود سے پہلے مکرر کیا تو غیر مقصود کو مقصود بنا لیا اور یہ حد سے تجاوز ہے اسی طرح تعلیم وتعلم کو مقصود بالذات سمجھ لینا بھی حد سے تجاوز ہے ۔

غرض دین کی نگاہ میں حقیقی و کامل علم وہی ہے جو عمل واثر سے خالی نہ ہو ، یعنی جو اطاعت کا باعث وموجب اور معصیت سے مانع وحاجب ہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

اَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ مَعَاصِيْكَ ۔ اس سے معلوم ہوا کہ خشیتِ مطلوبہ وہی ہے جو گناہ سے حائل (مانع) ہو جائے پس جس کو یہ حیلولت حاصل نہیں ہے اس کو خشیت مطلوبہ ہی حاصل نہیں اور جب خشیت ہی نہیں تو علم حاصل ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں، گو کتابی علم حاصل ہو، مگر شریعت میں جو علم مطلوب ہے وہ محض کتابی نہیں بلکہ وہ علم مطلوب ہے، جو دل میں اتر جائے ۔

غرض مطلوبِ شرعی وہی علم ہے جو اپنے اثر کے ساتھ ہو جیسے تلوار وہی مطلوب ہے جس میں کاٹ بھی ہو، ورنہ برائے نام تلوار ہوگی لہٰذا جو علم اثر سے خالی ہو وہ مطلوب ہی نہ ہوگا خوب سمجھ لو اسی کو کہتے ہیں کہ

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت — زنگِ گمراہی ز دل بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند — خوفِ خشیت در دلت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز ولا یجوز — خود ندانی تو کہ حوری یا عجوز

اور جب تمہارے علم کی یہ حالت ہے کہ سوائے یجوز ولا یجوز (جائز و ناجائز) کے کچھ خبر نہیں اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں تو پھر اس پر بے تکلف اس خطاب کو مرتب کر سکتے ہیں، کہ

"ایہا القوم الذی فی المدرسۃ
کل ما حصلتموہ وسوسہ"

علم نبود غیر علم عاشقی — ما بقی تلبیس ابلیس شقی

مگر ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ علم عاشقی سے کیا مراد ہے؟

علم دیں فقہ است قرآن و حدیث — ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث

یہ اس واسطے کہہ دیا ہے کہ تاکہ معلوم ہو جائے کہ علم عاشقی سے مراد علم دین ہے کیونکہ ایمان ہی عشق ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط اور جب ایمان عشق ہے تو اسی کا علم عاشقی ہے[1]"

دین کے مدرسوں کا بھی ایسا علم جو عشق واثر سے خالی اور صرف مسائل و اصطلاحات کا حفظ ہو جب وہ تک "وسوسہ اور تلبیس ابلیس" کے سوا کچھ نہیں تو دنیا کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علوم وفنون اور تحقیقاتِ عالیہ (ریسرچ) کو علم کا نام دینا حقیقی علم کی نظر میں زنگی کو کافور کا نام دینے کے سوا کیا ہے۔

[1] یہ سب اقتباسات العلم والخشیۃ ہی سے ملخصًا ماخوذ ہیں۔

تجدید تبلیغ

جس طرح تعلیم کے صحیح معنیٰ انسان کو اس کے مقصدِ وجود اور اس مقصد کی تحصیل و تکمیل کا علم عطا کرنا ہے اسی طرح تبلیغ کے معنی اس علم کو حاصل کرکے دوسروں تک پہنچانا ہیں۔ حضرات انبیاء اور حضرت خاتم الانبیاء نبی الاسلام علیہ التحیۃ والسلام کو انسان کے مقصد وجود اور اس کی تحصیل و تکمیل کے وسائل کا علم براہِ راست اللہ تعالیٰ سے وحی و تنزیل کے ذریعہ عطا ہوا ہے، پھر تمام انبیاء اور نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم آخر دم تک اسی کو دوسرے تک پہنچاتے رہے، در اصل رسول اللہ یا پیغمبر خدا کی لفظی و معنوی حقیقت اور نبوت کا بنیادی فریضہ و منصب مبلغ ہونا ہی ہے یعنی وہ اللہ کے رسالہ یا پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔

آخری رسول نے اپنے آخری حج ۔ حجۃ الوداع ۔ کے موقع پر امت کو وداع (رخصت) فرماتے ہوئے رسالت و نبوت کے اسی منصب و فریضہ کی اہمیت تبلاکر اس کی کماحقہ ادائی پر اس طرح صحابہ رضوان اللہ علیہم کو گواہ فرمایا کہ دیکھو کیا میں نے (خدا کا پیغام) پہونچا دیا [۱] نیز تم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں میری نسبت سوال ہوگا تو کیا جواب دوگے؟ سننے والوں نے گواہی دی کہ ہم عرض کریں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض پورا فرما دیا۔ بندوں کی اس گواہی پر آسمان کی طرف انگلی کر کے اشارہ فرما کر خود حق تعالیٰ کو تین بار گواہ فرمایا کہ اے اللہ آپ بھی گواہ رہیں اے اللہ آپ بھی گواہ رہیں، اے اللہ آپ بھی گواہ رہیں [۲] ساتھ ہی اپنے بعد

---

[۱] اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ [۲] اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ

امت کو یہ فریضہ سپرد فرماتے ہوئے حکم دیا کہ حاضر غائب کو پہنچاتا رہے[1]۔ یہی معنیٰ ہیں امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے امت مبعوثہ ہونے کے کہ تبلیغ یا پہنچانے کی جو خدمت حضرات انبیاء کے سپرد انفرادی طور پر ہوئی تھی وہ ختم نبوت کے بعد ساری امت پر مجموعی حیثیت سے عائد فرما دی گئی ہے۔

اس بناء پر حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ کی نگاہ تجدید میں یہ پہنچانا یا تبلیغ نہ صرف دین کی تمام دیگر علمی و تعلیمی خدمات سے اہم و اقدم ہے بلکہ دیگر خدمات علم کی جو کچھ بھی قیمت و اہمیت ہے وہ تبلیغ ہی کے اسباب و وسائل ——— ہی کے درجہ میں ہے ——— جابجا فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت و تشریف آوری کا اصل مقصد احکام دین کی تبلیغ تھی باقی جو کچھ ہے سب اسی کی تاکید و اعانت کے لئے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء نہ مدرسے کھولنے تشریف لائے اور نہ کتب خانے قائم فرمانے، بلکہ وہاں تو بالذات نفس نوشت و خواند تک مامور و مطلوب نہ تھی نہ متعارف علوم و فنون یا نوشت و خواند کا، وحی یا انبیاء علیہم السلام کی زبان میں علم نام ہے، نہ ان علوم و فنون کو حضرات انبیاء یا حضرات صحابہ کے کمالات و درجات کی فہرست میں کوئی مقام حاصل ہے۔

تاہم درس و تدریس، تالیف و تصنیف وغیرہ سب چیزیں در اصل حسب ضرورت چونکہ تبلیغ ہی کے مقدمات و وسائل ہیں اس لئے یہ بھی واجبات تبلیغ میں داخل ہیں اور اس لئے حقوق العلم کے عنوان سے مستقلاً اور مواعظ وغیرہ میں متفرقاً ان کی اصلاح و تجدید کا بتفصیل حق ادا فرمایا گیا ہے البتہ وسائل کو مقاصد

---

[1] فلیبلغ الشاھد الغائب، یہ سب اجزاء بخاری شریف، مشکوٰۃ شریف کی روایات حجۃ الوداع سے ماخوذ ہیں۔

بنانے کی غلطی و غلو اس باب میں بھی اتنا ہوا کہ بالعموم مدارس و مدرسین، علماء و مصنفین کی نظر اصل مقصد سے ہٹ گئی۔ اس لئے ایک نہیں، آداب التبلیغ الدعوة الی اللہ، محاسنِ اسلام وغیرہ مواعظ میں براہ راست اور دیگر مواعظ و مضامین کے سلسلہ میں جابجا بکثرت احکام دین کی تبلیغ و اشاعت اور دعوت الی الحق کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے اور خود حضرت علیہ الرحمۃ کی ساری تصنیفات و تالیفات سارے مواعظ و ملفوظات کا محور تو کہنا چاہیئے کہ احکام کی تبلیغ و اشاعت اور حق کی طرف دعوت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا خاص طریق پند و نصیحت یا وعظ و تذکیر تھا اور یہی حضرت علیہ الرحمۃ کے نزدیک تبلیغ و دعوت کا سب سے عام اور انفع طریق ہے اور جب تک حضرت کی قوت نے سفر کی اجازت دی کثرت سے اور زیادہ تر وعظ ہی کے لئے سفر فرماتے رہے اور اس کو مقبولیت اور نافعیت ہر طبقہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس درجہ بخشی تھی کہ کئی کئی گھنٹوں کے وعظ میں بھی سیری نہ ہوتی تھی اور مشکل ہی سے کوئی متنفس اپنی جگہ چھوڑتا۔ پھر جتنی کثیر تعداد میں قلم بند ہو کر ان مواعظ کی حق تعالیٰ نے حفاظت فرمادی اس کی نظیر امت کی ساری تاریخ میں نظر نہیں آتی اور نفع کا تجربہ تو آج بھی ان کو پڑھ کر جس طبقہ کے جس فرد کا جی چاہے کر سکتا ہے مسلمان ہی نہیں غیر متعصب غیر مسلم بھی اگر کچھ بھی طلب صادق اور ذوقِ سلیم ہے تو انشاء اللہ نہ صرف یہ کہ بے ختم کئے چھوڑنے کو جی نہ چاہے گا۔ بلکہ چند وعظ ہی پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے تعلق و طاعت کی ایک نئی حیات و حرکت محسوس کرے گا۔ راقم ہذا یہ محض خوش اعتقادی کی بناء پر نہیں بلکہ بارہا کے تجربات اور وہ بھی زیادہ تر نئی تعلیم کے آزاد طبائع پر تجربات کے بعد عرض کر رہا ہے۔

.....

یہ مواعظ دراصل دعوت و تبلیغ ہی کا علمی و عملی ذخیرہ ہیں

حضرت کی قریبًا ساری اصلاحی و تجدیدی خدمات کی زبان اُردو ہے اگر اردو کی حقارت یا معاصرت کا حجاب مانع نہ ہو تو سب سے زیادہ حضرات اہل علم کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ حضرت کے مواعظ کو معمولی قصہ گو واعظوں کا وعظ یا محض کسی لفاظ خوش بیان کی تقریر ہرگز ہرگز نہ تصور کریں۔ وہ دراصل پورے دین اور اس کے سارے ابواب و احکام کی تبلیغ و دعوت کا نہایت ہی محققانہ حکیمانہ و عالمانہ اور مجتہدانہ و مجددانہ ذخیرہ ہیں اور اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط میں جس حکمت و موعظت حسنہ اور جدال احسن کے عنوان سے تبلیغ و دعوت کے جن تین طریقوں کا ذکر فرمایا گیا ہے ان سب کا نہایت جامع اور دین کے مبلغ و داعی کے لئے قابل تقلید نمونہ ہیں۔ اس لئے جہاں تک دعوت و تبلیغ کا تعلق ہے حضرت نے صرف اس کے اصول و حدود کی اصلاح و تجدید ہی نہیں فرمائی بلکہ مواعظ کی شکل میں اس اس اصلاح و تجدید کا کامل و مکمل عملی سرمایہ امت کے ہاتھ میں رکھ دیا ہے حتیٰ کہ احقر کے نزدیک تو موقع و محل کے اعتبار سے اجمال و تفصیل اور جزئی تغیر و تبدل کے ساتھ انہی کا اعادہ نہ صرف انشاء اللہ دین کے ہر شعبہ میں امت کی اصلاح کے لئے کافی و وافی ہے بلکہ غیروں کو بھی سبیل رب کی طرف بلانے اور مائل کرنے میں نہایت کارگر اور نافع ہے امتحان و تجربہ شرط ہے انشاء اللہ خود ہی اطمینان ہو جائے گا۔

تبلیغی حکمت کی ایک عجیب مثال

سینکڑوں ہزاروں تبلیغی و دعوتی مواعظ کے علاوہ متعارف تبلیغ یا تبلیغ کی

وقتی ضرورتوں سے بھی صرفِ نظر نہیں فرمایا گیا، فتنۂ ارتداد کے زمانہ میں بنفس نفیس ایسے مقامات کا دورہ فرمایا جہاں اس کا اندیشہ قوی تھا اور وہاں بھی جیسے مجتہدانہ و مجددانہ طرز سے کام لیا اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ و مثال سے ہو سکتا ہے جس کا یقین بھی اُس جماعت و مسلک کے کسی فرد کی جانب سے نہیں کیا جا سکتا ہے جس کی طرف حضرت کی نسبت ہے اور جو اپنے مخالفوں میں اپنی بدعات دشمنی ہی کی بدولت زیادہ مبغوض و بدنام ہے بھلا اس کا کون یقین کر سکتا ہے کہ جماعت دیوبند کے ایک مسلم و مستند عالم بلکہ امام نے کسی موقع پر کسی شخص کو تعزیہ داری کی تاکید فرمائی ہو گی کہ "دیکھو تعزیہ بنایا کرو"

گجنیر نام مقام کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ آریوں کے اثر سے وہاں کچھ لوگ مرتد ہو جانے والے ہیں وہاں پہنچ کر حضرت نے اول ان کے سرداروں سے گفتگو کو مناسب تصور فرمایا، معلوم ہوا کہ نتھو سنگھ اور ادھار سنگھ[1] دو بڑے سردار ہیں ان دونوں سے حضرت نے الگ الگ ملاقات فرمائی تاکہ آزادی سے ہر ایک کے خیالات معلوم ہو سکیں اور گرمی کا زمانہ تھا ان کو شربت بھی پلانا چاہا مگر انہوں نے عذر کر دیا کہ ہم مسلمانوں کے ہاتھ کا کھایا پیا نہیں کرتے اور بھی ایسی ہی بالکل اسلام کے کے خلاف باتیں ان لوگوں میں رائج تھیں مثلاً سر پہ چوٹی وغیرہ، ختنہ صرف اس کے یہاں ہوتا تھا جو برادری کو کھانا دے سکے۔

اور جہل کا یہ حال کہ پوچھا تم ہندو ہو؟ تو کہا نہیں، مسلمان ہو؟

---

[1] سرکاری کاغذات میں تو ان کا نام نتھو خان اور ادھار خان تھا مگر عام طور سے ان کو کافرانہ نام نتھو سنگھ اور ادھار سنگھ ہی سے پکارا جاتا تھا۔

جواب دیا نہیں ۔ پھر آخر کیا ہو؟ تبلایا نو مسلم! گفتگو کرنے پر نتھو خاں نے تو کہا کہ آریہ مذہب میں نیوگ کا ایسا گندہ حکم ہے کوئی بھلا مانس اس مذہب میں جانا گوارا نہیں کر سکتا ۔ اور ادھار سنگھ نے کہا کہ ہم تو تعزیہ بناتے ہیں ہم ہندو کیوں بننے لگے ۔

اب حضرت مجدد کا حکیمانہ و مجتہدانہ جواب ملاحظہ ہو فرمایا "دیکھو تعزیہ ضرور بنایا کرو" بعض ہمراہیوں کو اس پر اشکال بھی ہوا تو فرمایا کہ ان کے لئے یہ بدعت کفر کا وقایہ ہے (اشرف السوانح جلد سوم ص ۳۳۲)

یعنی کم از کم باقاعدہ کافر یا آریہ ہونے سے بچے رہیں گے، اور اصلاح ہو سکے گی ۔

بستی نظام الدین کی تبلیغی بنیاد میں حضرت کی شرکت بابرکت

اس تبلیغی خدمت کی بنیاد میوات کے علاقہ میں پڑی حضرت علیہ الرحمۃ کے حکم و ہدایت کے تحت بھی بعض خدام وہاں اس پر مامور تھے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد بزرگوار اور بڑے بھائی سے اس علاقہ کے لوگ پہلے سے ارادت و عقیدت کا تعلق رکھتے تھے ۔ اس لئے مولانا موصوف کا قدرۃً خاص اثر تھا جن کے ہاتھوں آگے چل کر بتوفیق اللہ بڑا کام ہوا ۔ اشرف السوانح میں حضرت اقدس مولانا تھانوی علیہ الرحمہ کے متعدد مکتوبات منقول ہیں جن میں اس خدمت کے خادموں کو بہ شہادت قلب کامیابی کی بشارت دی گئی ہے ایک عریضہ کے جواب میں ارشاد ہے کہ :- حالات سے مجھ کو بہت کچھ امیدیں ہوئیں اور مجھ کو اس سے پہلے بھی صرف آپ جیسے مخلصین کا جانا اور پھر مولوی محمد الیاس صاحب کا ساتھ ہو جانا یقین کامیابی کا دلاتا تھا ۔ علم غیب تو حق تعالیٰ کو ہے مگر میرا قلب شہادت دیتا ہے کہ انشاء اللہ سب وفود سے زیادہ نفع آپ صاحبوں سے ہوگا ۔ بخدمت مولوی الیاس صاحب سلام مسنون [۱]

---

[۱] اشرف السوانح جلد سوم ص ۳۳۵

مکتوب الیہ نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ

"ان ارشادات کا مقصد صرف یہ خیال میں آتا تھا کہ حوصلہ افزائی فرمائی جا رہی ہے۔ لیکن جب تقریباً ڈیڑھ سال بعد ایک جماعت نے تمام تبلیغی علاقہ کا مفصل حال شائع کیا اور اس روئداد میں اس کی بھی تصریح تھی کہ تحصیل پلول جہاں احقر اور مولوی عبدالمجید صاحب حسب حکم و ہدایت حضرت والا) کار تبلیغ انجام دے رہے تھے اول نمبر کامیاب رہی تب معلوم ہوا کہ یہ بشارت و پیشین گوئی تھی، جو بالکل صحیح ہوئی"

اب اشرف السوانح میں ان چیزوں کو پڑھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ خود راقم ہذا سے ایک موقعہ پر خود حضرت مولانا الیاس صاحبؒ نے جو یہ فرمایا تھا کہ حضرت ہی کی دعاؤں کی یہ برکت ہے" اس کا کیا مطلب تھا۔ موقع یہ تھا کہ احقر بستی نظام الدین حضرت موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ غالباً دوسرے دن ہی قصبہ نوح میں اس تبلیغی سلسلہ کا بڑا سالانہ اجتماع تھا جس میں باصرار ساتھ چلنے کا حکم ہوا دو تین دن مسلسل حضرت کی معیت میں تبلیغی خدمات کے معائنہ و مشاہدہ کی سعادت حاصل رہی۔ دہلی سے سیدھے تھانہ بھون حاضری تھی۔ جب رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ حضرت مولانا (تھانوی) کی خدمت میں سلام عرض کرنا۔ یہاں کے کام کا ذکر کرنا اور جو کچھ فرمائیں مجھ کو ضرور لکھنا چنانچہ سلام رسانی کے بعد راقم احقر نے بستی نظام الدین کی بنگلہ والی مسجد سے لیکر قصبہ نوح تک کے جو تاثرات تھے مختصراً عرض کئے فرمایا اصل کام تو یہی ہے"

کچھ مؤدبانہ معروضات

نگاہ تجدید میں کام کی اس درجہ اہمیت و عظمت کے باوجود کام کا طریق حضرت کے مذاق و معیار سے مختلف تھا۔ حضرت کا خاص مذاق ہر چھوٹے بڑے کام میں

قدم قدم پر توازن و توسط حدود اور اعتدال کا غایت اہتمام[1] تھا۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رنگ بڑا عاشقانہ تھا۔ احقر کو جب زیارت ہوئی اسی کا تجربہ ہوا لیکن بڑوں کی ہر بات نقل و اتباع کی نہیں ہوتی، عشاق میں جو چیز "جوشش عشق است و نے ترکِ ادب،، ہوتی ہے اس کی نقالی بارہا "زشت باشد روئے نازیبا و ناز،، ہو جاتی ہے

مثلاً تبلیغی گشت کے بعض مواقع پر دیکھا کہ لوگوں کو زبردستی پکڑ پکڑ کر مسجد کی طرف گھسیٹا جاتا ہے کسی کی کمر میں ہاتھ ڈالا جا رہا ہے کسی کے گلے میں کہ بھائی چلو بس اسی وقت سے نماز شروع کر دو، کسی نے نہانے کا عذر کر دیا تو زبردستی کنوئیں پر لے جا کر نہلایا جا رہا ہے۔ بعضے اس سے بچنے کے لئے بھاگتے اور منہ چھپاتے ہیں بعضوں کی زبان سے سخت کلمات نکل جاتے ہیں یہ سب وہی فاما من استغنیٰ والوں کے ساتھ فانت لہ تصدّیٰ والی نازیبا صورتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کے لئے ناپسند فرمائیں حالانکہ حضورؐ کے ہاں کسی نازیبا غلو کا نام بھی نہ تھا

غلو اور حدود ناشناسی کی ایسی مثالوں کو بعض اکابر جماعت سے کبھی کبھی راقم ہٰذا عرض بھی کرتا رہا اور ان کی توجہ سے الحمد للہ کہ اب بہت کچھ ان میں اصلاح ہے البتہ ایک دوسری نوع کی بالکل تازہ مثال عین ان سطور کی تحریر کے دوران میں علم میں آئی ایک اچھے طالب صادق لیکن ان پڑھ عامی جو مہینوں سے اس جماعت سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں جمعرات کے شبانہ اجتماعات میں حاضر ہوتے ہیں ایک ضرورت سے اتفاقاً میرے پاس آگئے، تجربہ ہے کہ ایسے عامیوں کی نماز میں بالعموم بہت کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کو معلوم کر کے درستی کی طرف متوجہ کر دینے کی عادت ہے ان سے بھی کہا کہ میاں الحمد اور ایک دو سورتیں یاد ہوں ذرا سناؤ، الحمد پڑھا تو مالک یوم

---

[1] جس کا پورا اندازہ جامع المجددین کے ملاحظہ سے فرمایا جا سکتا ہے

الدین کے بعد کنعبد یعنی اِیَّاسرے سے ندارد اور سورت کے متعلق کہا کہ انا اعطینا دانا اعطینا) یاد ہے۔

انا اللہ! نمانہ دین کی ساری عمارت کا ستون ہے ۔ اس کا معاملہ تو ایسا ہے کہ جو عامی آدمی ایک مرتبہ بھی اس جماعت یا اس کے کسی خادم کے قریب آجاتا تو کلمہ کی تعلیم و تصحیح کے بعد ہی سب سے مقدم کام اس کی نمانہ کی خامیوں کا امتحان لے کر اس کی درستی و تاکید کا اہتمام تھا۔

یقیناً ایسی مثال استثنائی اور اتفاقی بھول چوک ہی کی ہوگی اور گو ہے یہ بڑی ہی رونگٹے کھڑے کر دینے والی بھول تاہم اس کے مقابل یہ ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ ایک دو نہیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں الحمدللہ ایسی مثالیں ملیں گی جن کو سجدہ نصیب نہ ہوتا تھا وہ اس جماعت کی برکت سے پانچوں وقت مسجد و جماعت کے پابند ہیں اور بہت سے شب بیداری کے بخت بیدار سے ہمکنار۔

اصل یہ ہے کہ طول و عرض کے ساتھ کام کے عمق و رسوخ یا گہرائی اور پختگی پر مزید توجہ کی ضرورت ہے، گشت کی صورت بھی ایک آندھی کی سی ہوتی ہے کہ آئی اور نکل گئی۔ جب تک مسلسل و مستقل انتظام و سعی سے خود گشت کے مقام پر مقامی جماعت ایسی تیار نہ ہو جائے جس میں اس کام کی لگن اور سنبھالنے کی صلاحیت ہو اس وقت تک ایسے سرسری گشتوں کی خالی تکرار سے کوئی پائدار نفع نہیں ہوتا البتہ خود گشت کرنے والوں یا مبلغین کے حق میں ایسے گشتوں کو جو متحرک خانقاہ خیال کیا جاتا ہے درست ہے اور دینی شعور کو بیدار کرنے کا کارگر ذریعہ ہے بشرطیکہ اس شعور و بیداری سے کام لینے کے لئے ان کی اصلاح کی ضروری تدابیر بھی ساتھ ساتھ جاری رہیں لیکن یہ تو بہرحال عقلاً و نقلاً کسی طرح درست نہیں کہ خود مبلغین کے اس نفع کے ساتھ دوسروں کے اس نفع و اصلاح کی ممکن صورتیں

اختیار نہ کی جائیں۔

نفس طول وعرض کی افادیت میں بھی کلام نہیں، حق بات کا ایک بار بھی کانوں میں پڑجانا بڑی بات ہے لیکن ثمرات تو گہرائی اور پختگی ہی سے پیدا ہوتے ہیں، خود اس تبلیغی نظام کے بڑے رکن رکین بلکہ مقدمۃ الجیش نے ایک موقع پر بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا تھا کہ صحابہؓ گنتی کے تھے اور تمام دنیا پر بھاری تھے اور ہم لاتعداد ہیں اور زمین پر بھاری ہو رہے ہیں[1]، یہ زمین وآسمان کا فرق وہی رسوخ وعمق کے فرق کے سوا کیا ہے

غرض کیف ورسوخ اور حدود اعتدال کی رعایات کے ساتھ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی جو تبلیغی تجاویز واصلاحات پیش کش کتاب میں پیش کی گئی ہیں اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو انشاء اللہ سونے میں سہاگہ ہوگا۔ اور اس تبلیغی خدمت کا کمی کے ساتھ کیفی فیض خصوصًا بہت بڑھ جائیگا۔ جماعت کے بعض اچھے اہل اعتدال حضرات کی خدمت میں یوں بھی جب کبھی عرض کرنے کا موقع آیا تو مسرت ہوئی کہ وہ بھی بعض ایسی باتوں کو محسوس اور اصلاح کی سعی فرمارہے ہیں۔

ورنہ فہم احقر میں تو ان باتوں کے باوجود اس وقت دین کی جتنی متعدی وجماعتی خدمات ہو رہی ہیں شاید ہی کوئی اس سے اہم واقدم ہو، خصوصًا ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں ہم نام کے مسلمانوں کے نام کے بھی بدل جانے کے جو حالات درپیش ہیں ان کی روک تھام کے لئے اس تبلیغی نظام سے بڑھ کر ہمارے حق میں حق تعالیٰ کی کوئی رحمت نظر نہیں آتی، پھر بھی اس سے انتفاع میں اپنی غفلت دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ آخری مہلت اور اتمام حجت نہ ہو۔ اعاذنا اللہ

آج کی دنیا میں دین کے لئے سب سے بڑا فتنہ سیاست ہے اچھے اچھے اہل علم واخلاص افراد اور جماعتوں کو دیکھا جاتا ہے کہ رسالت ونبوت کی ساری تبلیغی حقیقت

---

[1] دیکھو آگے انقلاب عام وتام ص ۲۵۶

ومعنویت کو سیاست وحکومت کے آشوب وطغیان میں اس طرح کھویا جا رہا ہے
کہ گویا پیامبر اسلام کا اصل پیام کوئی خاص سیاسی نظام اور اس کی حکومت کا قیام ہی
تھا۔ نیت کچھ ہو نتیجہ یہی ہو رہا ہے کہ اپنے پرائے سب کی نظر میں اسلام اور مسلمان
بھی اسی دنیا کی سیاست وحکومت کے لئے لڑنے مرنے والی کوئی آئیڈیالوجی اور
اسی کی حامل جماعت ہے یہ نتیجہ و اثر بالکل نفسیاتی ہے جو دین کی روح کے ساتھ نادان
دوستوں کی بڑی دشمنی ہے۔

آخر کچھ تو بات تھی کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کی بھی دعوت میں
قیام حکومت یا حکومت وقت سے مقابلہ کو براہ راست شریک نہیں فرمایا گیا، صراحۃً
امر ہوا تو صرف قتال وجہاد فی سبیل اللہ کا یعنی اللہ کی راہ پہ چلنے چلانے میں اگر ظلم
وزیادتی کے ساتھ کوئی مزاحمت کرے تو اس کو دور کرنے کے لئے تن من دھن سب
کی بازی لگا دو، وہ بھی جہاد کے خاص شرائط کے اجتماع اور خاص حدود کی پابندیوں کے
ساتھ، پھر اللہ تعالیٰ کی نظر میں اگر ہمارا "ایمان وعمل صالح" اس درجہ کا ہوا کہ زمین پر اپنی
جانشینی (خلافت) کی سعادت وعزت سے نوازا جائے تو غیبی نصرت اس کے شہادتی
اسباب بھی فراہم فرما دیگی۔ اسی بناء پر احقر اسلامی یا الٰہی حکومت کے داعیوں سے عرض
کیا کرتا ہے کہ حصول حکومت کا دعویٰ ودعوت مقصود بالذات بالکل نہیں بلکہ ایمان
وعمل صالح کے عند اللہ معلوم ومقرر درجہ پر موعود ہے وہ بھی حکومت نہیں خلافت
کما قال اللہ تعالیٰ ـ وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحٰت لیستخلفنھم
فی الارض (الاٰیہ) بالذات مامور ہم صرف ایمان وعمل صالح کے تمام ابواب واحکام
کے موافق اپنے ظاہر وباطن کو آراستہ کرنے اور دوسروں کو حال وقال سے اس کی طرف
بلانے کے ہیں

نبوت ورسالت کی اصل دعوت ایمان وعمل صالح کے ساتھ حکومت وسیاست

کی دعوت کو خلط ملط[1] کرنے کے مفاسد کو دیکھ دیکھ کر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کی اس عہد میں سب سے بڑی حکمت و دانائی اور نبوت و رسالت کی منصب شناسی یہی ہے کہ اپنی دعوت اور طریق دعوت کو حکومت و سیاست کی آلودگی سے بالکل بچائے رکھا۔

ان اصول کے ساتھ اگر طریق کار کے فروغ میں حدود کا اہتمام اور غلو سے احتیاط ہو تو سبحان اللہ "نورٌ علیٰ نور" یار ما آں دارد و ایں نیز ہم" یوفقنا اللہ لما یحب دیرضیٰ[2]۔

ورنہ نفس تبلیغ عام کی جس درجہ اہمیت خود حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کی نظر میں تھی اس کا اندازہ اس مختصر سے مضمون سے کیا جا سکتا ہے جس میں تفہیم المسلمین کے عنوان سے حضرت نے اس کی ضرورت و اہمیت کی طرف عموماً سارے مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے اور اپنے کفش برداروں کو خصوصاً تاکید فرمائی ہے البتہ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے حضرت علیہ الرحمۃ

---

[1] اس خلط ملط سے اہون بشکل تو بطور ایک سیاسی آئیڈیالوجی کے خالص خلافت کی دعوت ہوگی۔

[2] اپنے نفس پر بالکل اعتماد نہیں خدا نہ کرے ان معروضات میں کوئی نفسانیت شریک ہوتی تو الدین النصیحۃ کے اجر کی جگہ الٹے مناع للخیر کے وزر کا مستوجب ٹھہروں گا اسی تقدم و تاخر میں کئی ہفتے گذر گئے اور تین تین مسودوں کی کانٹ چھانٹ اور جماعت کے اندر اور باہر کے چار چار ثقہ و اہل علم کے مشورہ کے بعد اب بھی ڈرتے ڈرتے ان معروضات کو پیش کیا جا رہا ہے ـــ افراط و تفریط کے بعض بعض تجربات و مشاہدات پر سب متفق ہیں۔ البتہ ان کے اظہار اور عنوان اظہار میں کچھ اختلاف تھا لیکن اس آخری مسودہ پر الحمد للہ کہ سب کا کم و بیش اتفاق ہے خود جماعت کے اندر کے ایک بڑے معتمد علیہ ذی علم کو اندیشہ تھا کہ جماعت کا نام ظاہر کر دینے سے خود اس کے حضرات کا انتفاع و استفادہ محدود ہو جائے گا لیکن راقم احقر کو ان حضرات کے اخلاص و انصاف سے یہ بدگمانی بھی نہیں۔

کے پیش نظر کامل دین کی کامل اصلاح و تجدید تھی اس لئے اس تبلیغ عام میں بھی خالی کلمہ طیبہ اور نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ہی کی نہیں بلکہ دیگر احکام کی تبلیغ کو بھی شریک فرمایا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"علماء اور ان کے وعظوں کے علاوہ اس وقت فضاء زمانہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ احکام الٰہیہ کے پہنچانے کا کام ہر مسلمان اپنے ذمہ لازم سمجھے اور ہر شخص اسی دھن میں لگ جائے جیسا اسلاف کا طریقہ تھا کہ علماء و صوفیہ، امراء و غرباء، خواندہ و ناخواندہ سب کو یہی دھن تھی کہ جس کو جو احکام معلوم ہوں دوسروں تک پہنچا پا جائے، علماً وعظ و تذکیر کرتے تھے صوفیہ اپنی مجلسوں میں نور باطن اور پاکیزہ باتوں سے بندگان خدا کو خدا کی طرف متوجہ کرتے تھے تاجر وغیرہ اپنے معاملات میں ملاقات میں اللہ کو نہ بھولتے تھے اگر یہ کام تنہا علماء کے ذمہ ڈال دیا جاتا تو حق کی روشنی ان مقامات میں نہ پہنچ سکتی، جہاں کسی عالم یا فاتح کا قدم نہیں پہنچا۔ لہٰذا تمام مسلمان عموماً اور میرے ساتھ تعلق رکھنے والے خصوصاً آج ہی سے اس دھن میں لگ جائیں کہ جتنا جس کو اسلام کے متعلق علم ہے اس کو دوسروں تک پہنچائے اور غیب سے نصرت کا امیدوار رہے اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۔

دستور العمل

اس کے متعلق دستور العمل اور نظام العمل یہ مقرر فرمایا گیا ہے کہ

(۱) ہر شخص اولاً دین میں خود پختہ و مضبوط ہو، احکام پر عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے میں نہ کسی سے مرعوب ہو نہ کسی کی مروت و تعلق کی پرواہ کرے اللہ تعالیٰ سے

بڑھ کر کون ہے جس کے لئے احکام الٰہیہ کو ترک کیا جائے۔

(۲) ہر شخص کو چاہئے کہ کسی جلسہ ومجلس کو احکام الٰہیہ پہنچانے سے خالی نہ رکھے مگر باریک واختلافی مسائل میں دخل نہ دے کہ یہ علمار کا کام ہے۔ سختی کا جواب سختی سے نہ دے۔ صبر وتحمل سے کام لے۔

جب کسی دنیاوی غرض تجارت یا ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں بھی کسی سے ملنا ہو تو حسب موقع باتوں میں کلمۂ حق ضرور پہنچا دیا جائے

(۳) رات دن میں کوئی وقت اس کام کے لئے بھی نکالا جائے جس میں بندگانِ خدا (مسلم غیر مسلم) کو احکام اسلام پہنچائے جائیں اور بُرے کاموں سے روکا جائے۔

(۴) احکام کے پہنچانے میں ہمیشہ نرم ہونا چاہیئے البتہ جن پر اپنی حکومت ہے جیسے بیوی بچے، نوکر، شاگرد وغیرہ ان کو اول نرمی سے نصیحت کیجائے پھر بتدریج سختی سے سمجھایا جائے

تبلیغ احکام کی ترتیب یہ ہو

(ا) جن کو کلمہ نہ معلوم ہو ان کو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ سکھلایا اور اس کے معنی سمجھائے جائیں۔

(ب) جن کو کلمہ معلوم ہو ان کو اس کے معنی سمجھائے جائیں اور کہا جائے کہ رات دن میں کم از کم سو مرتبہ لاالٰہ الا اللّٰہ اور اس کے ساتھ کبھی کبھی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ضرور پڑھ لیا کریں۔ حدیث میں ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ کر اپنا ایمان تازہ کرتے رہا کرو۔

(ج) جو لوگ نماز نہیں پڑھتے ہیں ان کو پابندی نماز کی اور مردوں کو مسجد میں باجماعت نماز کی تاکید کی جائے۔ جن کو نماز کا طریقہ نہ معلوم ہو ان کو سکھلایا جائے اور ممکن ہو تو پوری نماز کا ترجمہ بھی یاد کرا دیا جائے (یعنی سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ سے لے کر التحیات اور درود شریف تک) اور وضو و پاکی و ناپاکی کے مسائل سے وقتاً فوقتاً آگاہ کیا جائے

(د) جن پر زکوٰۃ فرض ہے ان کو زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی جائے جن پر قربانی واجب ہے، ان کو قربانی کی ترغیب دیں۔

(ھ) رمضان شریف کے روزے کی تاکید کیجائے

(و) جن پر حج ہے ان کو حج کی تاکید کیجائے

(ز) ہر بستی میں تعلیم قرآن کے مکاتب ضرور ہونا چاہئیں جن میں تعلیم قرآن کے ساتھ ساتھ اردو رسائل بہشتی زیور، بہشتی گوہر، راہ نجات وغیرہ بھی پڑھائی جائیں تاکہ بچوں کو ضروری احکام کی اطلاع ہو۔

(ح) سب مسلمانوں کو باہم اتفاق و اتحاد سے رہنے اور گالی گلوچ، لڑائی جھگڑا بند کرنے کی تاکید کی جائے

(ط) بستی کے کسی با اثر دیندار کو یا چند با اثر دینداروں کی جماعت کو اپنا بڑا بنا لیا جائے جن کا کام یہ ہو کہ لوگوں میں اتحاد و اتفاق قائم رکھیں اور امور مذکورۂ بالا کو رواج دیں اور جب کسی معاملہ میں نزاع ہو اس کا شریعت کے موافق علماء سے پوچھ کر فیصلہ کریں اور سب اس فیصلہ کی تائید کر دیں۔

(ی) جھوٹ، غیبت، حسد و کینہ، دشمنی، کسی کی بیجا طرفداری، چغل خوری کرنا بدنگاہی، بے پردگی، شراب نوشی، لڑکوں سے ناجائز تعلقات، سودی لین دین۔ بیکاری آوارہ گردی کا انسداد کریں۔

سچ بولنے، باہم تواضع و محبت کا برتاؤ کرنے، انصاف و عدل پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے اور جائز ذرائع سے معاش میں لگے رہنے، کفایت شعاری اور آمدنی سے زیادہ خرچ نہ کرنے کی بہت تاکید کریں۔ تنگی برداشت کریں۔ مگر حتی المقدور زیادہ خرچ نہ کریں۔

تقریبات اور روزمرہ کے خرچ میں کفایت کرنے والے پر طعن و تشنیع نہ کریں بلکہ اس کی ترغیب دیتے اور حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔ کسی جائز پیشہ کو عار نہ سمجھیں، بیکاری اور سوال کی ذلت (خواہ قرض ہی کا سوال ہو) کے مقابلہ میں گھاس کھودنے کو ترجیح دیں۔ اور نیک عمل اختیار کرنے کی خود بھی کوشش کریں اور دوسروں کو بھی تاکید کرتے رہیں۔

(۶) حیات المسلمین، تبلیغ دین، تعلیم الدین، محاسن اسلام، بہشتی زیور کو مطالعہ میں رکھیں اور وقتاً فوقتاً ان کے مضامین دوستوں، ملنے والوں اور سب بندگانِ خدا کو پہنچاتے رہیں۔

(۷) جو علماء کسی دینی خدمت درس و تدریس، تالیف و تصنیف وغیرہ میں مشغول ہیں وہ بھی اپنے ملنے جلنے میں بندگانِ خدا کو احکام پہنچانے میں سستی نہ کریں اور فرصت کے اوقات جیسے جمعہ کی تعطیل، طویل رخصت کا زمانہ ہے اس میں وعظ و نصیحت کے ذریعہ بندگان خدا کو احکام اسلام پہنچانا اپنا فریضہ جانیں۔

میں اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو خاص طور پر مکرر تاکید کرتا ہوں کہ امور مذکورہ بالا کی پوری پابندی کریں اور اس میں کوتاہی ہرگز نہ کریں۔ اور تمام اہل اسلام سے بھی یہی درخواست کرتا ہوں کہ اس دستور العمل کو حرز جان بنا کر ہر شخص اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائے تو مصائب و پریشانیوں کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا اور نصرت الٰہی ان کے ساتھ ہو گی، اور اس دستور

العمل کو چند روز تک نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ قائم وجاری رکھیں،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ٥

تبلیغ کے اس دستور العمل کی بڑی خصوصیت وہی ہے کہ کلمہ اور ارکانِ اسلام کی اقدمیت واہمیت کے باوجود حضرت جامع المجددین کے پیشِ نظر جامع وکامل دین کی جامع وکامل تجدید واصلاح ہے اور اس کی تفصیل میں ایمان وعمل، معاش ومعاملت، اخلاق ومعاشرت کی موٹی موٹی باتوں کا ایک سہل اور قابل عمل نظام العمل تجویز فرما دیا گیا ہے جس میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ جو کچھ ہو مضبوط ہو تو بنیادوں پہ ہو، اگر اس کو مسلمان اب بھی مضبوطی کے ساتھ تھام لیں تو انشاء اللہ کسی سے مقابلہ ومقاتلہ کے بغیر ہندوستان وپاکستان بلکہ سارے اسلامی ممالک کی دس سال کے اندر کایا پلٹ جانا یقینی ہے۔

باقی غیروں کی نقالی اور سیاسی ہلڑبازی اور ہنگاموں کے سوا دین کی صحیح راہ سے اگر کچھ کرنا ہی نہیں تو اس کے جو نتائج اب تک رہے وہ بھی سامنے ہیں اور آیندہ ان سے بدتر کا اندیشہ ہے، اللہ کی نصرت تو اللہ ہی کی راہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہوگی۔ اور راہ وہی ہے جس کی طرف حضرت نے اس دستور العمل کے خاتمہ کی آیت میں ارشاد فرمایا ہے جس میں دعا کی صورت میں یہ تعلیم ہے کہ سب سے پہلے اپنے گناہوں اور دین ودنیا کے معاملات میں اپنی زیادتیوں یا حدود ناشناسیوں سے تائب ومعذرت خواہ ہو کر (رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا) آئندہ کے لئے دین کے راستہ پر قدموں کو جما لیا جائے (وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا) تو کفار کے مقابلہ میں نصرت یقینی ہے (وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ) یہ سنت اللہ کی منطق اور اس کے

مقدمات ہیں جن سے گریز کر کے مسلمانوں کے لئے کسی کامیابی کی توقع قطعاً کتاب وسنت کے محکمات و نصوص کے خلاف اور نری خام خیالی ہے قرون اولیٰ کی تاریخ نے کوئی سبق ہمارے لئے چھوڑا نہیں۔ حضرت عمرو بن العاص رضؓ مصر کا ایک مہینہ سے محاصرہ کئے ہوئے ہیں اور فتح نہیں ہو رہا ہے ایک مہینہ کی مدت کسی ملک کی فتح کے لئے کیا تھی۔ پھر بھی امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ تحریر فرماتے ہیں کہ

اس کی کیا وجہ ہے کہ اتنے دن محاصرہ کو ہو گئے اور اب تک کامیابی نہیں ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ لشکریوں میں تفویض و تقویٰ کی کمی ہو گئی ہے اس لئے سب اپنے معاصی سے توبہ اور اپنی اصلاح کریں۔ چنانچہ سب نے مل کر توبہ کی، پھر جو حملہ کیا تو ایک ہی دن میں شہر فتح ہو گیا۔ حضرت عمر رضؓ نے اس ناکامی کو ظاہری اسباب و تدابیر کی کمی و بے سروسامانی پر محمول نہیں فرمایا بلکہ دین کی سستی و غفلت پر [1]

بہر حال اب تک جس راہ پر ہم دوسروں کے پیچھے چل رہے ہیں یہ تو نفس حکومت وجاہ طلبی کی وہی فرعونی و شدادی راہ ہے اور مسلمان جب تک اسلام کا نام برائے نام لے کر خود فریبی اور خدا فریبی میں گرفتار ہیں اس وقت تک ناکامی اور رسوائی کے سوا کسی دوسرے نتیجہ کی امید رکھنا اسلام کی حقیقی تعلیم اور اصلی تاریخ دونوں سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔

وقت ہے کہ اب بھی آنکھیں کھل جائیں ورنہ حکومت کا غیر اسلامی یا لادینی جبری [2] نظام تعلیم دس سال کے لئے بھی اگر ہماری اس غفلت میں چل گیا، کہ ہم نے خود

---

[1] الافاضات الیومیہ ص ۳۵

[2] حکومت کی طرف سے جبری تعلیم کا نفاذ یہ اب کوئی فرضی امکان و احتمال نہیں بلکہ اٹل واقعہ ہو رہا ہے

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

یا حکومت پر زور ڈال کر مسلمان بچوں کے لئے حضرت کی تجدید و تاکید کے مطابق اسلامی مکاتب و مدارس گاؤں گاؤں و قصبہ قصبہ میں نہ قائم کر دیئے تو ایک نسل کے بعد ہی اسلام کا خالی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ذرا غور فرمایئے کہ اقلیت کے حق میں اس کا نقشہ کیا ہوگا ایک طرف تو پڑھانے والے شاذ ہی کسی مدرسہ میں مسلمان ہوں گے یا دس پانچ میں ایک آدھ، دوسری طرف دن رات میں ساتھ لکھنے پڑھنے والوں کا تناسب کم و بیش یہ ہوگا کہ اگر ۵ یہ ۷ رمسلمان بچے ہیں تو ۵۰/ ۶۰ رغیر مسلمان کتابوں کے مضامین قریباً تمامتر غیر اسلامی روایات و رجال سے پُر۔ زبان تک مسلمان بچوں کی مادری یعنی اردو نہیں بلکہ ہندی ہے وہ بھی سنسکرت سے لدی ہوئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسے جبری نظام میں جکڑے ہوتے بچے بطور خود بھی اگر چاہیں تو اردو سے ناواقف ہونے کی بدولت اپنے دینی معلومات و روایات نہ جان سکیں گے، حکومت بدنیت نہ بھی ہو اور غیر مسلم استاد دیدہ و دانستہ مسلمان بچوں کو ان کے دین و ایمان سے برگشتہ نہ بھی کرنا چاہیں تو بھی اس ماحول و صحبت و تربیت میں بسر کرنے والے وہ مسلمان بچے کتنے مسلمان رہ جائیں گے۔ جو زیادہ تر اب بھی صرف اتنے مسلمان ہیں کہ نام کے مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوتے ہیں، آج بھی جو ایسے مدرسے ہیں جن میں غیر مسلم پڑھنے پڑھانے والوں کا غلبہ ہے خود کانگرسی حکومت کے ایک مسلمان کانگریسی عہدہ دار کی عینی شہادت ہے کہ ایسے مدرسہ کے مسلمان بچے سلام کے بجائے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہیں۔

حکومت کی حد تک چارۂ کار صرف یہ ہے کہ مختلف سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں کے مسلمان بالاتفاق کھل کر واضح کر دیں کہ جبری تعلیم کے لئے ہم بخوشی طیار ہیں لیکن ناسمجھ اثر پذیر بچوں کی کسی ایسے ماحول میں تعلیم پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتے .... جس میں ان کے دین و ایمان پر کسی ناموافق اثر کا ادنیٰ احتمال بھی ہو، حکومت اگر نیک نیت ہے تو تھوڑے بہت مصارف کی زیادتی سے بآسانی مسلمان بچوں کی جبری تعلیم کا ان کی خاص تہذیبی و دینی روایات کی حفاظت کے ساتھ انتظام کر سکتی ہے ساتھ ہی مسلمان بجائے خود اپنے کو دیانات، معاملات، معاشرت اور اخلاق غرض زندگی کے تمام شعبوں میں پورا

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

نام لینے والے بھی ہندوستان میں خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے رہ جائیں گے ۔

تعلیم المسلمین

تفہیم المسلمین کے مندرجہ بالا دستور العمل پہلے تعلیم المسلمین کے عنوان سے اسی مقصد کے سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ وعظ اور واعظوں کے لئے بھی ایک دستور العمل ضروری اصلاحات و تجدیدات کے ساتھ تجویز فرمایا گیا ہے اس کی تمہید میں بھی ارشاد ہے کہ :-

نصوص کثیرہ میں صلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی تاکید بھی وارد ہے اور سورۂ والعصر تو بلا شرکت خاص اسی موضوع کے لئے نازل ہوئی اس میں جہاں تصحیح عقائد و اصلاح اعمال کو نجات کی شرط فرمایا ہے جو حاصل ہے خسران سے بچنے کا وہیں وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ میں دوسروں کی تعلیم عقائد و اعمال کو بھی شرط نجات میں داخل فرمایا ہے اس کے علاوہ قرآن و حدیث میں اسی مضمون کے اور بیشمار نصوص امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور وعظ و تذکیر کے عنوان سے نہایت تاکید و اہتمام کے ساتھ مذکور ہیں اور اس میں سستی و ترک پر وعیدیں بھی وارد ہیں نیز انبیاء علیہم السلام کا خاص فریضہ یہی رہا ہے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) مسلمان بنانے کے لئے اپنی دینی صلاح و اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے واجبات کا وہ اہتمام کریں جو خود ان کے دین ہی نے مقرر کر رکھا ہے اور جس کی مجدد وقت نے تمام و کمال تجدید فرما دی ہے یہ حاشیہ احقر کے مضمون نئی شکل کا پرانا حل سے ماخوذ ہے جو صدق مطبوعہ ۲۱ و ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء شائع ہوا ہے پوری تفصیل قابل ملاحظہ ہے ۔

باقی دین کے جتنے شعبے ہیں مثلاً افتاء، درس و تصنیف وغیرہ سب اسی کے آلات و مقدمات ہیں خود تنظیم (یا حکومت) جس کی ضرورت سب کو تسلیم ہے (بلکہ آج کل ساری دنیا آزادی و خود مختاری کے نام سے اسی پر جان دے رہی ہے) اسلام میں وہ بھی (اسی مقصد اصلاح ایمان و عمل) کے تابع اور اس کا مقدمہ ہے چنانچہ اس آیت اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ میں جہاں تمکین کے مقاصد ذکر فرمائے ہیں ان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو بھی جزو مقصود فرمایا گیا ہے غرض صحیح اسلامی حکومت یا تمکین فی الارض کی اصلی غرض بھی خود مختاری قطعاً نہیں بلکہ خدا مختاری ہے یعنی حکومت و سیاست سب خدا کی زمین پر خدا کی مرضیات و احکام پر چلنے چلانے کے لئے اور انہیں مرضیات و احکام کی مخالفت یعنی ارتکاب معاصی کو قرآن و حدیث میں صراحۃً دنیا و آخرت کے سارے مصائب کا سبب قرار دیا گیا ہے اور خادمانِ ملت نے اس باب میں مستقل تصانیف بھی لکھی ہیں اور ایک مختصر رسالہ جزاء الاعمال احقر کا بھی شائع ہو چکا ہے اور حیوٰۃ المسلمین کے خطبہ میں بھی دلنشین عنوان سے اس کی تقریر کی گئی ہے

لہٰذا اس کے بعد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ضروری ہونے میں کیا شبہ رہا جس کے ذرائع میں سب سے سہل اور انفع کے اعتبار سے عام و تام وعظ کا ذریعہ ہے،،

وعظ اور واعظوں کا انتظام و اصلاح

اس کے بعد وعظ اور واعظوں کے متعلق جو اصلاحی ہدایات تجویز فرمائی گئی ہیں وہ

مختصرًا یہ ہیں :۔

"ہر اسلامی مدرسہ و انجمن کم از کم ایک واعظ بھی مقرر کرے اور یہ سمجھے کہ ضرورتِ تعلیم کے لئے ایک مدرس کا اضافہ کیا کیونکہ جس طرح مدرسہ کے معلمین طلبہ کے مدرس ہیں واعظین عوام کے مدرس ہیں اور اہل انجمن یہ سمجھیں کہ یہ تعلیم عوام کے لئے ان کی انجمن کی ایک شاخ ہے"۔

جہاں مدرسہ و انجمن نہ ہو یا کسی وجہ سے اس کا انتظام نہ کر سکے وہاں رؤسا، انفرادًا یا اشتراکًا اپنے پاس سے تنخواہ دے کر ایسا واعظ مقرر[1] کریں مگر اس کا انتخاب علماء سے کرائیں جہاں ایسا کوئی باہمت رئیس نہ ہو وہاں اہل بستی باہمی چندہ سے کریں مگر چندہ میں کسی پر جبر نہ کریں یہ واعظ خواہ متبحر عالم نہ ہو مگر دینیات پر کافی نظر ہو کہ تقریر میں یا کسی کے سوال کے جواب میں غلط روایت یا غلط مسئلہ بیان نہ کرے"

واعظ کا انتخاب تو جیسا کہ حضرت علیہ الرحمۃ نے ہدایت فرمائی متدین علماء سے ضرور کرانا چاہیئے باقی جہاں تک نفس وعظ گوئی کی تعلیم کا تعلق ہے اگر کچھ بھی صلاحیت ہو تو خود حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کے مواعظ جو دین کے تمام ابواب کو جامع و محیط ہیں ہر اعتبار سے ایسے کافی و وافی اور اتنے کثیر ہیں کہ کسی واعظ کو عمر بھر بھی ان سے باہر جانے کی ضرورت انشاء اللہ پیش نہیں آئے گی۔ حسب موقع و حسب ضرورت انہیں کے اجمال و تفصیل سے یہ خدمت باحسن وجہ انجام دی جا سکتی ہے۔

---

[1] بحالاتِ موجودہ جن علاقوں میں یا دیہاتوں میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہو ان میں اور بھی خصوصًا ایسے واعظوں کا انتظام خود مسلمانوں کی طرف سے ضروری ہے جو ان مقامات کا برابر دورہ کرتے رہیں اور مسلمانوں کو جمع کر کے احکام کی تبلیغ اور اپنے دین کی حفاظت کی تاکید کرتے رہیں۔

بلا ضرورت اختلافی مسائل نہ بیان کرے اور اگر ضرورت ہی پڑ جائے تو عنوان نرم و سہل ہو اگر کسی شخص کا نام لینا پڑے تو اس کی نسبت کوئی سخت کلمہ نہ کہے بس متانت سے شبہ حل کر دے خواہ کوئی مانے یا نہ مانے ۔

عام طور پر واعظ کسی کی دعوت قبول نہ کرے البتہ اگر داعی پہلے سے شناسا اور مخلص ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، یا شناسا نہ ہو مگر قرائن سے مخلص ہونا دل کو لگتا ہو تو بھی مضائقہ نہیں مگر از قسم ہدیہ نقد و غیر نقد ہرگز قبول نہ کرے ۔

کسی مدرسہ یا انجمن یا اسی مد وعظ کے لئے چندہ کی ترغیب ہرگز نہ دے، بلا ترغیب کوئی دے بھی تب بھی انکار کر دے پھر بھی نہ مانے تو کہہ دے کہ براہ راست مرکز میں بھیج دو میں نہیں لیتا ۔ (غرض جہاں تک تبلیغ احکام کا تعلق ہے لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا کے انبیائی اسوہ و معیار کو زیادہ سے زیادہ پیش نظر رکھے)

" سیاسی امور یا کسی کے ذاتی معاملات کے فیصلہ میں واعظ دخل نہ دے اگر اس کی درخواست بھی کی جائے تو صاف انکار کر دے ۔

کسی کو تعویذ گنڈے دینے یا بیعت لینے سے واعظ کو قطعاً منع کر دیا جائے اگر چہ وہ اس کا اہل بھی ہو ۔

واعظ صرف وعظ ہی پر اکتفا نہ کرے کیونکہ وعظ میں وہی لوگ آتے ہیں جو پہلے سے کچھ دیندار ہیں اور ضرورت سب کو دیندار بنانے کی ہے اس لئے حسب ذیل طریقہ اختیار کرنا چاہیئے

(الف) جو مسلمان نماز نہیں پڑھتے، مسجد میں نہیں آتے ان کے مکان پر

چند واقف مخلص احباب کو ساتھ لے کر جائیں اور نرمی کے ساتھ اول صاحب خانہ کا کلمہ، پھر اسی کے واسطے سے گھر والوں کا کلمہ ٹھیک کیا جائے پھر سب کو نماز کی تاکید کی جائے اسی طرح سب بے نمازیوں کے مکان پر جایا جائے اور ہر بستی کے اندر ایک یا متعدد جماعتیں مخلص و مستعد دینداروں کی ماتحتی میں قائم کر دی جائیں جو برابر اسی طرح لوگوں کے مکان پر جا کر کلمہ سکھلائیں اور بے نمازیوں کو نمازی بنانے کی کوشش کرتے رہیں اور اس خطاب خاص میں بجز کلمہ کی تلقین اور نماز کی تاکید کے اور کچھ نہ کہا جائے باقی احکام کے لئے عام وعظ کو کافی سمجھا جائے

مجلس دعوة الحق

حضرت علیہ الرحمۃ نے خود اپنے ہاں اسی نظام العمل کے مطابق کام بھی شروع فرما دیا تھا اور بعد میں دعوة الحق کے نام سے خاص دعوت تبلیغ کی خدمات ہی کی تکمیل و انجام دہی کے لئے ایک مستقل مجلس کی بھی بنیاد ڈالی تھی، جس کی مختصر تفصیل دعوة الداعی نام کے مضمون میں فرمائی گئی ہے۔ آیت وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ہ کے ذیل میں تمہیدًا ارشاد ہے کہ

" اس آیت سے معلوم ہوا کہ تعلیم احکام اور اس کی ضرورت سے تعلّم احکام ایسا اہم فریضہ ہے کہ عین جہاد حقیقی میں جو اعظم العبادات ہے، مشغول ہونے کے وقت بھی واجب ہے کہ ایک جماعت بجائے جہاد کے اس فریضہ کی خدمت انجام دے۔ تو اور کسی وقت اس کا اہتمام کیوں نہ واجب ہوگا؟

وجہ ظاہر ہے کہ کوئی طاعت کیسی ہی عظیم اور ضروری ہو وہ معتبر اور مقبول اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ شرعی قوانین کے موافق ہو اور ان قوانین کے موافق ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے ان کا علم ہو جس کی دو صورتیں ہیں یا خاص طور پر ان کا درس و تدریس یا عام طور پر تعلیم و تبلیغ، پہلا طریقہ مختلف اسباب کی بناء پر عام نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا دوسرا طریقہ ہی رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے یہی طریقہ تجویز فرمایا گیا اور اکابر امت نے بھی ہمیشہ سب سے زیادہ اس کا اہتمام فرمایا۔ باقی درس و تدریس، تصنیف و تالیف وغیرہ کو اسی کا مقدمہ قرار دیا۔

"مگر ایک طویل زمانہ سے اس کی طرف سے بہت بے التفاتی ہو گئی ہے جس کا لازمی نتیجہ جہل کا غلبہ ہے اور غلبۂ جہل سے فسادِ عمل اور فسادِ عمل سے مسلمانوں کا ہر قسم کا ظاہری و باطنی تنزل اور گوناگوں مصائب میں ابتلا اس درجہ رونما ہو گیا ہے کہ اگر جلد اس کا تدارک نہ کیا گیا تو قوی اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم من حیث الاسلام فنا ہو جائے"

الحمد للہ کہ اس نازک وقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دستگیری فرمائی کہ بعض بے سروسامان بندوں کو اس کا احساس اور احساس کے ساتھ اس کی توفیق عطا فرمائی کہ وہ اللہ ہی کے بھروسہ پر کھڑے ہو گئے اور اس خدمت کی تکمیل کے لئے دعوۃ الحق کے نام سے ایک مجلس بنا کر کام شروع کر دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک دو شخص کا کام نہیں اس میں ایک بڑی جماعت کی ضرورت ہے جس کی دو صورتیں ہیں ؛

ایک یہ کہ بہت سے تبلیغ کا کام کرنے والے تنخواہ پر رکھے جائیں اور تنخواہ کے لئے بڑے پیمانہ پر چندہ کی تحریک کی جائے مگر موجودہ فضا پر نظر

کرکے اس میں یقیناً لوگوں کو تنگی ہوگی جس میں ناکامی کے ظن غالب کے علاوہ اس کے شرعی جواز میں بھی شرح صدر نہیں ہوتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تنخواہ دار تو کم ہوں اور ان کی تنخواہ کے کفیل وہ خاص حضرات ہوں جو بلا تحریک اپنی رغبت سے اس کو برداشت فرمالیں۔

باقی زیادہ کام کرنے والے غیر تنخواہ دار ہوں جس کی شکل یہ تجویز کی گئی ہے کہ جو اہل علم حضرات اس خدمت میں حصہ لینا چاہیں وہ حسبۃً للہ اس کے لئے کچھ ماہانہ، ششماہی، یا سالانہ، دو چار دن، ہفتہ، دو ہفتہ، یا مہینہ سوا مہینہ مثلاً نکال کر ناظم مجلس دعوۃ الحق (خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر) کو اطلاع فرمائیں۔ اور یہ ان حضرات کی طرف سے گویا چندہ ہوگا، جو روپیہ پیسہ کے چندہ سے زیادہ عزیز و مفید ہوگا۔

پھر جب اور جہاں اس خدمت کے لئے ان کو تکلیف دینے کی ضرورت ہوگی ان سے عرض کیا جائے گا کہ وہاں مجلس کے حسب ہدایت تبلیغ کا کام انجام دیں۔ آمد و رفت کا کرایہ اور مصارف خورد و نوش اعتدال کے ساتھ پیش ہوں گے۔ اور جن بزرگ کو خادم کی عادت ہوگی ان کی خدمت میں خادم کے مصارف پیش کئے جائیں گے" یہ عرض تو عام اہل علم حضرات کی خدمت میں بطور مشورہ ہے"۔

لیکن اپنے خادموں کو بصورت درخواست حکم ہے کہ

جن حضرات کو احقر کے ساتھ خاص تعلق ہے ان سے مشورہ کے آگے اس کی درخواست ہے اور اس مشورہ اور درخواست کے بعد بیچینی سے منتظر ہوں کہ اب رجسٹر کب تیار ہو جائیگا اور امید رکھتا ہوں کہ انشاء اللہ دیر نہ لگے گی"۔

نیز عموماً اہل علم کی ساری جماعتوں سے یہ بھی عرض ہے کہ ان معین اوقات کے علاوہ دوسرے عام اوقات میں بھی اپنی اپنی جگہ خاص و عام تبلیغ سے غافل نہ رہیں، جس کے ضروری قواعد آسانی کے لئے تعلیم المسلمین وتفہیم المسلمین میں بطور نمونہ ضبط بھی کر دیئے گئے ہیں (جن کا خلاصہ وحوالہ اوپر گذر چکا)

اگر پابندی و اخلاص کے ساتھ اس دستور العمل پر عمل کر لیا گیا تو انشاء اللہ اس کے ثمرات فلاح وصلاح اور نجاح بہت جلد مشاہدہ میں آجائیں گے۔ اور آخرت کے ثمرات کا تو پوچھنا ہی کیا۔"

خود حضرت کے ہاں تو حضرت کی ہدایت اور مذاق کے مطابق حضرت کی حیات ہی میں اس کام کا آغاز ہو گیا تھا اور بعد میں بھی کچھ جاری رہا۔ لیکن حضرت کا اور حضرت کے اثر سے حضرت کے خادموں کا مذاق چونکہ اعلان و اشتہار کا بالکل نہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کہاں کہاں اور کیا کیا ہو رہا ہوگا، لیکن جن پر حضرت کی صحبت کا کچھ رنگ چڑھا ہے امید ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ حسب توفیق غافل نہ ہوں گے باقی عام مسلمانوں میں پابندی و اخلاص کی جو قید و شرط حضرت نے بالکل بجا طور سے لگائی ہے اگر وہی ہوتی تو آج یہ نوبت ہی کیوں آتی، تاہم اب بھی اگر حضرت کی اس تنبیہ سے چونک پیدا ہو اور کمر ہمت کس لی جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے

بہر حال اس مجلس دعوۃ الحق کا اصلی مقصد تعلیم المسلمین وتفہیم المسلمین کی عملی ترویج کے ذریعہ مسلمانوں میں دینی جذبہ پیدا کرنا اور کامیابی کا راستہ بتلانا ہے جو مسلمانوں کے لئے تعلق مع اللہ میں منحصر ہے اور اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی پوری پابندی کی جاتے تا بہ امکان کوئی بات

خلاف شرع نہ ہونے پائے یہی عبدیت کی روح اور مسلم کی زندگی کا اصل اصول ہے۔"

نظام العمل

اس مقصد کے بعد نظام العمل مختصراً یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ

(۱) تعلیم المسلمین و تفہیم المسلمین کی تمام دفعات کی نہایت خلوص و استقلال کے ساتھ ہمیشہ پابندی کرتے رہیں اور ہر امر میں اصلی مطمح نظر رضائے حق ہو اور اس استقلال و ہمت کے ساتھ ہی دعا و ابتہال کو اصل وظیفہ و تدبیر سمجھیں۔

(۲) جہاں تک ہو سکے قرآن شریف کا ترجمہ سننے کا اہتمام بھی کریں

(۳) مسلمان کا فرض ہے کہ ہر موقع پر جذبات کو شریعت کے تابع رکھے

(۴) اخلاقِ اسلامی کو اپنا شعار بنائے، وضع و معاشرت کو بالکل شریعت مقدسہ کے موافق رکھے، نہ انگریزوں کی تقلید کرے نہ ہندوؤں کی نہ کسی اور کی۔

(۵) انبیاء علیہم السلام کا مسنون طریقہ تھا کہ ہاتھ میں لاٹھی رکھتے تھے اس واسطے سب مسلمانوں کو اس سنت پر کاربند رہنا چاہئے۔

(۶) خدمت خلق کا خیال رکھیں، محنت و جفاکشی کی عادت کے لئے ورزش بھی کیا کریں نیز لکڑی وغیرہ چلانا بھی سیکھیں اور سادہ و سپاہیانہ زندگی بسر کریں یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ کسی سے لڑیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آرام طلبی میں نہ پڑیں، مخدوم نہ بنیں، خادم بننے کی کوشش کریں اگر کسی انسان خصوصاً مسلمان کی مدد کرنے کی ضرورت ہو تو مظلوم کی

امداد کو لازم جانیں۔

(۷) ہر مسلمان روزمرہ نماز عشاء کے بعد سونے سے پیشتر اپنے گناہوں کو سوچ کر یاد کرے۔ اور پھر ان نعمتوں کو یاد کرے جو حق تعالیٰ کی طرف سے اس پر ہیں اور ان دونوں کو یاد کر کے اپنے کو ملامت کرے کہ جس مالک کی نعمتیں اس قدر ہیں اس کی ایک دن میں مجھ سے اس قدر نافرمانیاں ہوئیں۔ اس کے بعد دل سے ان سب گناہوں سے توبہ و استغفار کر کے سوئے۔ روزانہ بلاناغہ یہ عمل کرے۔" اخیر میں بزرگوں کی ایک نافع وصیت درج فرمائی ہے کہ

کار کن کار بگذر از گفتار　　　کاندریں راہ کار باید کار

لیکن اس کو کیا کیجئے کہ آج کل گفتار ہی کو سب سے بڑا "کار" دے لیا گیا ہے تاہم مسلمان اپنے کو دوسروں پر قیاس نہ کریں ان کا کام آج کل کی بکواس سے ہرگز نہ چلے گا ان کا کام تو کام ہی سے چلے گا اور وہ کام ہر کام میں حق و شریعت کا اتباع ہے بعض جامع دعائیں بھی درج فرمائی ہیں جن کو بالخصوص نمازوں کے بعد پڑھتے رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

اول:۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَهٗ [۱]

ثانی:۔ اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہ علیہ وسلم وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْھُمْ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

ترجمہ دعا نمبر ۱: اے اللہ ہم پر حق کا حق ہونا ظاہر فرما دیجئے اور اس پر چلنے کی

توفیق بخشئے، اور باطل کا باطل ہونا ظاہر فرما دیجئے

ترجمہ دعا نمبر(۲) اے اللہ آپ اس کی مدد فرمائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدد کرے اور ہم کو ان مدد کرنے والوں میں بنا دیں، اور چھوڑ دیں اس کو جس نے چھوڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو اور ہم کو ان چھوڑنے والوں میں نہ بنائیں۔

آج کل کے نئے زمانہ کی انجمن بازی و مجلس سازی جس کی حقیقت تھوڑا کام بہت نام۔ اس کا مذاق حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کو بالکل نہ تھا تاہم کسی نئی چیز میں اگر کوئی معتد بہ نفع معلوم ہوا اور کوئی شرعی قباحت نہ ہوئی تو محض نئے ہونے کی بناء پر ضد بھی نہ تھی اس لئے غالباً بعض خادموں کے مشورہ سے آخر عمر میں خدمت تبلیغ کے لئے دعوۃ الحق کے نام سے مذکورہ بالا مجلس بھی قائم فرما دی تھی۔ ورنہ نفس تبلیغ کی خدمت و اہمیت تو ساری عمر اس درجہ پیش نظر رہی کہ نہ صرف سیکڑوں ہزاروں وعظ و سفر اسی خدمت کے لئے فرمائے بلکہ کثرت سے مواعظ و ملفوظات میں تبلیغ کے اہم و اقدم فریضہ دینی کے لئے مسلمانوں کو طرح طرح سے متنبہ و متوجہ فرماتے رہے، آداب تبلیغ، محاسن اسلام، الدعوۃ الی اللہ، صلاح و اصلاح وغیرہ بہت سے مطول وعظوں کا تو مستقل موضوع ہی فریضہ تبلیغ کی اہمیت و اقدمیت اور اس کے آداب و احکام کی تفصیل ہے

دعوت و تبلیغ کی دو قسمیں

اصولی طور پر دعوت و تبلیغ کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں (۱) عام (۲) خاص عام سے مراد وہ ہے جس میں کسی شخص یا اشخاص کو نہیں بلکہ عام مسلمانوں کو خطاب کیا جاتا ہے جو فرض کفایہ ہے اور جس کا امر وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ الخ اور فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ

وغیرہ نصوص میں فرمایا گیا ہے اور تبلیغ خاص سے مراد وہ دعوت یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے جس کا خطاب کسی خاص شخص یا اشخاص خصوصًا اپنے توابع یا ایسے لوگوں سے ہوتا ہے جن پر کسی طرح کے امر و حکم کی قوت و اثر حاصل ہے یا جن سے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ کے تحت راعی و رعیت یعنی نگران و زیر نگرانی کا کوئی علاقہ ہے جیسے بی بی، بچے، نوکر چاکر، شاگرد و مرید وغیرہ جو کسی طرح ہمارے ماتحت ہوں اور جن کی صلاح و فلاح کی ہم پر کچھ ذمہ داری ہے اور جن کے حق میں اگر ترغیب سے کام نہ چلے تو ترہیب سے بھی کام لے سکیں جس کو ایک دوسری مشہور حدیث میں "تغییر بالید" سے تعبیر فرمایا گیا ہے یعنی جہاں کسی منکر یا برائی کے مٹانے میں ہم کو قوت و طاقت حاصل ہو وہاں بالید قوت سے مٹانا ہمارے ذمہ ہے، تبلیغ خاص راعی و رعیت کے تعلق و مسئولیت و مواخذہ کے اعتبار سے فرض عین ہے یعنی ہر ہر شخص پر فرض ہے بلکہ کلکم راع کی کلیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی اعتبار سے کسی نہ کسی کا راعی یعنی نگران ہوتا ہے۔ شیخ مرید کا۔ استاد، شاگرد کا، آقا غلام کا، افسر ماتحت کا، شوہر بیوی کا والد اولاد کا۔ ولی زیر ولایت کا متولی وقف کے حقوق کا، حتی کہ ایک ادنیٰ چپراسی بھی کچھ نہ کچھ اثر رکھتا ہے اور سینکڑوں معاملہ و مقدمہ والوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے۔

تبلیغ عام کا تو سب سے اعم و اعظم ذریعہ جیسا کہ حضرت نے جابجا تفصیل فرمائی ہے وعظ ہے اور یہ کام علماء دین یا ایسے لوگوں کا ہے جو احکام دین سے کافی و وافی واقفیت رکھتے ہوں، یہ عام تبلیغ اب بھی کچھ نہ کچھ بری بھلی طرح مختلف مواقع کے وعظوں یا بہت سے علماء اب وعظ کے نام کو چونکہ اپنی حقارت تصور فرمانے لگے ہیں تو تقریروں کے نام سے بری بھلی طرح ہو جاتی ہیں۔ لیکن تبلیغ خاص اس اعتبار سے زیادہ عام ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی کا راعی و نگران ہونے کی بناء پر کسی نہ کسی درجہ میں اس کا مامور ہے اور وہ اس لحاظ سے زیادہ نافع و کارگر بھی ہے کہ اس میں ترغیب کے ساتھ ترہیب کی قوت بھی

کچھ شریک ہوتی ہے ساتھ ہی اگر اس تبلیغ کا احساس واہتمام عام ہوجائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کم از کم ہر شوہر اور باپ اپنے بال بچوں کی اصلاح میں تو لگ ہی جائیگا اسی طرح جب ہر ہر گھر کی اصلاح کا انتظام ہوگیا تو پھر بے گھرے رہ ہی کتنے جائیں گے اور وہ اپنے ماحول کی گرفت واثر سے آسانی کے ساتھ کیسے نکل سکیں گے ؟

راقم ہذا کے نزدیک اگر مسلمانوں کو اس تبلیغ خاص یا اپنے اپنے توابع اور زیردستوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف متوجہ کرنے کا ذرا منظم طریقہ سے انتظام ہو تو یہ طریقہ قابو کا بھی زیادہ ہے اور پایدار بھی، بس اس کی تنظیم ہو کہ ہر گاؤں یا قصبہ وشہر کے ہر محلہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مقرر فرمودہ نظام کے ذریعہ ہر ہر گھر کے راعی کی انفراداً یا اجتماعاً اصلاح پر زیادہ زور دیا جائے جس کے بعد پورے گھر کی اصلاح خود راعی کی ترغیبی وترہیبی تدابیر سے از خود بسہولت ہوجائے گی۔

لیکن کہاں تک افسوس کیا جائے کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ غفلت وکوتاہی اسی تبلیغ خاص میں ہے بلکہ قطعاً اس کا فقدان ہے (والنادر کالمعدوم) عوام تو عوام خواص تک کو اس تبلیغ خاص یا اپنی راعیانہ وحاکمانہ مسئولیت ومؤاخذہ کا رتی بھر احساس نہیں معلوم ہوتا پرانے طرز کا وعظ کہنے والے اور نئے طرز کی تقریر کرنے والے علماء دونوں تمام دنیا کے مسلمانوں کی تباہی وتنزل کا مرثیہ تو وعظ وتقریریں نہایت درد وغم ..... کے ساتھ سنا دیں گے لیکن خود اپنے اہل وعیال کے دین حتیٰ کہ نماز روزہ تک کی اتنی بھی فکر نہیں جتنی صاحبزادے بلکہ اب تو صاحبزادی کے کسی اسکول یا کالج کے امتحان میں پاس ہونے کی، نہ بی بی کی نماز کی اتنی بازپرس جتنی کھانے میں نمک کی زیادتی کی۔ حضرت علیہ الرحمۃ نے اس غفلت وبے حسی کا بکثرت خصوصاً مواعظ میں جابجا ذکر فرمایا ہے مثلاً دعوت الی اللہ میں فرماتے ہیں کہ

مسلمانوں میں اولاً تو دعوت الی اللہ کا باب ہی گم ہوگیا ہے حتیٰ کہ جہاں

قدرت ہے وہاں بھی نہیں۔ اور جہاں قدرت نہیں وہاں کا تو پوچھنا ہی کیا ہمارے بزرگ وہ تھے کہ جہاں قدرت نہ تھی وہاں بھی دعوت الی الحق سے باز نہ رہتے اور ہم ہیں کہ قدرت کی جگہ بھی نہیں کرتے، بچوں کو، نوکروں کو، باوجود قدرت کے کبھی امر بالمعروف نہیں کرتے۔ مگر یہ برتاؤ صرف خدا کے معاملات میں ہے اپنے معاملات میں ہرگز نہیں، گھر میں آکر یہ تو پوچھیں گے کہ کھانا تیار ہوا یا نہیں مگر یہ کبھی نہ پوچھیں گے کہ بیوی نے نماز پڑھی ہے یا نہیں؟ بہتیرے کہیں گے کہ کہا تو تھا مگر وہ نہ پڑھے تو کیا کریں۔ بھائی کہنے کے دو طریقے ہیں ایک مشورہ، ایک حکم ہے، ایک تو کہنا کہ نماز پڑھا کرو نماز نہ پڑھنا ہمیں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو مشورہ ہوا کہ اس کی مخالفت سے بیوی کو ناراضگی کا ڈر نہیں اور ایک یہ کہنا کہ جیسے بیوی کھانے میں نمک تیز کر دے تو ایک دن تو نرمی سے کہیں گے دوسرے دن سختی سے اور تیسرے دن جو ذرا اکھڑ ہیں ڈنڈے سے کہیں گے تو یہ حکم ہے جس کی مخالفت سے بیوی کو ڈر ہے کہ میاں سخت ناراض ہوں گے، ذرا اتنا ہی کہہ کر دیکھو کہ اگر نماز نہ پڑھو گی تو ہم تمہارے ہاتھ کی روٹی نہ کھائیں گے اور ایسا ہی کر کے بھی اور ڈر دوست کہ روٹی [illegible] گی۔ بہت سے بہت ایک دن ایسا کرنا پڑے گا۔ پھر تو وہ پابندی ہو جائے گی۔ اور ایک دو روز کھانے کا انتظام کیا مشکل، شہر میں تو بازار موجود، دیہات میں کسی دوسرے کے گھر میں پکوا لیا جا سکتا ہے اور اگر کہو کہ ساری ہی عورتیں بے نمازی ہوں تو کیا کریں۔ کس سے پکوائیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا بھر تمہاری محکوم نہیں تمہیں صرف اپنے گھر کے لئے کہا جا رہا ہے اور اگر ہمت ہو تو سب کے ہی ساتھ یہ معاملہ کرو، انشاء اللہ ہمت کی برکت سے ساری کی ساری نمازی

بن جائیں گی لہ

شوہر تو خیر اسلامی نظام حیات میں گھر کا حاکم ہی ہے، بیوی اگر اخلاص وہمت سے آمادہ ہو جائے تو خود شوہر صاحب کی اصلاح ہو جاتی ہے

"حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی کا جب نکاح ہوا تو ان کے شوہر کو بالائی آمدنی میں احتیاط نہ تھی صاحبزادی صاحبہ نے پہلے ہی دن صاف کہہ دیا تھا کہ تمہارے گھر اس وقت تک کھانا نہ کھاؤں گی جب تک بالائی آمدنی سے توبہ نہ کرو گے، آخر ان کو توبہ کرنا ہی پڑی "

(وعظ مسمیٰ بہ اسباب الغفلۃ)

احقر کی دو بہنوں کی سبق آموز ہمت و دینداری کا نتیجہ اس قسم کا خود اپنا مشاہدہ ہے کہ ایک کے شوہر نماز روزہ کے پابند تو تھے مگر ڈاڑھی منڈاتے تھے انہوں نے روٹھ کر منا کر کسی نہ کسی طرح آخر داڑھی رکھوا چھوڑی۔

اسی طرح دوسرے بہنوئی جماعت کے پابند نہیں تھے نہ زکوٰۃ کے ادا کرنے کا کا اہتمام تھا ان کو دوسری بہن نے نرمی گرمی سے کہتے کہتے آخر کار دونوں چیزوں کا ہی پابند کر لیا۔ اسی طرح اپنی اولاد سے صرف اتنا کہہ دیا کہ جو مسجد نہ جائے گا اس کے کھانے کے برتن الگ کر دوں گی، باقی نہ کرنے والوں کے بہانے ہزار ہیں۔

"یہ تو بیوی کو نماز کا حکم نہ کرنے کا ذکر تھا۔ اسی طرح اولاد کو نہ نماز پر کچھ کہتے ہیں نہ احکام پر، اگر بچہ اسکول میں فیل ہو جائے تو اس کو بیحد ملامت

لہ کیا اور کس طرح عرض کیا جائے کہ دعوت عام کے اچھے اچھے اہل علم و اخلاص کو دیکھا کہ اہل و عیال فسق تک کے منکرات میں مبتلا ہیں مگر تغییر بالید کا کیا ذکر باللسان و بالقلب کا بھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ بلکہ بعض تو اسکو حکیمانہ تبلیغ کے اس زمانہ میں خصوصاً منافی جانتے ہیں۔

کرتے ہیں جس کے خیال سے بچے بھی خوب محنت کرتے ہیں اور ملامت بھی اس درجہ کہ بعضے بچے اس کا تحمل نہ کر کے ندامت میں جان تک دیدیتے ہیں۔ کانپور ہی کا واقعہ ہے کہ ایک لڑکا فیل ہو گیا تھا ریل کی پٹڑی پر جا لیٹا اور کٹ گیا۔ اسی طرح اٹاوہ میں ایک نے افیون کھا کر جان دیدی لیکن اگر صاحبزادے نماز قضا کرتے چلے جائیں تو ابا جان مارے محبت کے کبھی کچھ نہیں کہتے الغرض دعوت الی اللہ کا اہتمام ہی قلوب سے نکل گیا ہے

اس کے بعد دعوت کے مختلف درجات بیان فرمائے گئے ہیں تاکہ جو جس درجہ کا اہل ہو ویسا ہی اہتمام کرے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص سب درجوں کا اہتمام کرے، یہ درجات وہی ہیں جن کا ابھی اوپر ذکر آچکا ہے لیکن خود حضرت کی زبان مبارک سے سن لینا چاہئے۔

دعوت عام و خاص

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" کی آیت میں حکم ہے کہ تمہارے اندر ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خیر کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے، جس سے معلوم ہوا کہ یہ کام ایک خاص جماعت کا ہے ساری امت کا نہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ کہ یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں میں اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ میں بھی اور جتنے میرے متبع ہیں وہ بھی اور حق تعالیٰ تمام برائیوں سے پاک ہے اور میں مشرکین میں سے

نہیں ہوں"۔ تو یہاں مطلقاً مَنِ اتَّبَعَنِیْ ہے یعنی جتنے میرے متبع یا پیرو ہیں سب اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ اس میں عموم ہے لہذا اس عموم وخصوص سے معلوم ہوا کہ دعوت کے مختلف درجات و مراتب ہیں ایک درجہ کا پہلی آیت میں ذکر ہے اور ایک کا دوسری میں۔

دعوت حقیقی و حکمی

ایک دعوت عامہ ہے اور ایک دعوتِ خاصہ، پھر خاصہ کی دو قسمیں ہیں حقیقی و حکمی۔ حکمی سے مراد وہ ہے جو حقیقی میں معین ہو تو اس طرح کل تین قسمیں ہیں اور ہر شخص کے متعلق اس کے لحاظ سے ایک ایک قسم ہوگی۔ چنانچہ دعوت خاصہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور وہ وہ ہے کہ جس میں اپنے اہل و عیال کو، دوست احباب کو، خود اپنے نفس اور جن جن پر قدرت ہو خطاب خاص کے ساتھ دعوت ہو۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ یعنی تم میں سے ہر ایک راعی (نگران) ہے اور ہر ایک سے بازپرس ہوگی کہ اپنے رعیت کے ساتھ (جن کی نگرانی سپرد تھی) کیا کیا۔

قرآن میں بھی اس دعوتِ خاصہ کا ذکر ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا یعنی اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ لہذا یہ دعوتِ خاصہ تو ہر شخص پر فرض ہے اور ہر شخص کو اپنے گھر اور تعلقات والوں کے ساتھ حسب تعلق اہتمام کرنا چاہیے۔

عوام کا کیا ذکر خواص اہل دین اور علماء سے سوال ہے کہ وہ دعوت

خاصہ کے فرض کو کہاں تک ادا فرماتے ہیں، احقر نے تو حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے علاوہ مشکل ہی سے کہیں دیکھا ہوگا کہ یہ خواص بھی اپنے محکومین وزیر نگرانی لوگوں، اہل وعیال وغیرہ کو نرمی یا سختی سے جس طرح بھی بن پڑے، اتباع احکام پر آمادہ یا مجبور کرتے ہوں۔

اور ایک دعوت عام ہے۔

جس میں عام خطاب ہوتا ہے یہ کام صرف مقتداؤں کا ہے جیسا کہ وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ سے معلوم ہو رہا ہے اور اس میں ایک راز ہے کہ دعوت عام یعنی وعظ کا اثر اسی وقت ہوتا ہے جب کہ مخاطب کے دل میں دعوت دینے والے کی وقعت ہو۔ بلکہ مطلق دعوت میں بھی اگر داعی کی وقعت نہ ہو تو وہ مؤثر نہیں ہوتی اور ظاہر ہے کہ بجز مقتدا کے اور کسی کا اثر عام لوگوں کے دل پر نہیں ہوتا اور باقی ایسے کتنے ہوتے ہیں جو قائل کو نہیں صرف قول کو دیکھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ حدیث میں امامت کبریٰ کے لئے الائمة من قریش کی خصوصیت کی گئی کہ چونکہ قریشی خاندانی ہیں ان کی ماتحتی سے عار نہ ہوگی، دوسرے اس لئے بھی مقتدا اور عالم ہونے کی ضرورت ہے کہ خطاب عام کرتا یا وعظ کہتا ہوا دیکھ کر لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ دین کے مقتدا و عالم ہیں جن سے شرعی و فقہی مسائل دریافت کریں گے اور یہاں مسائل کے نام صفر ہوگا اور اتنی ہمت نہ ہوگی کہ کہہ دیں کہ ہم کو معلوم نہیں اور ہر وقت ایسی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی کہ ٹال دیا کریں تو لامحالہ اس حدیث کا مضمون ہوگا کہ فافتوا بغیر علم فضلّوا

وَاَضَلُّوْا ، یعنی بغیر علم کے جو جی میں آئے گا فتویٰ دیدیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

رہی تیسری قسم دعوت حکمی کی تو وہ یہ ہے کہ عام دعوت تبلیغ کرنے والوں کی اعانت کی جائے تاکہ وہ اپنی ضرورت وحاجت سے مستغنی وبے فکر ہوکر اس خدمت کو انجام دے سکیں

داعی کی دو قسمیں

اب باعتبار نوع دعوت ، داعی کی اور دو قسمیں بھی ہیں ایک وہ جو تحقیقی جواب سے دعوت کر سکتا ہے اور ایک وہ جو الزامی جواب سے تحقیقی جواب کے یہ معنی ہیں کہ کسی نے جو کچھ پوچھا جواب میں اس کی اصل حقیقت واضح کر دی اور الزامی جواب کے یہ معنی ہیں کہ جو اعتراض کسی نے ہم پر کیا ویسا ہی اس کے مذہب پر ہم نے کر دیا کہ جو جواب اب تم دوگے وہی ہمارا ہوگا پھر ان دونوں میں سے ہر ایک کے کچھ لوازم وشرائط ہیں ، تحقیقی جواب کے لئے تو اپنے مذہب پر پورا عبور ہونے کی ضرورت ہے دوسرے مذہب پر پوری نظر ہونے کی ضرورت نہیں اور الزامی جواب کے لئے اپنے مذہب کے ساتھ دوسرے کے مذہب پر بھی پوری نظر ہونے کی ضرورت ہے

خواہ یہ مذہب نقلی ہو یا عقلی (یعنی سائنس وفلسفہ وغیرہ کا کوئی نظریہ ومسلک ہو) غرض مخالفین میں دعوت وتبلیغ کا کام وہی کرے جس کی نظر ان کے مذہب اور خیالات پر ہو اور جو اپنے ہی مذہب پر نظر رکھتے ہوں وہ اپنے ہی مذہب والوں کو وعظ وتلقین کریں۔ تحقیقی جواب سے مسلمانوں کو زیادہ نفع ہوگا اور الزامی سے غیر مذہب والوں کو یا جو اس غیر مذہب کی طرف مائل ہوں ۔ خلاصہ یہ کہ خطاب خاص (یا تبلیغ خاص)

سارے مسلمانوں کو اپنے گھر (یا اپنے تعلق والوں) میں کرنا چاہیئے۔ اور خطاب عام میں ایک تو ایسے لوگ ہوں جو مسلمانوں کے لئے مناسب وعظ کہا کریں تاکہ ان کی اصلاح ہو اور ایک وہ ہوں جو ایسے لوگوں کے مقابلہ میں تبلیغ کریں جن کو اسلام پر کچھ شبہ ہو گیا ہو یا اسلام سے تعلق کم ہو گیا ہو (جیسے انگریزی خواں مسلمان) یا سرے سے غیر مسلم ہوں اور ایک آخری جماعت ایسی ہو جو ان عام تبلیغ کرنے والوں کی بشری ضرورتوں کا سامان مہیا کرے تاکہ وہ اپنے فرض منصبی میں بے فکری سے مشغول ہو سکیں باقی جن کے پاس نہ علم ہے کہ وعظ و تبلیغ کر سکیں نہ مال جس سے واعظین و مبلغین کی مدد کر سکیں وہ بھی محروم نہیں وہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو خاص تبلیغ کے علاوہ عام تبلیغ میں دعا سے حصہ لیں۔ کہ اے اللہ اسلام کو عزت دیجئے اے اللہ اسلام کی نصرت کیجئے، اے اللہ مسلمانوں کے دین کی حفاظت کیجئے، اے اللہ حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کر دیجئے اور دین کی برکتوں کو عام و تام کر دیجئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب سب اپنی اپنی خدمت میں لگیں گے تب کہیں ثمرہ مرتب ہوگا۔ اور ثمرہ نہ بھی مرتب ہو تو تم تو اپنے کام میں لگو جو تمہارا کام ہے باقی ثمرہ دینا نہ دینا اللہ کا کام ہے

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر ہمارا اسلام واقعی اسلام ہوتا، اخلاق و عادات معاشرت و معاملات ہر چیز اور ہر بات میں ہماری صورت و سیرت سے اسلام ظاہر ہوتا۔ تو ہم مجسم دعوت و تبلیغ ہوتے اور کفار ہماری صورت دیکھ کر مسلمان ہوا کرتے"

اس سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا خود ان کی خلافت کے عہد کا واقعہ ہے نقل فرمایا ہے کہ:-

کسی یہودی کے ہاتھ میں اپنی مسروقہ (چرائی ہوئی) زرہ دیکھی، طلب فرمایا تو اس نے دینے سے انکار کیا اور کہا کہ میری ہے، قاضی شریح کے ہاں دعویٰ دائر فرمایا۔ قاضی صاحب کے نزدیک شہادت کافی نہ تھی،

انہوں نے دعویٰ خارج کر دیا، پھر بھی حضرت علی رضؓ نے اس کا کچھ خیال نہ فرمایا۔ اور نہایت ہشاش بشاش اجلاس سے باہر چلے آتے، یہودی نے جو یہ رنگ دیکھا تو بڑا اثر ہوا کہ اول تو یہ بادشاہ چاہتے تو زرہ یوں ہی چھین لیتے اور جوتیاں الگ لگاتے مگر نہیں، ضابطہ کے موافق قاضی کے ہاں جاتے ہیں جو ان کا محکوم ہے اور پھر وہ آپ کی شہادت رد کر کے مقدمہ خارج کر دیتا ہے اور یہ ذرا بھی چیں بہ جبیں تک نہیں ہوتے ضرور ایسا مذہب حق ہے اس طرح فوراً زرہ کا اقرار کر کے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ ایسا مسلمان کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور جنگ صفین میں شریک ہو کر شہادت حاصل کی

ایک یہی واقعہ کیا، اسلام کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے البتہ ہم مسلمان ایسے ہیں کہ ہم کو لوگ دیکھ کر الٹے اسلام ہی کو دور سے سلام کرتے ہیں۔ ایک سفر میں راقم ہذا سے ایک تعلیم یافتہ ہندو نے اسلام کی طرف اپنا میلان ظاہر کیا اور سر کھول کر دکھلایا کہ دیکھئے چوٹی بھی کٹا دی ہے لیکن کیا کروں کہ اسلام مذہب تو اچھا ہے لیکن آج اس کے نمائندے اچھے نہیں ان میں شریک ہونے کا جی نہیں چاہتا۔

اشاعت و حفاظت دین کا اصل کارگر طریقہ

ایک زمانہ میں ارتداد کی کچھ ہوا تیز ہو گئی تھی اس زمانہ (۱۳۴۶ھ) کے ایک وعظ میں اسی حقیقت کی زیادہ دل نشین پیرایہ میں تفہیم فرمائی ہے کہ اسلام کی اشاعت و حفاظت دونوں کا اصل و کارگر طریقہ خود اپنے اسلام کو ہر اعتبار سے مضبوط و محفوظ اور مکمل بنانا ہے فرماتے ہیں کہ

دین کی حفاظت دو طرح سے ہوتی ہے ایک بیرونی حملوں کو روکنا، دوسرے خود اندرونی استحکام، یعنی خود اپنی دینی حالت کو مکمل کرنا زیادہ ضروری ہے اگر کوئی بادشاہ ساری فوج برخاست کر دے لڑائی کے سارے سازوسامان کو برباد کر دے سارا خزانہ لٹا دے اب اگر کوئی غنیم حملہ کر دے اور بادشاہ لڑائی کے لئے آمادہ بھی ہو جائے تو کیسا ظفریاب ہو سکتا ہے؟ بس وہی حالت ہو گی کہ ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

حضرات ہمیں یہ کہتا ہوں کہ اندرونی حفاظت کی زیادہ ضرورت ہے خود اپنے اندر اسلام کو راسخ کرنا شریعت کا اتباع کرنا یہی اندرونی حفاظت ہے کامل مسلمان بن جاؤ احکام شریعت کی پورے طور سے پابندی کرو خواہ مخواہ لڑو مت، صاحبو! ہر شئے کا ایک اثر ہوتا ہے اسلام کامل کا بھی ایک اثر ہے واللہ جو کام خارجی قوت سے نہیں ہوتا وہ داخلی سے ہو جاتا ہے، پہلے زمانہ میں ہمارے بزرگوں کو دیکھ کر ان کے اعمال، ان کی معاشرت کو دیکھ کر اسلام میں لوگ داخل ہو جاتے تھے زور و زبردستی سے نہیں ہوتے تھے مگر اب ہمارے اعمال خراب اخلاق خراب، معاشرت گندی، معاملات خراب۔ اگر کوئی مسلمان ہونا چاہے تو کیا دیکھ کر ہو۔ (ملخصاً ص ۱۰ / ۱۱)

اس موقعہ پر ایک اور غلطی اور کید نفس پر تنبیہ فرمائی گئی ہے، آج کل تقریروں تحریروں میں عام طور سے اسلام کے ضعف و زوال کا رونا ہے زوالِ اسلام کے نام سے کتابیں اور مضامین لکھے جاتے ہیں اور یہ زیادہ تر دشمنوں یا نادان دوستوں کی تعبیر ہے جس کو جہل کی وجہ سے ہمارے نام نہاد پڑھے لکھوں نے بھی اختیار کر لیا ہے

حالانکہ :-

اسلام اپنی ذات میں کامل و مکمل ہے اس میں کبھی ضعف نہیں آسکتا اسلام اسی وقت ضعیف ہوسکتا ہے جبکہ نعوذ باللہ خدا ضعیف ہوجائے، اسلام خدا کا قانون ہے وہ کیسے ضعیف ہوسکتا ہے یہ محاورہ بالکل غلط اور قابل اصلاح ہے کہ اسلام ضعیف ہوگیا۔ البتہ اگر یہ معنی ہیں کہ وہ اسلام جو ہماری ایک صفت ہے وہ ضعیف ہوگیا ہے یعنی ہم جس صفت کے ساتھ متصف ہیں اس اتصاف میں کمی ہے تو یہ مسلم ہے مگر پھر یہی بات کیوں نہ کہو کہ آج کل ہم کمزور ہیں یوں کیوں کہتے ہو کہ اسلام کمزور ہو گیا اس میں تو دھبہ آتا ہے خود اسلام پہ

ہماری بعینہ وہی مثال ہے جیسے میرے ایک عزیز بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت اپنے بچے کو پاخانہ پھرا کر اور کپڑے سے پونچھ کر چاند دیکھنے کھڑی ہوگئی چاند رات کا دن تھا وہ بھی ناک پر انگلی رکھ کر دیکھنے لگی تو پاخانہ کی بو آئی کیونکہ جلدی میں پاخانہ انگلی میں لگ گیا تھا تو کیا کہتی ہے کہ ادئی ابکی چاند سڑا ہوا کیوں نکلا۔ حالانکہ سڑی وہ خود تھی اسی طرح ہم چاند پر خاک ڈالنا چاہتے ہیں کہ اپنے ضعف کو اسلام پر لگاتے ہیں اور اس میں نفس کا ایک کید ہے کہ اگر ضعف کو اپنی طرف منسوب کریں تو اس کا تدارک کرنا پڑے گا یعنی اپنے اسلام کو پختہ و کامل کرنا پڑے یعنی بہت کچھ خود کرنا پڑے اور اب تو خدمت اسلام کے لئے ایسے لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں جن کے عقائد تک درست نہیں

مگر یہ اصل میں خدمت اسلام کے لئے کھڑے ہی کب ہوتے ہیں یہ تو کھڑے ہوتے ہیں کونسل کی ممبری، کیبنٹ کی منسٹری یا اور کسی گھٹیا بڑھیا لیڈری کیلئے

ایک ایسا ہی چاند سر پڑے ہونے کا ماجرا اپنا یاد آگیا۔ ایک بڑے نامی گرامی پرانے وکیل جو راقم ہذا کے مقابلے میں بزرگی کا مرتبہ رکھتے ہیں جب کبھی ملاقات وزیارت ہوتی ہے آج کل کے رواج کے موافق کچھ نہ کچھ اسلام، مسلمانوں اور قوم کی تباہی و تنزل کی مرثیہ خوانی ضرور فرماتے ہیں

ایک دفعہ احقر نے با ادب عرض کیا کہ حضرت مسلمانوں میں جو قومی خرابیاں ہیں وہ کچھ آپ یا آپ کے گھر میں بھی ہیں، آخر پرانے تجربہ کار ذہین وکیل تھے برجستہ فرمایا کہ بھائی اب اس بحث کا ہمیشہ کے جواب مل گیا۔

غرض تبلیغ بھی تبلیغ جب ہی ہو گی جب کہ ہم اور خصوصاً ہمارے مبلغین یا خدمت اسلام کے دوسرے مدعی خود سراپا اسلام ہوں لیکن اس تفریط کے ساتھ افراط کی دوسری غلطی میں نہ پڑ جاویں کہ جب خود ہی پورے مسلمان نہیں ہیں تو دوسروں کو اسلام کی کیا دعوت دیں یہ ایسا ہی جیسے کوئی کہے کہ جب تم خود کسی بدپرہیزی کی بدولت بیمار ہو تو اہل و عیال، متعلقین و احباب کو بھی اس بدپرہیزی سے نہ روکنا چاہیئے یہ بڑی غلطی و غلط فہمی ہے دعوت و تبلیغ بجائے خود ایک مستقل فرض ہے ایک فرض میں کوتاہی سے دوسرا فرض ساقط نہیں ہو جاتا۔ کہ اگر روزہ نہیں رکھتے تو نماز کیوں پڑھیں اور کیسی عجیب بات ہے کہ

بعضے تو یہاں تک اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ اپنے وعظ کہنے کو شرعاً منع سمجھتے ہیں اور قرآن سے اس کی سند پکڑتے ہیں کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ایک دوسری آیت میں ہے اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ تو پہلی آیت کا تو وہ مطلب ہی نہیں جو بظاہر ترجمہ سے لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ جو کرتے نہیں وہ کہتے کیوں ہیں، مطلب یہ ہے کہ ایسا

قول وافرار یا دعویٰ ووعدہ کیوں کرتے ہو جو پورا نہیں کرتے جیسا کہ شان نزول سے بھی ظاہر ہے کہ لوگوں نے کہا تھا کہ اگر ہم کو کوئی ایسا عمل معلوم ہو جائے جو اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ وافضل ہو تو اس کے لئے ہم ایسی ایسی کوشش کریں پھر قتال وجہاد کا حکم ہونے پر جان بچانے لگے اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسی بات کہتے ہی کیوں ہو جو کرتے نہیں۔ اور دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور خود اپنے کو بھولے ہو۔ جس کے معنی یہ نہیں کہ اپنے کو بھلانے والے یا بدعمل کو وعظ کہنے کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ وعظ کہنے والے کو خود اپنے کو بھلانے یا بدعملی کی ممانعت فرمائی گئی ہے جیسا ہمارے خاص محاورہ میں بھی کہتے ہیں کہ دوسروں کو تو فلاں کام کیلئے کہتے ہو اور خود نہیں کرتے یعنی خود تو بدرجۂ اولیٰ اور ضرور ہی ایسی صورت میں کرنا چاہئے جب کہ دوسروں سے کہتا ہو۔

بہرحال بلا عمل وعظ کہنے کی ممانعت نہیں بلکہ جو شخص وعظ کہتا ہو اس کو خصوصاً عمل کی بھی زیادہ کوشش کرنی چاہئے نہ یہ کہ وعظ بھی ترک کردے البتہ ایسے شخص کا وعظ جو کہ بدعمل ہو نور وبرکت سے ضرور خالی ہوتا ہے لیکن بدعمل وبدکار کی نماز میں بھی نورانیت نہیں رہتی تو کیا اس سے نماز کی فرضیت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔

ہاں اگر کسی موقعہ پر تبلیغ یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں ایسی اذیت کا اندیشہ ہو جو برداشت نہ ہو سکے تو معاف ہے گو اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ ایسی اذیت کا اندیشہ کیا، واقعہ بھی پیش آجاتے تو بھی باز نہیں آتے، ایک جامع مسجد میں بیچارے ایک عطر فروش نے جماعت کے بعد کسی کو سنتیں پڑھتے ہوتے دیکھا کہ رسمی اٹھک بیٹھک کر رہے ہیں اور تھے کوئی بڑے عہدیدار، اس غریب عطر فروش نے سلام کر کے عرض کیا

کہ حضور آپ کی نماز ٹھیک نہیں ہوئی پھر سے پڑھ لیں، بس آگ بگولا ہو گئے کہ نالائق بیہودہ تیری یہ جرأت و گستاخی؟ اس نے کہا کہ صاحب گستاخی نہیں خیر خواہی ہے یہاں تک بات بڑھی کہ وہ عہدہ دار اس غریب کو مارنے لگے اس نے کہا کہ آپ اور ماریں مگر میں آپ کو مسجد سے نکلنے نہ دوں گا جب تک کہ آپ نماز نہ دہرالیں لوگ جمع ہو گئے اور عہدیدار صاحب سے کہا کہ اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے پھر سے کیوں نہیں پڑھ لیتے آخر پڑھنا ہی پڑی اور پھر ایسی تعدیل ارکان کے ساتھ پڑھی کہ عمر بھر نہ پڑھی ہو گی۔" (الدعوت الی اللہ)

تبلیغ سے بے پروائی اور حیلہ جوئی کا سبب دنیاوی اغراض

بلا شبہ یہ اُن عطر فروش کی غیر معمولی ہمت و عزیمت کی بات تھی جو واجب و فرض بہر حال نہیں لیکن جو کچھ اتنی ہمت و عزیمت کے بغیر بھی بآسانی ممکن ہے اس سے بھی اعراض و بے پروائی کا سبب محض دنیاوی اغراض کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

حتی کہ اگر اپنی آنکھوں سے بھی دیکھیں اور دیکھتے ہی رہتے ہیں کہ اگر کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی تو یہ بھی ہمت نہیں ہوتی کہ اتنا تو کہہ دیں کہ بھائی پھر سے پڑھ لو، نماز نہیں ہوئی (صَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ)

وجہ فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیاوی اغراض فوت ہوتی ہیں کہ اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو دوستی نہ رہے گی میل ملاپ نہ رہے گا آپس میں ہنسی خوشی نہ رہے گی۔

حیلوں کی حقیقت

اس سے بھی بڑھ کر غضب یہ کہ آج کل درویش یا بزرگ کے یہ معنی سمجھتے ہیں جو نہ کسی کو کچھ کہے نہ سنے نہ روکے نہ ٹوکے بس سب کے ساتھ صلح کل ہو کر رہے اور اس کے لئے ایک شعر گڑھا ہے جس میں "حافظا" دیکھ کر یا لگا کر اس کو خواجہ حافظ علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب کر دیا ہے ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص وعام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

حالانکہ حافظ شیرازی شاید رام رام بھی جانتے ہی نہ ہوں گے، پھر دیوان حافظ میں تحریفوں کے باوجود مزا یہ کہ دیوان میں اس شعر کا پتہ نہیں ہاں کسی دیوانے حافظ کا ہوگا۔ ہاں البتہ ایک اور شعر بھی ہے جس سے آج کل کے صوفی اپنے صلح کل مسلک پر استدلال کرتے ہیں اور وہ واقعی حافظ کا ہے ؎

مباش درپئے آزار وہرچہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

تو اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ آزار کے قصد سے کسی کو آزار نہ دو اور یہی درحقیقت آزار کے درپئے ہونا ہے باقی جو شخص اصلاح کی غرض سے آزار دے جیسے طبیب و ڈاکٹر اپریشن کرتا ہے یا باپ و استاد تادیباً بچے کو مارتا ہے اسی طرح اگر امر بالمعروف کرنے والے سے کسی کو آزار پہنچے بھی تو یہ درپے آزار ہونا نہیں ہے۔ (آداب تبلیغ)

اور اگر درپئے آزار ہونے کے معنی ایسے ہی عام ہیں تو پھر مرزا بیدل کی جو حکایت حضرت نے نقل فرمائی ہے وہ اس کا ایسا جواب ہے کہ جس دل

میں ذرہ بھر بھی ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہو وہ لرز جاتا ہے۔

"مرزا کے اشعار میں تصوف کا رنگ ہوتا تھا کوئی ایرانی ان کو پڑھ کر اور مرزا کو بزرگ سمجھ کر ان کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ ڈاڑھی منڈا رہے ہیں یہ دیکھ کر غصہ آگیا اور جھلا کر پوچھا۔ "آغا ریش می تراشی" شاعر نے جواب دیا۔ بلے ریش می تراشم ولے دل کسے نمی خراشم" وہ بچارہ مخلص تھا جواب دیا۔ ارے دلِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) می خراشی ظالم! تو تو سب سے بڑے دل کو چھیل رہا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ "دلِ کسے نمی خراشم"، تم یہ داڑھی پر استرا نہیں پھرا رہے ہو بلکہ حضور کے دل پر چھری چلا رہے ہو، حضور کی خدمت میں جب اعمال پیش ہوتے ہیں اور آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ میری امت کا فلاں شخص یہ حرکت کر رہا ہے تو کیا اس سے آپ کا دل نہیں دکھتا اور کیا آپ کا دل دکھانا چھوٹی بات ہے آپ کا قلب تو سید القلوب ہے جب تم سید القلوب کو تکلیف دیتے ہو تو پھر یہ دعویٰ کیسے کرتے ہو کہ ہم کسی کا دل نہیں دکھاتے آخر مرزا کے دل میں ایمان تھا یہ جواب سن کر آنکھ کھل گئی اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئے ہوش آیا تو توبہ کی اور بزبان حال یا قال کہا کہ:۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی
مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

راقم احقر بھی اسی رنگ کی ایک بات کبھی کبھی بعض حضرات کی خدمت میں عرض کر دیتا ہے کہ بھائی آدمی شکل وصورت، وضع قطع فطرۃً اسی کی اختیار کرتا ہے جس کی اس کے دل میں محبت یا عظمت ہوتی ہے تو بس ایسی حرکات کے وقت اتنا تو سوچ

لیا کرو کہ جو صورت تم بنا رہے ہو یہ کرزن کی ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور تمہارا یہ چہرہ تمہارے دل کے اندر کس کی محبت و عظمت کی گواہی دے رہا ہے؟ محمد رسول اللہ کی جن پر ایمان اور جن کی محبت کا دعویٰ ہے یا ان کے دشمنوں کی؟ اگر کفار یا فساق کی وضع قطع اختیار کرنے کی تائید میں فقہی قیل و قال یا تجددی دلائل کا بہانہ تلاش کرنے کے بجائے احقر کا پیش کردہ مراقبہ، یہ بھی نہ سہی تو مرزا بیدل ہی کی حکایت کو سامنے رکھا جائے تو کون مومن دل ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو دکھانا گوارا کرے گا! اور جس کے اندر وہی ٹیس نہ اٹھے جو غریب ایرانی کے ٹوک دینے سے بیدل کے اندر اٹھی تھی۔ ایک مومن کو تو اس حکایت کے بعد بس اس پر غور کرنا چاہیے کہ — وہ جب ہم سے کوئی خلاف شرع بات سرزد ہوگی تو حضور کو اس سے آزار ہوگا یا نہیں۔ اس لئے ترک احکام شرعیہ کے لئے ایسی ایسی باتوں کو آڑ بنانا "مباش در پئے آزار ہر چہ خواہی کن" بالکل واہیات ہے۔"

پھر سیدھا جواب یہ ہے کہ نصوص کے مقابلہ میں ایسی واہیات باتیں یا اشعار سب ہیچ ہیں بس ہم تو یہ جانتے ہیں کہ خدا و رسولؐ کا یہ حکم ہے اور نصوص کے اندر امر بالمعروف کا حکم موجود ہے اور اس کے نہ کرنے پر نکیر ہے، بس اس کو کرو۔"

البتہ شرائط و احکام کے ساتھ کرو اندھا دھند مت کرو فقہاء نے اس کے قوانین و ضوابط مدون کر دیئے ہیں ان کو سیکھو، علماء سے پوچھو وہ تم کو راستہ بتا دیں گے۔ باقی اس قسم کے اشعار سے نصوص کا مقابلہ مت کرو۔"

امر بالمعروف کے بعض حدود و شرائط

بہت سی اصولی باتیں ان احکام و شرائط کی بھی حضرت نے اپنی کتابوں اور مواعظ میں بیان فرما دی ہیں، مثلاً خطاب عام یا وعظ صرف علماء کا کام ہے عوام پر صرف خطاب خاص، وہ بھی زیادہ تر اپنے اہل و عیال و اتباع کے حق میں واجب ہے یا کوئی بات جو ہم کو معلوم ہے اور دوسرا اس میں لاعلمی کی وجہ سے غلطی یا کوتاہی کر رہا ہے تو اس کو بتا دینا واجب ہے اور اگر لاعلمی نہیں بلکہ سستی یا کج فہمی جہالت یا بدعت وغیرہ میں ابتلاء اس کا سبب ہے تو اگر تمہارا اتنا اثر ہو اور کسی وجہ سے قرائن سے گمان غالب ہو کہ تمہارا کہنا مان لے گا تو بھی واجب ہے ورنہ مستحب اور اگر قرائن سے گمان غالب ہو کہ ماننا تو کیا الٹے فتنہ و فساد، لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جائے گا جس کا تم مقابلہ یا تحمل نہیں کر سکتے یا تمہاری کم علمی یا مغلوب الغضب ہونے کی بناء پر حدود سے نکل جانے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورتوں میں تبلیغ مستحب بھی نہیں بلکہ ممنوع ہے اس لئے کہ جس طرح ہر چیز کے حدود ہیں تبلیغ کے بھی حدود ہیں الاٰمرون بالمعروف والناھون عن المنکر کے بعد ساتھ ہی والحافظون لحدود اللہ لگا ہے لہٰذا امر بالمعروف و نہی عن المنکر تو سر سے پیر تک حدود و ضوابط سے مقید ہے جس کے جاننے کے لئے نصاب الاحتساب کافی ہے۔ جاہل کو امر بالمعروف جائز نہیں کیونکہ وہ اصلاح سے زیادہ افساد کرے گا۔

اس سلسلہ میں خود حضرت نے اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ مکہ میں مجھے ایک جاہل نے امر بالمعروف کیا کہ تم عمامہ کیوں نہیں باندھتے یہ سنت ہے میں نے کہا کہ تم لنگی کیوں نہیں باندھتے یہ بھی سنت ہے

سوچ کر کہنے لگے میں بوڑھا ہوں لنگی میرے جسم پر ٹھہرتی نہیں میں نے کہا میں جوان ہوں عمامہ سے گرمی لگتی ہے اس پر بہت جھلائے، کہنے لگے کہ خدا کرے تمہارے دماغ میں اور گرمی بڑھ جائے۔

بھلا ایسے جاہلوں کو جو امر بالمعروف سے پہلے مخاطب کی حالت بھی نہ دریافت کریں اور ایک سنت زائدہ کے لئے اس سختی سے امر بالمعروف کریں کیونکر امر بالمعروف جائز ہو سکتا ہے" (الحدود والقیود ص۳۵)

اسی طرح واعظین یا خطاب عام والوں کے لئے ضروری علم کے علاوہ یہ بھی بہت ضروری ہے کہ کسی قسم کی طمع و حرص ہرگز نہ رکھیں۔ کسی کی دعوت وغیرہ تک بلا سابق و خاص تعلق کے قبول نہ کریں۔ اگر پیر ہوں تو وعظ و تبلیغ کی جگہوں میں کسی کو مرید بھی نہ کریں نہ کسی سیاسی جھگڑے میں پڑیں نہ خانگی نزاعوں میں۔ وَقِسْ عَلٰی ھٰذَا

ایک آیت سے استنباطات

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کی آیت کے تحت حضرت نے جا بجا تبلیغ و دعوت کے جو اصول و قواعد مستنبط فرمائے ہیں وہ ملخصاً سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں ارشاد ہے کہ :-

اس آیت میں سبیل رب کی طرف بلانے کا حکم ہے جس کے تین طریقے اللہ تعالیٰ نے بتلائے ہیں ایک حکمت کا طریقہ، دوسرا موعظہ حسنہ، تیسرا مجادلہ کا۔ اس کا جو مطلب میری سمجھ میں آیا ہے عرض کرتا ہوں جب کسی کو سبیل رب یا اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف دعوت دیجاتے گی تو اس میں ایک

تو داعی کا خاص مطلوب دعویٰ ہوگا اور ایک دعویٰ اس کی نقیض یا منافی صورت ہوگی جو داعی کے مذہب مخالف کا دعویٰ ہوگا اس لئے گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہوگی ایک اپنے دعوے کا اثبات اور دوسرے مخالف کے دعوے کا ابطال۔ لہٰذا حکمت تو یہ ہے کہ اپنے دعوے پر علمی و عقلی دلائل قائم کئے جائیں اور مجادلہ یہ ہے کہ مخالف کے دعوے کو باطل کیا جائے۔ اصل مقصود تو یہی دونوں ہیں

باقی تیسری چیز ایک اور موعظہ حسنہ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے اس لئے موعظہ حسنہ کا بھی ایک طریقہ تبلادیا۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو محض ضابطہ کا پابند، جو محض ضابطہ کی خانہ پری کرکے بے فکر ہوجاتا ہے اور دوسرا جس کو سامعین پر خاص شفقت بھی ہوتی ہے مثلاً منادی کا کام ضابطہ کے ساتھ صرف حکم پہنچا دینا ہے اس سے اس کو بحث نہیں کہ تم مانو یا نہ مانو، اور مثلاً باپ وہ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ شفقت کی وجہ سے ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا جہاں تک ہوسکے مان ہی لے اب ظاہر ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی شفیق ہے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی خیرخواہ، لہٰذا اولاً حضور اور پھر حضور کے واسطہ سے امت کو فرمایا کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفاء نہ کرو، بلکہ ساتھ ساتھ موعظہ حسنہ سے کام لو!

جس کی حقیقت خود حکمت کے تقابل سے معلوم ہوتی ہے کہ جب حکمت سے علمی دلائل مراد ہیں تو موعظہ حسنہ سے ان کے سوا کچھ اور مراد ہوگی اور وہ ایسی مؤثر باتیں ہیں جن سے مخاطب میں نرمی اور قبول کا میلان پیدا

ہو، اس کا دل پگھل جائے اس کو قبول کی رغبت اور انکار سے خوف پیدا ہو، مثلاً دوزخ و جنت کی ترغیب و ترہیب کے مضامین کہ فلاں کام کروگے تو ایسی ایسی جنت ملیگی جس میں فلاں فلاں آسائشیں ہوں گی یا نہ کروگے تو دوزخ میں جاؤگے جس میں فلاں فلاں مصیبتیں ہوں گی گو یہ بھی احکام ہی ہیں مگر جب دوزخ و جنت کا معتقد بنانا مقصود نہ ہو بلکہ صرف ترقیق قلب مقصود ہو تو وہاں ان کی حیثیت ترغیب و ترہیب کی ہے باپ اگر بیٹے کو کسی چیز سے روکتا ہے تو گو اتنا کہہ دینا کہ فلاں چیز نہ کھانا حاکمانہ حق ادا کرنے کے لئے کافی ہے مگر باپ تو اتنا ہی نہیں کرتا بلکہ شفقت کی وجہ سے کہتا ہے کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے دست آور ہے پیٹ میں درد پیدا کردے گی، اس کے کھانے سے دانے نکل آئیں گے اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے کہ اگر یہ دوا پی لوگے تو تم کو یہ دوں گا وہ دوں گا۔ غرض چونکہ ایسے آدمی کم نکلیں گے جو محض امتثال امر کے لئے کسی کام کو کرلیں۔ اس لئے ترغیب و ترہیب کی بھی ضرورت ہے۔ پھر آگے مجادلہ میں "احسن" کی قید بھی لگائی اس لئے کہ حکمت کی صورت یعنی اپنے دلائل بیان کرنے میں تو کسی کو ناگواری نہیں ہوتی البتہ دوسرے کا دعویٰ رد کرنے میں کبھی انقباض بھی ہوتا ہے تو یہاں قید لگادی کہ رد اگر ہو تو بطریق احسن ہو جس سے مخالف کو رنج و کلفت نہ ہو۔

سبحان اللہ مخالف کی بھی اتنی رعایت کہ اس پر حقیقت تو منکشف ہو جائے مگر اس کو برا بھلا نہ کہا جائے البتہ رد یا جواب گول مول نہ ہو جیسا کہ بعضوں کا ہوتا ہے جس سے حقیقت بھی پوری طرح واضح نہیں ہوتی یہ حسن مجادلہ کے خلاف ہے چنانچہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ ط

کا یہی مطلب ہے کہ کھول کر صاف بیان کرو، ورنہ جہل سے نجات نہیں ہوتی جو شخص گول مول بات کرتا ہے اس سے ہر شخص راضی تو رہتا ہے مگر مخاطب جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ بات صاف ہو مگر الفاظ سخت نہ ہوں۔

تبلیغ میں افراط کی غلطی کی اصلاح

ہماری سب سے بڑی کوتاہی تو یہی تھی کہ تبلیغ خاص ہو یا عام، علماء ہوں یا عوام کسی کو کسی طرح اپنے فریضۂ دعوت کی کوئی پرواہ ہی نہیں یا اگر پرواہ ہے تو بوجھ کی طرح اتار دیا اور نفع و ثمرہ کے لئے حکمت و موعظۂ حسنہ و مجادلۂ حسنہ کی پوری تدبیر نہیں اختیار کرتے (والشاذ کالمعدوم) لہٰذا زیادہ تر نفس اس فریضہ کی اہمیت اور ضرورت اور اس کے نافع و مثمر آداب و شرائط ہی کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے، لیکن کہیں کہیں اس باب میں افراطی غلطی بھی ہوتی ہے اس لئے کچھ اس پر بھی متنبہ فرمایا گیا ہے کہ :۔

ایک باریک نکتہ وادب تبلیغ کا اور رہ گیا..... جَادِلْهُمْ تک تو یہ معلوم ہوا کہ تبلیغ شفقت سے ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کما حقہٗ تبلیغ کے بعد بھی شفقت کی وجہ سے ثمرہ و نتیجہ کی فکر میں لگے رہو، یہ ایک غائلہ ہے جس کو لوگ کمال سمجھتے ہیں اور ہے واقع میں نقص، وہ یہ کہ جب شفقت اعتدال سے زیادہ ہوتی ہے تو نتیجۂ عاجلہ پر نظر ہوتی ہے اور اس کو پہلے ہی سے سوچ لیتے ہیں کہ یہ اثر ہوگا حالانکہ اصل نتیجہ رضائے حق ہے اور وہ تبلیغ بطریق مذکور پر فوراً مرتب ہو جاتا ہے اور ثمرۂ عاجلہ بھی اگر ہوتا ہے تو اسی کی برکت سے مگر ہمارے اندر عجلت زیادہ ہے چاہتے ہیں کہ بس جلدی اثر ظاہر ہو جائے گو اس میں نیت دین

ہی کی ہو،

پھر اگر ان ثمرات کا ترتب نہیں ہوتا تو حزن و ملال ہوتا ہے بعض وقت یاس تک نوبت آجاتی ہے۔ اور مخاطب پر غیظ و غضب ہوتا ہے یا حاضر و غائب برا بھلا کہتے ہیں کہ جا نالائق تجھے اس قدر سمجھایا اتنی کوشش کی مگر نہ سمجھا، ساری محنت ضائع کی اور اگر اس پر قدرت ہوتی ہے تو کبھی اس کو سزا دیتے ہیں وہ بھی اعتدال سے زیادہ اور بعض اوقات تنگ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ جا بھاڑ میں پڑ، غرض یہ اثر ہے ظاہری اثرات پر نظر کا اسی طرح جب مبلغ کو محزون و غمگین دیکھا جاتا ہے تو بڑا کمال سمجھا جاتا ہے کہ ہمہ تن اسی طرف متوجہ ہے اور دوسروں سے بھی کہہ رہے ہیں کہ بھائی اس کے لئے دعا کرو کہ اصلاح ہو جائے مثلاً بیٹا نماز نہیں پڑھتا تو اس کو سمجھاتے ہیں کڑھتے ہیں دل سے دعا کرتے ہیں دوسروں سے تعویذ لکھاتے ہیں۔

گو یہ سب باتیں محمود اور اچھی ہیں مگر ان میں غلو بھی نہ چاہئے ورنہ یہ غیر معتدل شفقت کمال کے بجائے نقص بن جاتی ہے کیونکہ اس کا انجام یاس و تعطل ہوتا ہے اور بالآخر آدمی سرے سے تبلیغ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ لہٰذا اس ادب تبلیغ کا حاصل یہ ہوا کہ ثمرات کے مرتب نہ ہونے پر زیادہ محزون نہ ہو سوچ سوچ کر غم نہ کرے ہاں طبعی حزن کا مضائقہ نہیں اس میں ثواب ہے لیکن اتنا غلو کہ روتے روتے آنکھیں پھوڑ لے اور ہمت ہی ٹوٹ جائے برا ہے نصوص سے اتنے حزن و ملال کی اجازت نہیں جیسے کہ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ اور لَعَلَّكَ بَاخِعٌ

نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ وغیرہ آیات سے معلوم ہوتا ہے

اسی لئے وَجَادِلْهُمْ کے بعد ہی اس ضرر کا تدارک کیا عجیب فرماتے ہیں کہ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ہ یعنی تبلیغ کر کے نتیجہ کی فکر میں زیادہ نہ پڑو۔ یہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے ماحصل یہ ہے کہ ان آیات میں تفریط و افراط دونوں سے تعرض کیا گیا ہے تفریط سے اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ الآیۃ میں اور افراط کی مخالفت اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ سے فرمائی گئی۔

اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ آج دین کے معاملات میں اتنی غیر معمولی شفقت اور اتنا غلو و افراط کتنوں کو ہوتا ہے اور اصل کوتاہی و غفلت ہر طبقہ سے تبلیغ کے معاملہ میں تفریط ہی کی ہے تاہم حضرت مجدد وقت علیہ الرحمۃ کی تجدیدی نظر نے جس طرح ہر امر میں افراط و تفریط دونوں کی اصلاح فرمائی ہے اس میں کیسے صراط مستقیم کو نظر انداز فرماتے۔ لہٰذا دونوں باتوں کے جمع کا طریقہ یہ فرمایا کہ سعی و تدبیر تو ہدایت و اصلاح کی پوری ہو

مگر اس میں نیت فقط رضائے حق کی ہو یہ نیت ہی نہ ہو کہ وہ مسلمان ہو ہی جائے ہاں دعا کرتے رہیں کہ یا اللہ اس کو مسلمان بنا دیجئے، اس کے دل میں اپنا خوف پیدا کر دیجئے، دعا تو یہ کرے اور عمل وہ کہ کام میں صرف رضائے حق کو مد نظر رکھے۔ (آداب التبلیغ ص ۳۷)

دینی طلبہ کو خصوصی تنبیہ

اسی سلسلہ میں عربی و دینی مدارس کے طلبہ کو جو مقتدا بننے والے ہیں خصوصًا

متنبہ فرمایا گیا ہے کہ جس طرح دین کے تمام شعبوں میں ان کے لئے کمال وجامعیت کا اہتمام ضروری ہے اسی طرح تبلیغ میں بھی افراط وتفریط سے بچ کر تمام آداب کا لحاظ لازم ہے۔

آپ لوگ مقتدا بننے والے ہیں اس لئے آپ کے اندر سب شعبے دین کے ہونا چاہئیں، حسین وہ ہے جس کے ناک، کان، آنکھ سب ہی حسین ہوں سب چیزیں موزوں یا متناسب ہوں اگر سب چیزیں اچھی ہوں مگر آنکھوں سے اندھا یا ناک کٹی ہو تو وہ حسین نہیں اسی طرح دیندار وہ ہے کہ جو دین کے تمام شعبوں کا جامع ہو (یہ نہیں کہ جس کو اوراد ونوافل میں زیادہ مشغول دیکھا کہہ دیا کہ بڑا دیندار ہے خواہ معاملات و معاشرت کا کچھ ہی حال ہو۔ راقم مؤلف) علیٰ ہذا عالم وہ ہے جو علوم کے تمام شعبوں کا عالم ہو ان شعبوں میں امر بالمعروف کے وہ آداب بھی ہیں جو اوپر بتلائے گئے ان سب کو بھی جمع کرنا چاہئے۔

اہل اصلاح کی دوسروں کی اصلاح سے بیفکری

صلاح کے ساتھ اصلاح وتبلیغ یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی جس درجہ کا دینی فرض ہے اور جس طرح اس کی طرف سے غفلت وبے فکری عام ہے اس کی بناء پر وعظوں میں کثرت سے اور بار بار متوجہ ومتنبہ فرمایا ہے "الصلاح والاصلاح" کے نام سے ایک اور وعظ میں ارشاد ہے کہ:۔

" جو لوگ خود اعمال میں مشغول بھی ہیں ان کو بھی دوسروں کی اصلاح کی فکر نہیں حتیٰ کہ اپنے نوکروں چاکروں، متعلقین، بلکہ اپنے بچوں تک کو مثلاً نماز پر مجبور نہیں کرتے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا باب آج کل بالکل ہی مفقود ہے یاد رکھو جیسے طاعت خود واجب ہے ایسے ہی دوسروں

کی طاعت کی سعی بھی واجب ہے مگر یہ سعی بقدر استطاعت واجب ہے، جہاں زبان کی استطاعت ہو زبان سے کرے جہاں ہاتھ پاؤں سے کر سکے ہاتھ پاؤں سے کرے روپیہ پیسہ سے کر سکے اس سے کرے، خلاصہ یہ کہ محض اپنا عمل درست کر لینا کافی نہیں۔

گو فی نفسہٖ اپنی اصلاح غیر کی اصلاح پر مقدم ہے مگر اس تقدیم کے معنی یہ نہیں کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسروں کی بھی واجب نہیں رہتی بلکہ یہ محض عملی ترتیب ہے کہ پہلے اپنی اصلاح ہو پھر دوسرے کی نہ یہ کہ اگر مقدم کام نہ کیا ہو تو مؤخر بھی نہ کرے دراصل دونوں کام الگ الگ ہیں ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں۔ ایک کو ترک کرے گا تو ایک کے ترک کا گناہ ہوگا اور دونوں کو ترک کرے گا تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا اسی لئے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ کی آیت میں اصلاح غیر کو اصلاح نفس سے پہلے ذکر فرمایا کہ اپنی اصلاح کے بعد دوسرے کی اصلاح سے بے فکر نہ ہو جائیں، البتہ اصلاح غیر کے بقدر استطاعت مدارج ہیں چنانچہ ایک درجہ یہ ہے قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا ؕ یعنی اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ۔ جس کا حاصل اپنے متعلقین کی اصلاح ہے لیکن اس کا یہ حال ہے کہ اگر خود نماز پڑھ بھی لیتے ہیں مگر بی بی بچوں نوکروں وغیرہ اپنے متعلقین کو نہیں کہتے، بچے اگر امتحان میں فیل ہو جائیں تو رنج ہوتا ہے لیکن نماز نہ پڑھیں یا قضا کر دیں تو پرواہ بھی نہیں ہوتی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ

اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے کہ تمام کام چھوڑ کر صرف امر
بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام کرے جس کا حاصل تبلیغ عام ہے اسی طرح
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ میں اہل و عیال کی
تخصیص نہیں اگرچہ ہم ساری دنیا کی اصلاح کے ذمہ دار نہیں پھر بھی جہاں
تک ہو سکے کوشش تو کریں کیونکہ اس کی باز پرس ہو گی۔

اس کوشش کے اعتبار سے تین حالتیں ہیں ایک تو یہ کہ سرے
سے کوشش ہی نہ کرے ایک یہ کہ ایسی کوشش کرے کہ اگر ناکامی ہو تو
گھل گھل کر جان دیدے۔ دونوں درجے غیر محمود و ناپسندیدہ ہیں اور تیسرا
محمود و مطلوب درجہ یہ ہے کہ اپنی والی سعی و تدبیر میں کمی نہ کی جائے اور اس
سعی و تدبیر کا مقصود رضائے حق و حصول اجر ہو باقی کامیابی و ناکامی کو
خدا کے سپرد کر دیا جائے۔

اصول اور فروع سب میں تبلیغ فرض ہے

ایک اور وعظ تواصی بالحق کے کچھ اقتباسات بھی مزید تنبیہ کے لئے درج ذیل ہیں

تبلیغ ہمارے اوپر اصول و فروع تمام احکام میں فرض ہے (اس زمانہ
کی یہ بھی ایک نادانی ہے کہ فروع سے چشم پوشی بڑی دانائی جانی جاتی ہے
مؤلف) جس طرح اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں ایمان و عمل صالح
کا امر فرمایا ہے اسی طرح وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" میں تواصی بالحق کا اور
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کے خسارہ سے بچنا ان دونوں ہی پر موقوف ہے
اب اپنی غفلت کا حال دیکھئے کہ چوبیس گھنٹہ میں کتنا وقت اس فریضہ

کی ادائی میں صرف کرتے ہیں، جن پر زور نہیں ان کو تو رہنے دو جن پر
زور ہے ان کے ساتھ بھی تواصی بالحق کا معاملہ نہیں کیا جاتا......
زیادہ شکایت دینداروں سے ہے کہ وہ بھی گھر والوں کو تنبیہ نہیں فرماتے
نہ اس کی خبر رکھتے ہیں کہ آج بیوی بچوں نے نماز پڑھی ہے یا نہیں پڑھی
اور کوئی کام خلاف شرع تو نہیں کیا۔ بس یہ سمجھ لیا کہ اپنی اصلاح کر لینا چاہیئے
تاکہ ہم خود جنت میں چلے جائیں حالانکہ اس کا بھی مواخذہ ہوگا کہ اپنے گھر
والوں کو بھی دین کے راستہ پر کیوں نہیں چلایا صاف ارشاد ہے کہ:-
قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ نَارًا ۔ و کلکم راع و کلکم
مسئول عن رعیتہ
اگر کبھی اپنی نماز قضا ہو جائے تو اس پر تو ندامت ہوتی ہے مگر ترک
تواصی و ترک تبلیغ پر ذرا ندامت نہیں ہوتی ۔ انصاف سے کہئے کہ
کبھی بیوی کو نصیحت نہ کرنے یا کسی دوست کی خلاف شرع وضع پر
نصیحت نہ کرنے پر ندامت بھی ہوئی ؟

علماء اور عوام کے فریضہ تبلیغ میں فرق

اور یہ تبلیغ یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف علماء ہی کا کام نہیں ہے البتہ
اس کی دو قسمیں ہیں !
ایک خطاب عام دوسرے خطاب خاص، دوسری تقسیم یہ ہے کہ
ایک خطاب منصوصات و قطعیات میں ہوتا ہے اور ایک اجتہادیات
میں پس خطاب عام بصورت وعظ اور اسی طرح امور اجتہادیہ میں
خطاب یہ تو علماء ہی کا کام ہے مگر انفرادی طور پر ہر مسلمان دوسرے

مسلمان کو نصیحت کر سکتا ہے اسی طرح جو مسائل منصوص اور قطعی ہیں ان میں ہر شخص بآواز بلند کہہ سکتا ہے کہ مثلاً ایمان لانا فرض ہے، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ فرض ہے۔"

لیکن عالم و عامی سب ہی کو اس معاملہ میں اپنے اپنے فرائض سے اتنی بے پروائی ہے کہ اولاً ان کی طرف توجہ ہی نہیں اور کوئی توجہ دلائے تو طرح طرح کے عذر اور بہانے تلاش کرنے لگتے ہیں۔

"صاحب آپ کو چاہئے تھا کہ پہلے امر بالمعروف شروع کر دیتے پھر مثلاً کسی باوجاہت آدمی کو خلاف شرع وضع پر نصیحت کرنے یا کسی کافر کو تبلیغ اسلام کرنے میں گاڑی اٹکتی اس وقت مولوی صاحب سے پوچھتے کہ صاحب کیا کروں یہ کیا کہ نہ حاکم کو امر بالمعروف نہ محکوم کو نہ مسلم کو نہ کافر کو نہ بیوی کو نہ اولاد کو، پہلے ہی عذر دریافت کرنے لگے یہ ایسا ہی ہے جیسے روزہ شروع کرنے سے پہلے کوئی یہ تحقیق کرنے لگے کہ روزہ کن کن عذروں سے ساقط ہو جاتا ہے پھر مثلاً اپنے گھر والوں کو امر بالمعروف کرنے سے کونسا عذر مانع ہے۔ بیوی یا لڑکے نے نماز نہیں پڑھی تو ان کو نصیحت کرنے یا سزا دینے میں کیا خوف ہے کیا وہ مار ڈالیں گے۔ یہ سب بہانے لغو ہیں۔"

"اصل بات وہی ہے کہ آپ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے بھلا اگر آپ کا کوئی دوست آپ کے سامنے زہر کھانے لگے تو کیا آپ اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دے کر زہر کو اس کے ہاتھ سے نہ لے لیں گے اگر تنہا قادر نہ ہوں گے تو دوسروں کو امداد کے واسطے بلائیں گے پھر کیا وجہ ہے کہ دین میں جو افعال مضر ہیں ان سے روکنے کے لئے اس اہتمام سے کام نہیں لیا جاتا معلوم ہوا کہ آپ دین کے ضرر کو ضرر ہی نہیں سمجھتے اور یہ سخت

مرض ہے جس کا علاج بالضد ہے مگر اس قدر غفلت ہے کہ خدا کی پناہ کسی کو اس علاج کی طرف توجہ نہیں۔ الا ماشاء اللہ

البتہ یہ ضروری ہے کہ ابتداء میں جہاں تک ہو سکے نرمی و تالیف سے کام لو اور انتہا میں صفائی سے مگر آج کل کی حالت یہ ہے کہ اگر مصالح کی رعایت ہے تو عمر بھر مصالح ہی مصالح چلے جائیں گے اور اگر صفائی اختیار کرتے ہیں تو شروع ہی سے لٹھ سا مار دیتے ہیں۔

بعض مواقع پر اہل اللہ کے بظاہر ترک امر بالمعروف کی وجہ

بلا شبہ بعض بڑے بڑے بزرگانِ دین اور اہل اللہ کے خاص خاص استثنائی صورتوں میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے امر بالمعروف ترک کر دیا لیکن وہ دراصل ظاہر میں ترک اور باطن میں امر ہی ہوتا ہے جن میں ان کی خاص فراست و برکت کو دخل ہوتا ہے ایسی بعض مثالیں احقر کے علم میں خود حضرت کے ہاں بھی آئیں لیکن ان بزرگوں کا معاملہ الگ ہے۔

ان کے حال کو اپنے حال پر قیاس مت کرو تمہارے لئے وہی طریقہ لازم ہے کہ زبان سے نصیحت کرو اور اہل باطن کبھی قال سے نصیحت کرتے ہیں کبھی حال سے اور کبھی بال یعنی دل سے کیونکہ ان کی توجہ قلبی میں بڑا اثر ہے جو تمہاری زبان میں نہیں۔

گرچہ تفسیر زباں روشن گر است
لیکن عشق بے زباں روشن تر است

مگر یہ دقائق ہر شخص نہیں سمجھ سکتا اس لئے عوام کے لئے اصل طریقہ وہی ہے جو عام ہے کہ زبان سے نصیحت کرو۔

"اہل اللہ کو اللہ کی طرح مخلوق کے ساتھ شفقت بہت ہوتی ہے وہ بالعموم ایسے طرز سے نصیحت کرتے ہیں کہ مخاطب کو نفع ہی ہوتا ہے اگر اس میں کچھ ارادہ و طلب ہے ورنہ اگر وہ خود نہ چاہے تو ایسے شخص کا علاج تو انبیاء علیہم السلام بھی نہیں کر سکتے۔"

لیکن ایسے اہل اللہ کتنے ہیں؟

"آج کل تو عموماً ہر قسم کی تبلیغ اس لئے متروک ہے کہ مخاطب کو اس سے ناگواری ہوتی ہے اور خلائق کی ناگواری کو اپنے ذمہ کون لے۔ یاد رکھو کہ محض ناگواری مخاطب کوئی عذر نہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ○

امر بالمعروف کے ترک کا عذر صرف یہ ہے کہ ضرر کا اندیشہ ہو اور ضرر بھی جسمانی، محض کسی منفعت کے فوت ہونے کا ضرر نہیں اب غور کیجئے کہ ایسے ضرر کے مواقع کتنے ہوتے ہیں زیادہ تو محض مخاطب کی ناگواری کا خیال مانع ہوتا ہے تو اس کی ناگواری کی پرواہ کیوں کی جائے آپ کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

جو شخص خدا سے بیگانہ ہے اگر اس کو احکام الٰہی کی تبلیغ ناگوار ہے تو ہماری جوتی سے۔ بس ہم کو خدا پر نظر رکھنا اور صرف اس کی رضا کا طالب ہونا چاہئے خواہ تمام دنیا ناراض ہو جائے"

ایک سبق آموز مثال

اس کی حضرت نے ہمارے روزمرہ کے مشاہدہ سے

ایک عجیب مثال دی ہے کہ

میں آپ کو ایک عبرتناک کثیرالوقوع واقعہ سناتا ہوں ایک چودہ سال کی لڑکی جس نے ماں باپ کی گود میں پرورش پائی ان کے گھر کو اپنا گھر اُن کے دوست کو اپنا دوست ان کے دشمن کو اپنا دشمن جانا اس کی حالت نکاح کے دو لفظوں سے یہ ہو جاتی ہے کہ جہاں اس کے منہ پر سے ہاتھ اترا اب شوہر کا گھر اس کا گھر ہے اس کا دوست اس کا دوست، اس کا دشمن اس کا دشمن گو شوہر کا دوست باپ کا دشمن اور شوہر کا دشمن باپ کا دوست ہی کیوں نہ ہو، بلکہ اگر کسی وقت باپ بھی شوہر کا دشمن ہو جائے تو عموماً عورتیں شوہر کا ساتھ دیتی ہیں۔

افسوس اس لڑکی نے تو عقد کے ایجاب وقبول میں ایسی مردانگی دکھائی اور ہم باوجود مرد ہونے کے اور لا الہ الا اللّٰہ محمد رَسُوْلُ اللّٰهِ کا عہد باندھنے کے خدا کے دوست کو اپنا دوست اور خدا کے دشمن کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے، آپ کا تو یہ حال ہونا چاہئے کہ ؎

دل آرامے کہ داری دل درو بند

دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

بس تمام عالم سے کہہ دو کہ ہم نے ایک ذات سے علاقہ جوڑ لیا جو اس سے ملے ہمارا دوست جو اس سے الگ ہو وہ ہم سے الگ۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو دعوت دی جب وہ راہ پر نہ آئے تو صاف فرما دیا سَلَامٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ہ کہ بس میرا سلام لو، اب تم سے کچھ واسطہ نہیں اپنے خدا سے دعا کروں گا۔ صاحبو ابراہیم علیہ السلام کا طرز اختیار کرو

یہی اسلام کا مقتضیٰ ہے۔

جیسا کہ دوسری جگہ حکم ہے کہ تمہارے لئے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا اچھا نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے بیزار ہیں اور تمہارے ان معبودوں سے بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ ہم تم سے الگ ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان بغض و عداوت ہمیشہ کے لئے قائم ہو چکے جب تک کہ تم اللہ وحدہٗ پر ایمان نہ لاؤ"۔

لقد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہٗ اذ قالوا لقومھم انا براٰؤا منکم و مما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابداً حتی تؤمنوا باللہ وحدہٗ۔

پس نہ ہم کو مخاطب کی کسی ناگواری کی پرواہ کرنی چاہیے اور نہ اس ناگواری کی وجہ سے تبلیغ میں کوتاہی کی جائے۔

بعض دقیق باتیں

اسی تواصی بالحق و تواصی بالصبر کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان فرمایا کہ:۔

یہ ناگواری مخاطب کو گو تبلیغ عقائد میں زیادہ ہوتی ہے مگر جب وہ ایک مرتبہ اپنے عقائد سابقہ کی غلطی سمجھ کر عقائد حقہ کو قبول کر لیتا ہے تو اس کے لئے بار بار تبلیغ کی ضرورت نہیں رہتی بخلاف اعمال کے کہ ان کی تبلیغ ابتداء میں تو دشوار نہیں نہ مخاطب کو اس میں زیادہ ناگواری ہوتی ہے مگر اس میں بار بار تبلیغ کی حاجت ہوتی ہے کیونکہ انسان اپنے اعمال فاسدہ کو ایک بار چھوڑ کر بھی لذت نفسانی کی وجہ سے پھر اختیار کر لیتا ہے تو اس

میں ابتدائی تبلیغ کافی نہیں ہوتی بلکہ بقائے تبلیغ کی بھی حاجت رہتی ہے خلاصہ یہ کہ تبلیغ عقائد کی ابتداء دشوار مگر بقا سہل اور تبلیغ اعمال میں ابتداء آسان مگر بقاء دشوار۔ اس لئے وتواصوا بالصبر میں ایسا عنوان اختیار فرمایا گیا جس میں مبلغ کو بھی صبر و استقلال کی تعلیم ہے واللہ اعلم باسرار کلامہ

ایک اور دقیق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عمل صالح اور تواصی بالحق کے ساتھ تواصی بالصبر کیوں بڑھایا، وجہ یہی ہے کہ اعمالِ صالحہ جوہر ایمان کے محافظ ہیں اور گناہ و معاصی اس دولت کے دشمن ہیں جو شخص خود گناہ کرتا یا کسی دوسرے کو گناہ میں مبتلا دیکھ کر نصیحت نہیں کرتا رفتہ رفتہ اس کے دل سے گناہوں کی نفرت کم ہو جاتی پھر زائل ہو جاتی ہے اور گناہ کو ہلکی معمولی بات سمجھنے لگتا ہے اور یہی کفر ہے

ایک اور بڑی غلطی یہ ہے کہ علماء کا اصل کام تبلیغ تھا نہ کہ چندہ جمع کرنا خواہ وہ تبلیغ ہی کے لئے ہو۔ اس میں بڑے مفاسد ہیں جن کا بیان اوپر ہو چکا۔

" یہ کام دنیا والوں کا ہے اور اس کا انتظام سب مسلمانوں کے ذمہ ہے ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کام بھی کریں اور بھیک بھی مانگیں، شرم نہیں آتی کہ جن علماء کو مقتدا سمجھتے ہو انہیں سے بھیک بھی منگوانا چاہتے ہو میں نے اپنے مبلغین سے کہہ دیا ہے کہ جب تمہارے پاس اتنی رقم رہ جائے کہ جس سے اپنے گھر پہنچ سکو اس وقت مجھ کو اطلاع کر دیا کرو اگر اور رقم ہوگی تو بھیج دوں گا ورنہ بلا لوں گا۔ کیونکہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ رقم نہ ہے تو لوگوں سے مانگتے پھریں ہم سے جتنا ہو سکتا ہے اس کے لئے ہم حاضر ہیں اور جس کام میں روپے کی ضرورت ہے اگر مدد مانگے

مسلمان ہمارے پاس بھیج دیں گے تو اس سے کام چلاتے رہیں گے اور نہ بھیجیں گے تو خدا تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ :۔
اس کام کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی مسلمانوں نے مالی اعانت پر توجہ نہ کی اور ہم نے بھیک مانگنے میں دین کی ذلت سمجھی اس لئے یہ کام نہ ہو سکا۔ اس کے بعد عام مسلمانوں سے مواخذہ ہوگا کہ تم نے تبلیغ میں مالی اعانت کیوں نہیں کی اور اگر تم کو کسی پر اعتماد نہ تھا تو تم نے رقم کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنے ضلع کے لئے مبلغ کا انتظام کیوں نہیں کیا۔
میں نے کام کی جتنی صورتیں تھیں سب آپ کو بتلا دیں اب جو چاہو اختیار کرلو اس کے بعد آپ کو کسی عذر کا موقع نہیں

تبلیغ اعمال بھی ضروری ہے

اوپر تواصی بالحق کے حصہ میں تو زیادہ تر تبلیغ عقائد کا ذکر تھا دوسرے حصہ تواصی بالصبر میں تبلیغ اعمال کی طرف بالخصوص توجہ دلائی گئی ہے کہ فساد عقائد کی طرح آپ فساد اعمال کو کیوں منکر نہیں سمجھتے اور ایسے شخص سے آپ کا دل کیونکر ملتا ہے جو فروع ایمان میں ناقص ہے اس سے بلا تکلف دوستی کس طرح کی جاتی ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو کوئی تم میں امر منکر دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹائے یا زبان سے یا دل سے ، پھر یہ کیا غضب ہے کہ ہم لوگ منکر کو دیکھ کر نہ ہاتھ سے روکتے ہیں نہ زبان سے ، نہ دل سے نفرت کی جاتی ہے بلکہ اعمال میں کوتاہی کرنے والوں کے ساتھ وہی بشاشت ہے وہی دوستی ہے جیسے کامل الایمان کے ساتھ ہو۔ گویا آپ خدا تعالیٰ کی طرف سے وکیل و مختار ہیں

کہ جس چیز کو چاہیں معاف کردیں اور جس منکر سے چاہیں قطع نظر کرلیں۔

واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ

کی یہی تفسیر آئی ہے کہ ایک شخص کسی بستی میں گناہ کرتا رہتا ہے لوگ اس کو دیکھتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں اس سے کنارہ کشی نہیں کرتے نہ اس پر کچھ تشدد کرتے ہیں تو اس شخص کی وجہ سے سینکڑوں بے گناہ عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو کسی بستی کے الٹ دینے کا حکم دیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ خداوندا اس بستی میں ایک شخص ایسا ہے کہ جس نے عمر بھر میں کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی کیا اس سمیت الٹ دوں فرمایا کہ ہاں اس سمیت الٹ دو کیونکہ اس نے بظاہر کوئی گناہ نہیں کیا مگر گنہگاروں کو دیکھ کر اس کے چہرہ پر بل نہیں پڑا۔ وہ ہمارے دشمنوں سے ویسی ہی دوستی و محبت کے ساتھ ملتا رہا جیسا دوستوں سے تو یہ کیسی محبت ہے، کہ ہمارے دشمنوں پر غصہ بھی نہ آئے اس لئے وہ بھی انہیں کی مثل ہے۔

جن کو سب سے زیادہ ہم پر تبلیغ کرنا واجب ہے

سب سے زیادہ اور بار بار جن لوگوں کو تبلیغ پر حضرت نے متوجہ اور متنبہ فرمایا ہے وہ وہ ہیں جن پر ہم کو کسی نہ کسی قسم کی قدرت حاصل ہے مثلاً بی بی، بچے، نوکر چاکر مرید، شاگرد وغیرہ۔ پھر ان کی بھی دو قسمیں فرمائی ہیں

ایک وہ جنہوں نے اطاعت کا ہم سے صریح معاہدہ نہیں کیا جیسے بی بی بچے کہ گو شرعاً ان پر ہماری اطاعت واجب ہے مگر انہوں نے صراحۃً اس کا کوئی التزام و معاہدہ نہیں کیا کہ تم ہم کو تعلیم و تبلیغ کرو ہم تمہاری تعلیم پر

عمل کریں گے "

مگر ایک تعلق ایسا ہے کہ جس میں دوسرا شخص ہماری اطاعت کے صریح التزام کا عہد کرتا ہے یعنی یہ پیری و مریدی کا تعلق کیونکہ پیری و مریدی نام ہی ہے مرید کی جانب سے معاہدۂ اطاعت کا اور پیر یا شیخ کی جانب سے معاہدۂ تعلیم و اصلاح کا۔ صرف ہاتھ میں ہاتھ لے کر سبق سا پڑھ دینے کا نام پیری و مریدی نہیں ہے جیسا کہ آج کل عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے بس ایک مرتبہ یہ سبق پڑھ لیا اور مرید ہو گئے اب نہ پیر کے نزدیک تعلیم ضروری نہ مرید کے نزدیک اتباع۔ مجھے اس میں کلام ہے کہ اس طرح کسی طالب بیعت کو چپکے سے بیعت کر لینا جائز بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس صورت میں مرید کی اس غلطی کی گویا توثیق ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی بیعت کی حقیقت ہے "

اصل یہ ہے کہ مریدوں سے زیادہ اس بارہ میں خطا یا غفلت پیروں ہی کی ہے نہ مرید کرنے سے پہلے بیعت کی حقیقت واضح کرتے ہیں اور نہ مرید کرنے کے بعد اصلاح و تربیت کو ضروری جانتے ہیں حالانکہ یہ صریح خیانت و معصیت ہے جس میں ترک تبلیغ کے ساتھ وعدہ خلافی کا گناہ بھی شامل ہے کیونکہ حقیقت بیعت کی رو سے جس طرح مرید کی طرف سے اطاعت کا وعدہ ہوتا ہے اسی طرح شیخ کی طرف سے اصلاح کا۔ حیرت ہے کہ مقتضی موجود اور موانع سب مرتفع، پھر بھی پیر صاحب مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں کچھ روک ٹوک نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیوخ یا تو پیری مریدی کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے یا جان بوجھ کر پہلو تہی کرتے ہیں۔

—:—

ایک عجیب رائے

کیا عرض کیا جاتے کہ بعض لوگوں کی رائے تو یہاں تک سُنی کہ روک ٹوک، مؤاخذہ واحتساب ترہیب وتخویف کا زمانہ ہی اب سرے سے نہیں رہا۔ صرف ترغیب اور تالیف قلب ہی سے کام لینا چاہیئے حتیٰ کہ اپنے توابع بلکہ اپنی اولاد بھی مثلاً تارک نماز ہو تو بس ترغیب یا خوشامد سے آگے قدم نہ اٹھانا چاہیئے گویا قرآن وحدیث کا ترہیبی وتادیبی حصہ سب منسوخ ہو گیا ہے نہ قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا کے امر وجوب نہ راعی ورعیت کی مسئولیت نہ تغییر بالید وغیرہ کا اس سے زیادہ کوئی مطلب رہ گیا کہ اہل وعیال تک کفرو معصیت فسق وفجور جس منکر کا بھی ارتکاب کرتے رہیں اور خواہ ترغیب وتفہیم، نرمی یا خوشامد کی ساری تدبیریں بیکار ثابت ہو چکی ہوں مگر کسی حال میں ان سے نہ کسی قسم کی نفرت وبیزاری ظاہر کی جائے نہ ان کے ساتھ تعلقات اور بشاشت وشگفتگی میں کوئی فرق آئے نہ ان کو کوئی تخویف وتنبیہ ہو۔

صاحبو! اس بلا میں ہم لوگ بہت گرفتار ہیں کہ ہمارے ملنے والوں میں بعضے مبتلائے معاصی ہیں اور ہم ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے اور ملتے ملاتے ہیں ہاں ایک صورت میں اس کی اجازت ہے کہ کسی پر تشدد یا قطع تعلق کرنے میں مفسدہ یا اس کی طرف سے اضرار کا اندیشہ ہو اور اپنے اندر تحمل کی طاقت نہ ہو اس میں سکوت کی اجازت ہے باقی جس کی ہمت ہو اس کو سکوت کی اجازت نہیں بلکہ اس کے لئے وہی حکم ہے یا بنی اقم الصلوٰۃ وأمر بالمعروف وانہ عن المنکر واصبر علیٰ ما اصابك ان ذلك

من عزم الامور) اس کو چاہئے کہ صاف صاف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور جو خطرہ پیش آئے اس کا تحمل کرے (البتہ یہ شرط ہے کہ نفس و نفسانیت کی آمیزش اس میں نہ ہو)

(وعظ اصلاح ذات البین ص۳۵)

اصل میں یہ ایسے حضرات کی رائے ہے جنہوں نے نہ صرف اس امر سے قطع نظر فرمالیا ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا امتیاز اصول و فروع سب میں افراط و تفریط سے بچا کر صراطِ مستقیم کی تعلیم ہے بلکہ انہوں نے اس عام فطرت بشری سے بھی غض بصر فرمالیا ہے کہ انسان جس طرح محض بات بات میں لٹھ مارنے سے راہ راست پر نہیں آتا اسی طرح نرمی، دلجوئی یا خوشامد سے بھی درست نہیں ہوتا بلکہ وہ تو تخویف و ترہیب کا جتنا اثر قبول کرتا ہے رجاء و رغبت کا نہیں کرتا اور کیا عجب ہے کہ اگر استقصاء کیا جائے تو قرآن مجید میں ترہیبی مضامین کا پلّہ ترغیبی سے جھکتا ہی ثابت ہو۔ ورنہ ثواب و عذاب جنت و جہنم دونوں کا غیر منفک ساتھ تو سارے کلام مجید میں ملے گا اور ایمان اپنے صحیح مقام پر تو خوف و رجاء کے کانٹے ہی پر رہ سکتا ہے۔

اسلام کی حدود اور اعتدال پسندی کی اس خاص شان کا اہتمام ہر چھوٹی بڑی چیز کی طرح طالبین اور مریدین کی اصلاح و تربیت میں بھی اس زمانہ میں حضرت مجدد وقت ہی کے ہاں دیکھا کہ ہر مجلس وعظ و تادیب دونوں کے رنگ میں سموئی ہوتی، بعض مثالیں ایسی بھی دیکھیں کہ تعلیم و تربیت کی ابتداء سے لے کر انتہا تک، بیعت سے لے کر اجازت کے سالہا سال کی مدت تک زبان و قلم پر ایک کلمہ بھی تغیر طبع کا نہیں آیا اور فراست ایمانی نے اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں جانی لیکن یہ استثنائی فطرتوں کے ساتھ استثنائی صورت ہی ہو سکتی تھی۔ باقی عام طرز عام فطرت شناسی کے مناسب ترغیب و تربیت دونوں کا تھا اور ترہیب و تادیب کے معاملہ میں یہاں تک

ہوتا کہ بارہا لوگوں کو مجلس سے اٹھا دیتے، مکاتبت و مخاطبت کی ممانعت فرما دیتے، ایک آدھ بار ضرب سے بھی علاج فرمایا کہ کسی نے کہہ دیا تھا کہ میں تو اب عیسائی ہو جاؤں گا تو ایک دھول رسید فرمایا اس سے اللہ تعالیٰ نے فوراً ہی دماغ سے شیطان کو نکال دیا

غرض تمام صفات و ملکات متقابلہ کی طرح ترغیب و ترہیب، انس و ہیبت لطف و عتاب بھی حضرت جامع المجددین کی ذات میں نہایت اعتدال اور حسنِ استعمال کے ساتھ جمع تھے ؎

یارِ ما آں دارد و ایں نیز ہم

انقلابِ عام وتام

آپ نے دیکھا کہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے دین کے سارے احکام کی طرح ان احکام کی تعلیم وتبلیغ کی بھی کیسی جامع وحاوی عام وتام ازسرِنو تجدید فرمادی ہے۔

عام تو اس معنیٰ میں کہ اس کے قبول وعمل کے بعد نہ کوئی طبقہ انشاء اللہ محروم رہ سکتا ہے اور نہ کوئی فرد۔

اور تام اس معنیٰ میں کہ دین کی اس تجدید یافتہ تعلیم وتبلیغ کا نظام احکام دین کے تمام ابواب، دیانات ومعاملات، اخلاق ومعاشرت سب کو شامل ہے اور اس لئے کہ اگر اس کے اجراء واقامت کا حق ادا کیا جائے تو دس سال میں ساری امت کے اندر عام وتام دینی انقلاب برپا ہوجاسکتا ہے وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

قرآن مجید صرف کتابِ ہدایت ہی نہیں نظامِ ہدایت بھی ہے

بات یہ ہے کہ جامع وکامل دین کی ذٰلک الکتاب محض کتابِ ہدایت ہی نہیں بلکہ نظام ہدایت بھی ہے یعنی راہ یابی وراہنمائی کے اصول وضوابط کے اعتبار سے بھی جامع وکامل ہے اور وقت کے مجدد نے انہیں اصول وضوابط کے تحت دینی تبلیغ وتعلیم کی جامع تجدید واصلاح فرمائی ہے جس کی پوری تفصیل کے لئے اُن حضرات کو خصوصاً جو خدمت تعلیم وتبلیغ کی کوئی صلاحیت وہمت رکھتے ہیں

خود حضرت کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا اور ان کو بار بار مسلسل مطالعہ میں رکھنا ان اصول کے فہم و عمل میں رسوخ پیدا کر دے گا اور ایک بڑی حد تک ان کی نوعیت و اہمیت اور جامعیت کا اندازہ اوراقِ بالا سے بھی ہو گیا ہو گا بلکہ انفرادی حد تک بقدر ضرورت فہم و عمل کے لئے انشاء اللہ یہی اوراق کافی و شافی ہوں گے۔

لیکن ثمرات خالی باغبانی کے قواعد و ضوابط پر کسی بہتر سے بہتر کتاب پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ تو ان قواعد کے موافق عمل اور باغ لگانے ہی سے حاصل ہوں گے اس عمل میں مزید سہولت کی خاطر حضرت ہی کی مفصلہ بالا تعلیمی و تبلیغی اصلاحات و تجدیدات کے پیش نظر انفرادی و اجتماعی صلاح و اصلاح کا ایک عملی خاکہ بھی پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دینی تعلیم کا مدعا

جب یہ معلوم ہو گیا کہ کائنات نہ کوئی خود رو جنگل ہے اور نہ انسان اس جنگل کا محض بڑھیا جانور۔ بلکہ انسان و کائنات دونوں کی تخلیق کسی خاص علم و ارادہ کے تحت عمل میں آئی ہے تو پھر لازماً اس تخلیق کا کوئی خاص معلوم و مراد و مقصد بھی ضرور ہے دینی تعلیم اس مراد و مقصد کے احکام کی تعلیم و تکمیل کا نام ہے۔ اور حضرت کا اصل تجدیدی زور دین کے تمام شعبوں کے احکام یا اوامر و نواہی کے سکھلانے اور پھیلانے ہی پر ہے کہ انہیں کا علم و عمل مقصود بالذات ہے باقی رائج و عرفی دینی مدارس و ادارات کتابی تالیفات و تصنیفات وغیرہ کی حیثیت مقاصد کی نہیں بلکہ مقدمات کی ہے ورنہ نفس احکامِ دین جاننے اور پورا کرنے کے لئے عربی یا عربی کے ذریعہ کسی مقرر و مروج نصاب درسیات کی سالہا سال میں تکمیل کیا معنیٰ؟ عربی اردو کسی زبان کا ابجد خواں ہونا یا سرے سے خواندہ ہونا تک ضروری نہیں لیکن لوگوں نے

دینی تعلیم کے تصور میں نفس کتابی تعلیم بھی نہیں بلکہ اور خدا جانے کتنی غیر ضروری چیزوں کو ضروری اور بہت سی مؤخر چیزوں کو مقدم قرار دے رکھا ہے کہیں منطق و معقولات پر زور دیا ہے کہیں اسرار و کلامیات پر اور کہیں ادب و انشاء تقریر و تحریر پر، ان غیر ضروری یا مؤخر چیزوں کو مقدم بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نفس احکام کی حد تک ان درسگاہوں کے نام کے علماء دیانات تک کے پورے پورے اوامر و نواہی سے آگاہ نہیں ہوتے۔ آگے معاملات اور اس سے بڑھ کر اخلاق و معاشرت کا ذکر ہی کیا اس لئے حضرت علیہ الرحمۃ کی تجدیدات کا ایک بڑا کلیدی اصول مقصود و غیر مقصود کا فرق و امتیاز ہے جس کے بغیر اکثر لوگ غیر مقصود کے پیچھے پڑ کر مقصود کو کھوتے رہتے ہیں

فرنگی وباء

مغربی و فرنگی دجل کی راہ سے جو مفاسد وبا کی طرح ساری دنیا میں پھوٹ پڑے ہیں ان ہی میں سے ایک بڑی وبا صالح ہونے کے بغیر مصلح (رفارمر) یا اپنی اصلاح سے بے فکر رہ کر ساری قوم سارے ملک بلکہ ساری دنیا کی اصلاح کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو جانا ہے، ہر کس و ناکس، اہل و نااہل جو ذرا زبان چلا سکتا یا کوئی اخبار و رسالہ نکال سکتا، یا جماعت سازی و انجمن سازی کا کچھ ڈھنگ رکھتا ہے بس وہ بے تکلف لیڈر اور رہبر بن جا سکتا ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ وکالت یا پلیڈری کی سند حاصل کر لینا تو گویا لیڈری کی مسلمہ سند ہے، حد یہ کہ ایسی لیڈری مستقل معاشی پیشہ بن گئی ہے۔ اگر کوئی اور دھندا نہ چل رہا ہو یا پلیڈری سے پیٹ نہ بھر رہا ہو تو بقول بڑے عارفِ زمانہ شاعر حضرت اکبرؒ کے ؎

"خیر بالفعل لیڈری ہی سہی"

اس مغربی و فرنگی طریق اصلاح کے برخلاف انبیائی طریق یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی دعوت و ہدایت کا خود مکمل اُسوہ و نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں یہی اسوہ و نمونہ طبعاً و فطرۃً دوسروں کو حسب استعداد ان کے رنگ میں رنگتا ہے، تقریر و خطابت برائے نام اور بالکل بقدر ضرورت ہوتی ہے حضرت بنی الانبیاء علیہ التسلیم والتحیۃ جو ساری دنیا کی اصلاح و ہدایت ہی کے لئے بھیجے گئے تھے ان تک کو باوجود مسلمہ عصمت کے احکام یا اوامر ونواہی کی بہت سی آیات میں صیغۂ واحد سے خطاب فرمانے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ خود حضور کے اسوہ و نمونہ ہونے اور ویسا بننے کی طرف لوگوں کو توجہ ہو، اس انبیائی راہ کے حضرات رجسٹروں اور ممبروں کی جائز و ناجائز خانہ پری اور بھرتی سے مصنوعی جماعت سازی یا انجمن سازی کے قریب بھی نہیں جاتے۔ بس اُسوۂ حسنہ و نمونہ کے اثر و اتباع کی فطری و طبعی راہ سے جو لوگ ان کے رنگ میں رنگتے جاتے ہیں وہ از خود قدرتی و حقیقی جماعت کے شیرازہ میں پیوست ہو جاتے ہیں اور جس نظام کے اعضاء یا جس مشین کے پرزے اپنی اپنی جگہ کارگر ہوں وہ نظام یا مشین صرف دستہ ہلانے سے اپنا کام آپ سے آپ پورا کرے گی۔ اگر کسی خدا نخواستہ شہر میں آگ لگی ہو اور لوگ خود اپنے گھر اور محلہ کو چھوڑ کر دور دور کے گھروں اور محلوں کی آگ بجھانے دوڑ رہے ہوں تو بجز اس کے ہو ہی کیا سکتا ہے کہ پورا شہر آگ کے شعلوں میں لپٹ کر خاک ہو جائے۔

اصلاح کا خاص تجدیدی پہلو

غرض اس طرح اصلاح کے معاملہ میں حضرت کا خاص تجدیدی پہلو یہ ہے کہ دوسروں سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر یا جماعت سازی سے مقدم افراد سازی ہے بس یہی افراد سازی زندگی بھر حضرت کا خاص طریقہ و مشغلہ رہا، غیروں کی ہدایت

وقیادت کی نیت تک بتدیوں کو یا خامی کی حالت میں جائز نہ رکھتے، قیادت وامامت دراصل انبیائی منصب کی نیابت ہے اور اس لئے قدرتاً نبوت و رسالت ہی کی طرح فی الجملہ اصطفائی ہے کہ تم خود اپنی اصلاح و تکمیل میں لگے رہو، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو ایسے اسباب خود پیدا فرمادیں گے کہ دوسروں کی اصلاح کی خدمت بھی حسب حیثیت نصیب ہو جائے، یا جب کوئی طبیب حاذق تم کو نسخہ نویسی کی اجازت دیدے تب دوسروں کے معالجہ کا مطب کھولو۔

توابع کی اصلاحی ذمہ داری

خود اپنی صلاح وفلاح کی فکر کے بعد بلکہ اس کے ساتھ طبعی وفطری ذمہ داری اہل وعیال یا اپنے ہی توابع کی اصلاح وخیر خواہی کی ہے جو کسی نہ کسی درجہ میں کم وبیش ہر فرد بشر پر عائد ہوتی ہے اسی لئے دونوں کو ایک ساتھ مامور فرمایا کہ خود اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ (قوا انفسکم واھلیکم نارًا) ساری بنی نوع انسان یا کافۃ للناس کے "بشیر ونذیر" (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی حکم تھا کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو" (وأمر اھلک بالصلوٰۃ) اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ (وانذر عشیرتک الاقربین)

لہٰذا اپنے ساتھ ساتھ جن دوسروں کی صلاح وفلاح کی نگرانی عقلاً ونقلاً ہر طرح ہم پر عائد ہوتی ہے وہ اپنے ایسے ہی متعلقین یا ایسے توابع ہی ہیں جو کسی نہ کسی طرح ہمارے تابع وماتحت یا زیر نگرانی ہیں اور جن پر کسی نہ کسی درجہ میں ہم کو اثر واقتدار حاصل ہے اسی بناء پر ان کے بارے میں ہم سے مؤاخذہ وباز پرس بھی بالکل حق بجانب ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی کا راعی یا نگران ہوتا ہے اور اس سے اپنی رعایا یا زیر نگرانوں کے بارے میں باز پرس ہوگی (کلکم راعٍ

و کلکم مسئول عن رعیتہ) ظاہر ہے کہ جو کسی طرح کسی کے زیر اثر ہے وہ لازماً اس کے اثر کے موافق اس کی بات کو زیادہ ماننے اور قبول کرنے پر بھی مائل و مجبور ہوگا اور قدرتاً اس کی زیادہ سہولت کے ساتھ زیادہ اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے نیز خود اپنی ذات کے بعد جن کی صلاح و اصلاح سب سے زیادہ اپنے اختیار و قدرت میں ہوتی ہے وہ یہی اپنے زیر اقتدار توابع ہو سکتے ہیں اور تکلیف چونکہ امور اختیاریہ ہی کی بقدر اختیار و وسعت ہے لہٰذا اپنے ساتھ ساتھ بالذات و براہ راست اپنے توابع کی اصلاح کے بھی ہم مکلف و مسئول ٹھہرائے گئے ہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب بھی بدرجہ اولیٰ اور خصوصاً بالید یعنی حسب اثر و اقتدار اور حسب موقعہ و محل استعمالِ قوت کے ساتھ یہ بھی توابع یا خاص اپنے زیر نگرانی و رعیت ہی کے لئے ہے دوسروں کے لئے باللسان یا زبان سے مامور ہیں وہ بھی بعض صورتوں میں صرف مستحب اور بعض میں سرے سے ممنوع، باقی ایمان کی آخری سرحد بالقلب ہے یعنی جہاں ہاتھ اور زبان سے کام نہ لیا جا سکتا ہو وہاں کم از کم دل سے برائی کو برا جاننا اور تا بہ امکان اس سے دور و نفور رہنا ایمان کا کم سے کم یا آخری درجہ ہے۔

خلاصہ

یہ کہ مجدد وقت کے تجدید فرمودہ کتاب و سنت کے اسلامی نظامِ ہدایت کے موافق ہر فرد مسلم کا پہلا اصلاحی فریضہ یہ ہے کہ خود اپنی اور اپنے توابع کی اختیاری و وجوبی اصلاح کے کام کو لے بیٹھے، جب افراد کی اس آسان و اختیاری طریق سے اصلاح ہو گئی تو ایسے صالح افراد کو جس جماعتی کام میں لگایا جائے گا وہ بھی آپ سے آپ صلاح و صحت کے ساتھ انجام پائے گا۔ اس آسان و اختیاری طریق کو چھوڑ کر مشکل و غیر اختیاری

کے پیچھے پڑنا گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنا ہے

اب جو افراد اتنے سعادتمند ہوں کہ ان سطور اور ان کی ضروری تفصیل اوپر کتاب میں پڑھنے ہی سے چونک کر خود اپنی اور اپنے توابع کی اصلاح کے لئے کمر کس لیں اور کم از کم اردو اچھی طرح جانتے ہوں ان کے لئے سیدھا راستہ یہ ہے کہ پہلے حضرت کے کچھ ملفوظات و مواعظ پڑھنا اور گھر والوں کو پڑھانا یا سنانا شروع کر دیں انشاء اللہ اس سے سب کو اپنی اپنی اصلاح و آخرت کا خیال پیدا ہو جائے گا۔ جن لوگوں نے حضرت کی چیزوں کو کھلے دل و دماغ سے دو چار سو صفحے بھی پڑھ لیا راقم ہذا کا بلا استثناء تجربہ ہے کہ ان کو اپنی اصلاح کا کچھ نہ کچھ خیال ضرور پیدا ہو گیا۔ پھر اگر قصداً چھوڑ نہیں دیا تو راستہ پر پڑ گئے۔

اس کے بعد روزمرہ کی ضروریات کے بقدر احکام دین کے جاننے کے لئے حضرت نے اُردو ہی کی چند کتابوں (بہشتی زیور، تعلیم الدین، اصلاح الرسوم، حیات المسلمین، حقوق الاسلام، آداب المعاشرت، تبلیغ دین، فروع الایمان، جزاء الاعمال، صفائی معاملات وغیرہ) کا ایک مختصر سا نصاب مقرر فرما دیا ہے جس کو پورا وقت دینے والا ایک چلہ میں ورنہ پھر جتنا وقت دے سکے اس کے اعتبار سے دو چار مہینوں میں پورا کر سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایسے عام لوگوں کو حضرت کی خاص ہدایت یہ ہے کہ وہ اس نصاب کو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھیں ورنہ پھر جہاں جہاں شبہات واقع ہوں نشان لگالیں، اور کسی عالم سے ان کو حل کر لیں، دوسرے کسی اچھے دیندار عالم سے وقتاً فوقتاً ملاقات یا کم از کم مکاتبت کا تعلق ضرور رکھیں اور حسب ضرورت ان سے مل کر یا لکھ کر معلوم کر کے عمل کرتے رہیں۔

چونکہ حضرت کی کتابوں خصوصاً مواعظ و ملفوظات سے لوگوں میں بالعموم اپنی بدحالی کا احساس اور اصلاح حال کی طرف توجہ ہو جاتی ہے اس لئے ابتدائی

طلب دین و اصلاح کا خیال پیدا کرنے کے لئے اس کتابی عہد میں حضرت کی کتابوں کو مختلف موثر و مقبول اسالیب و عنوانات سے ہزار ہا ہزار کی تعداد میں شائع کرنا کہ لاکھوں ہاتھوں تک پہنچیں اور کروڑوں میں پڑھی پڑھائی سنی سنائی جائیں بجائے خود انشاء اللہ ایک عام دینی بیداری اور عمومی انقلاب و اصلاح کا ذریعہ ہوگا۔

متعدی اصلاح و تبلیغ

دینی زندگی کے دو کلیدی اصول

باقی جو حضرات کچھ اس کی صلاحیت و ہمت رکھتے ہیں کہ خود اپنی اور اپنے اہل و عیال یا توابع کی اصلاح کے علاوہ عام مسلمانوں یا غیر مسلموں کی بھی اصلاحی یا تبلیغی خدمت کی کوئی سعادت حاصل کر سکیں، ان کو لازم و متعدی انفرادی و اجتماعی ہر طرح اور ہر موقع کی دینی زندگی کے دو کلیدی اصول حضرت مجدد کی تعلیم و تجدید کے پیش نظر رکھنا ضروری ہیں۔ ایک مقصود و غیر مقصود کا امتیاز دوسرے اختیاری و غیر اختیاری کا فرق۔

(۱) مومن کا اصل مقصود کامیاب لقائے رب، اور (۲) اس کامیابی کا ذریعہ رضائے رب ہے، اس دنیا کی زندگی اسی رضا طلبی کے امتحان کے لئے عطا فرمائی گئی ہے اس امتحان کا دروازہ فرد و جماعت، غنی و فقیر، عالم و عامی، متمدن و وحشی، حاکم و محکوم سب کے لئے اپنے اپنے محل و مقام کے لحاظ سے یکساں کھلا ہوا ہے لہٰذا مقصود بالذات نہ انفرادی و اجتماعی یا شخصی و قومی غنا و ثروت ہے، نہ علم و تمدن[۱]

---

[۱] رائج الوقت معنی میں معاذ اللہ حضرات صحابہ تک سے زیادہ کون "بے علم و غیر متمدن" ہوگا لیکن دوسری طرف رضائے رب کے امتحان میں ان سے بڑھ کر تاریخ کی آنکھ نے کامیاب انسان کب دیکھے ہیں۔

نہ حکومت وسلطنت، جیسا کہ آج کل ان ہی چیزوں کو افراد و اقوام سب نے مقصود ہی نہیں معبود بنا رکھا ہے البتہ ان چیزوں کی حیثیت کچھ ضمنی و ذیلی مقاصد یا مؤیدات کی ہے وہ بھی اس شرط سے کہ ان سے کام رضائے حق کا لیا جائے اور احکام ہی کے ماتحت ان کو رکھا جائے ورنہ پھر دولت دحکومت تو فرعون و قارون کے پاس بھی تھی یہی نہیں بلکہ ان خارجی مؤیدات کی کمی یا فقدان کی صورت میں امتحان میں کامیابی کا درجہ بلند سے بلند تر ہو جاتا ہے، السابقون الاولون کا مقابلہ کون کر سکتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مکی دور کی بیکسی ومظلومیت میں رضا جوئی کے امتحان کا موقع ومقام مدنی دور یا خلافت راشدہ کے غلبہ وقوت کے ایام امتحان سے فروتر تھا۔

مطلب یہ کہ لازم وانفرادی اصلاح کی طرح متعدی و اجتماعی اصلاح میں بھی اصل مقصود و پیش نہاد رضا طلبی ہو نہ کہ غیروں کی دیکھا دیکھی، جاہی و مالی یا سیاسی و معاشی غلبہ و ترقی ہی کو مقصود بالذات بنا لینا اور اس کے بغیر فرد و قوم سب کو پسماندہ یا تنزل کا مارا خیال کرنا، مقصود و غیر مقصود کے اس فرق و امتیاز کی انتہا یہ ہے کہ جو دینی خدمات مقصود ہیں ان میں بھی مقصود بالذات کامیابی نہیں بلکہ کامیابی کی اپنی والی صرف سعی وہ بھی رضائے حق کے لئے اس کے بعد بھی ظاہری ناکامی ہو تو وہ عین کامیابی ہے۔

اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان کو اپنے اصل انسانی مقصود و مدعا کی تکمیل و تحقق کے لئے ایسی چیزوں کی تکلیف میں ڈالا گیا ہے جو ہر وقت ہر انسان کے اختیار میں نہیں۔ وہ دین عام و عالمگیر کیسے ہو سکتا ہے جو انسان و انسانیت کی تکمیل و ترقی کے مواقع ہر فرد انسان کو ہر صورت اور ہر حالت میں یکساں نہ عطا کرتا ہو یا اس کی تکمیل و ترقی کو ایسی شرائط و قیود کے تابع قرار دیتا ہو جن کا حصول ہر ہر فرد کے انفرادی اختیار میں ہی نہیں بلکہ سہولت سے اختیار میں نہ ہو۔ اسلام کا تو

بنیادی و قرآنی منصوص و اولین اصول یہی ہے کہ وہ کسی فرد پر بھی اس کی انفرادی وسعت وطاقت سے زیادہ قطعاً کوئی بوجھ نہیں ڈالتا اور ہر فرد کے لیے اس کی انفرادی قوت و وسعت کے اندر ہی اس کی اعلیٰ سے اعلیٰ تکمیل و ترقی کی ضمانت دیتا ہے۔

ایک اور عام عارضہ

اس عہد کا ایک اور عام عارضہ یہ بھی ہے کہ لوگ قومی و اجتماعی خدمات میں نہ خود اپنی اختیاری اہلیت وصلاحیت کا لحاظ رکھتے ہیں نہ دوسرے کی۔ اگر کوئی شخص مثلاً جاہ ومال کا مالک ہے تو وہ اور دوسرے سب سمجھتے ہیں کہ وہ دین و دنیا کے ہر معاملہ میں رائے و مداخلت کا مجاز ہے۔ اگر کوئی رائج الوقت سیاسی تجربہ وبصیرت رکھتا ہے تو وہ دینی مسائل واحکام میں بھی رائے زنی و اجتہاد کا حقدار بنتا اور بنا لیا جاتا ہے اگر کوئی صرف تقریری و تحریری لیاقت وشہرت رکھتا ہے تو لوگ عملی و انتظامی کاموں کا بھی اس کو لائق سمجھنے لگتے ہیں اور وہ بے تکلف ان کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔

پھر وقت، فرصت، لیاقت وصلاحیت کے لحاظ کے بغیر کئی کئی قومی و اصلاحی کاموں کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے، تو گویا سیاسیات وقومیات حاضرہ کا خاص فیشن ہے، ایک کے صدر دوسرے کے نائب صدر کسی کے معتمد کسی کے رکن بلکہ رکن یا ممبر تو دس بیس اداروں کا بن جانا بھی کوئی بات نہیں لیکن ایسے ارکان کی احساس ذمہ داری و فرض شناسی کا حال روزانہ کیا دیکھا جاتا ہے کہ جن تجاویز و معاملات پر رائے دینے مجلس میں تشریف لاتے ہیں شاید ہی کوئی ہوتا ہو جو رائے زنی اور رائے دہی کے وقت سے پہلے دو چار گھنٹے بھی سکون و اطمینان کے ساتھ ان تجاویز کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کر کے مجلس میں آتا ہو اور بارہا تو اس مجلس اور اس کے معاملات سے ان ارکان کی دلچسپی کا یہ حال دیکھا جاتا ہے

کہ حاضری کا نصاب (کورم) تک پورا نہیں ہوتا۔ کسی معاملہ میں خطوط لکھے جاتے ہیں یاددہانی پر یاددہانی ہوتی ہے مگر رسید تک ندارد

اور بالفرض شاذونادر کوئی شخص ایک سے زائد خدمات کی لیاقت واہلیت رکھتا بھی ہو اور سب کی طرف بقدر گنجائش وفرصت ذمہ داری کے ساتھ توجہ بھی کرنا چاہتا ہو تو بھی وقت وفرصت میں اتنی وسعت کتنوں کے ہوسکتی ہے کہ اس منقسم توجہ کے ساتھ سب کی طرف توجہ کا حق پوری طرح ادا ہوسکے، خصوصاً جو لوگ اپنے ذاتی وانفرادی اور اپنے اہل وعیال وتوابع کی صلاح واصلاح اور اپنے دیگر خانگی مشاغل کے مقدم فرائض وواجبات کا بھی حق ادا کرتے ہوں، وہ تو اگر کوئی چھوٹے سے چھوٹے کام بھی حقوق شناسی کے ساتھ انجام دے سکیں تو بڑا پالا مارا۔

مقصود کام نہیں نام

بات وہی ہے کہ رضائے حق کا ذکر ہی کیا مقصود اصل میں کام نہیں زیادہ تر نام ہے۔ مال سے بھی زیادہ انسان نام وجاہ کا بھوکا ہے اس لئے اگر اس کے اندر سے آخرت طلبی اور رضاجوئی کی روح نکل گئی ہو تو کیا وجہ ہے کہ نام کے مواقع نظر انداز کرکے کام میں وقت برباد کرے۔

کام کے بجائے نام کی اس فکر وطلب کی بدولت ہر چھوٹے بڑے اصلاحی واجتماعی کام میں ایک بڑی خرابی یہ پیدا ہے کہ وقت وقوت کو "کیف" سے زیادہ "کم" کے حصول میں یا عمق اور گہرائی سے زیادہ کام کے طول وعرض اور پھیلاؤ پر صرف کیا جاتا ہے، اجتماعی ومتعدی خدمات میں یہ زہر دانستہ ونادانستہ اتنا سرایت کر گیا ہے کہ بعض خالص دینی جماعتیں اور ان کے مخلص ترین کارکن تک اس کے

قعدیہ سے محفوظ نہیں ۔ ایک طرف تو ایک گھر ایک محلہ یا ایک بستی کا اصلاحی کام پورا نہیں ہوتا اور دوسری طرف سارے ملک کے طول وعرض میں دوڑ اور دوروں پر زور ہوتا ہے ۔ ابھی ان سطروں کے لکھنے سے پہلے ایک بڑے ہی صادق ومخلص صاحب علم وقلم جوان صالح کا واقعی بڑی حسرت وعبرت کا مضمون اتفاقاً نظر پڑا جس میں انہوں نے ہمارے حال وحاضر کا ہمارے ماضی وآغاز (حضرات صحابہؓ) سے اس طرح مقابلہ فرمایا ہے کہ :-

۱۔ صحابہؓ گنتی کے تھے اور تمام دنیا پر بھاری تھے ۔	۱۔ ہم لاتعداد ہیں اور زمین پر بھاری ہو رہے ہیں ۔
۲۔ صحابہؓ بادشاہوں پر سلطنت کرتے تھے ۔	۲۔ ہمیں غلامی اور غلاموں کی غلامی بھی بہ ہزار دقت نصیب ہوتی ہے
۳۔ صحابہؓ کچھ نہ تھے اور سب کچھ ہو گئے ۔	۳۔ ہم سب کچھ تھے اور کچھ نہ رہ گئے ----------
۴۔ صحابہ کی دنیا میں بھی عزت وآرام سے بسر ہوتی تھی اور آخرت اس سے بہت بہتر	۴۔ ہماری زندگی سخت ذلت اور پریشانی سے گذرتی ہے اور آخرت کی بھی بظاہر امید اچھی نہیں ۔

کم وکیف کا فرق

ظاہر ہے کہ اس حسرتناک وعبرتناک فرق یا بعد المشرقین کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ وہاں کیف وعمق یا دین وایمان کی گہرائی پر زور زیادہ تھا اور کم یا تعداد یعنی طول وعرض اور پھیلاؤ پر توجہ کم تھی خود صاحب مضمون ہی نے بخاری شریف سے نقل فرمایا ہے کہ :- مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تین مرتبہ

مسلمانوں کو شمار کیا گیا پہلی مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد ۵۰۰
دوسری میں ۶۰۰ اور ۷۰۰ کے درمیان اور تیسری میں مسلمان ۱۵۰۰
تھے، اس تعداد پر مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اب ہمیں کیا
ڈر ہے ہم نے تو وہ زمانہ دیکھا ہے جب ہم اکیلے نماز پڑھتے تھے اور پھر
بھی ہر طرف سے دشمنوں کا خوف لگا رہتا تھا،،

فرق یہی ہے کہ ان کے اندر ایمان کی کیفیت وکمال انتا رچ گیا تھا کہ ہر طرف سے
دشمنوں کے خوف کے باوجود اپنے انفرادی فرائض نماز وغیرہ کو اکیلے چھپ کر بھی کسی
نہ کسی طرح اختیار بھر ادا ضرور فرماتے تھے اور ہم میں کتنے ہیں جو کھلے خزانے بیخوف
وخطر نماز اور دیگر فرائض دین کی قدرت رکھ کر بھی ان کو ادا کرتے ہیں! ایسے لاتعداد
افراد کی قوم کی حالت ظاہری وزبانی شان وشوکت وشور وغل کے باوجود صاحب مضمون
ہی کے الفاظ میں اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ ایسے "وجیہہ چہرے، شاندار وباوقار
صورتیں، بارعب جسم، دشمن ودوست سب کی نظر میں سب سے زیادہ حقیر و بے وقار ہیں

وَاِذَا رَاَیْتَھُمْ تُعْجِبُكَ	اور جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کے
اَجْسَامُھُمْ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا	جسم بھلے معلوم ہوں گے اور یہ جب
تَسْمَعْ لِقَوْلِھِمْ كَاَنَّھُمْ	کچھ کہنے لگیں تو تم کان لگا کر سننے لگو گے
خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ یَحْسَبُوْنَ	(یعنی باتیں خوب بناتے تقریریں خوب
كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْھِمْ	کرتے ہیں لیکن حقیقت کیا ہے)
	گویا ٹیک لگائی ہوئی لکڑیاں ہیں،،

(کہ خود اپنے بل بوتے پر نہیں کھڑی ہیں جہاں سہارا ہٹا اور گر پڑیں اس
اندرونی ضعف کی بدولت بزدلی کا یہ حال ہے کہ ہر آواز کو اپنے
خلاف ہی سمجھتے ہیں،،

بظاہر تم ان کو ایک جماعت یا قوم سمجھتے ہو لیکن ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتّٰى

اتفاق کا گُر

حضرت علیہ الرحمۃ نے حُسنِ معاشرت کی اہمیت کے سلسلے میں کہیں تحریر فرمایا ہے کہ آج کل اتفاق اتفاق کا شور ہے لیکن جب تک آپس کا برتاؤ یا معاشرت درست نہ ہو کہ ایک کا دوسرے سے دل نہ دکھے اس وقت تک دل کیسے مل سکتے ہیں اور اتفاق کیسے پیدا ہو سکتا ہے

حضرت رح کی تجدید دین کا حاصل

حضرت کی تجدید دین کا حاصل یہی ہے کہ قلب و قالب، ظاہر و باطن، عقائد و عبادات، معاملات معاشرت، سب کی کیفاً و تاماً اصلاح ہو اور مسلمان زندگی کی ہر راہ میں اور ہر اتار چڑھاؤ میں اول و آخر مسلمان یعنی ادھورے نہیں پورے پورے مسلمان بنیں اور بنائیں۔ یہی راز تھا کہ قلت تعداد کے باوصف صحابہ کچھ نہ تھے سب کچھ ہو گئے۔ اور ہم سب کچھ تھے کچھ نہ رہے، وہ مٹھی بھر تھے تو بحر و بر پر چھاتے ہوتے تھے اور ہم مور و ملخ کی طرح ہیں،، تو کہیں نہیں۔

سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات

اب آخر میں لیکن اول و آخر جو بات متعدی یا اصلاحی خدمات کی اہلیت و ہمت رکھنے والے حضرات کو ہمہ وقت اور سب سے زیادہ یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ ان خدمات کے بدلے میں کسی مالی وجاہی، جانی و جسمانی اجر کے ذرہ بھر بھی کسی

سے طالب نہ ہوں۔ یہ کام نبوت ورسالت کی نیابت ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام سے ایک جگہ نہیں جابجا اور بار بار اس کا اقرار و اعلان لیا اور کرایا گیا ہے کہ اس دعوت و اصلاح کی خدمت کا کوئی اجر میں تم سے قطعاً نہیں چاہتا میرا اجر صرف اللہ پر ہے۔ ما اسئلکم علیہ من اجران اجری الا علی اللہ رب العالمین،، یٰقوم لا اسئلکم علیہ اجراً ان اجری الا علی اللہ

اسی بناء پر حضرت علیہ الرحمۃ نے واعظین و مبلغین یا دینی مدارس کے اساتذہ و مدرسین سے چندہ وغیرہ کی خدمت لینے کو سختی سے منع فرمایا۔ دعوت وہدیہ تک قبول کرنے کی اجازت عام طور سے نہیں دی ہے۔

جو اہل مال کوئی بڑی سے بڑی مالی خدمت کی سعادت بھی اس راہ اور اس کے خادموں کی حاصل کریں وہ ان خادموں کو اپنا مخدوم ہی جانیں اور ان کی طرف سے کسی طرح کی تعظیم و تکریم تک کے اجر کے متوقع نہ ہوں بلکہ خود احسان مند ہوں کہ مال جیسی حقیر چیز قبول کر کے ان کی طرف سے وہ دین جیسی عظیم خدمت کو انجام دے رہے ہیں ساتھ ہی ان دینی خادموں کو بھی چاہیئے کہ دین کے ان مالی خادموں کو دین کی خدمت کا شریک وسہیم اور اپنا معین و محسن جان کر ان کی عزت و توقیر کریں اور ان کے مشورہ سے کام کریں، اسی طرح دینی خدمات کے انتظامی عہدہ داروں یا خدمت گذاروں کو چاہیئے کہ وہ اپنے کو ان دینی خادموں کا خدمت گار ہی تصور کریں اور یہ ان کو اپنا مددگار، افسری و ماتحتی کی مروج تعظیم و تحقیر کا معاملہ ہرگز نہ ہو، بھائیوں بھائیوں کے باہمی اشتراک و تعاون کی صورت ہو، بڑے چھوٹوں کے ساتھ شفقت و محبت اور چھوٹے بڑوں کے ساتھ ادب و عظمت کا برتاؤ رکھیں۔ یہی تعلق اساتذہ و طلباء، معلمین و متعلمین، ائمہ و مؤذنین عوام و مبلغین سب میں ہو کہ کوئی کسی کی زبان و عمل سے تحقیر یا بیجا دل آزاری کے درپے نہ ہو، اگر بھول چوک سے ایسا ہو جائے

تو جلد از جلد صفائی و عذر خواہی سے تلافی و تدارک کرے۔"

ایک اور تقاضا

ومطالبہ نبوت ورسالت کی نیابت کا یہ ہے کہ تعلیم وتربیت تبلیغ ودعوت اصلاح واحیا کی خدمات میں جو حضرات بھی بواسطہ یا بلاواسطہ کوئی ضابطہ وذمہ داری کا عہدہ یا خدمت قبول کریں وہ صورت وسیرت وضع قطع اعمال واخلاق خصوصاً تمام مرئی ومحسوس چیزوں میں اپنے ادارہ وعوام سب کے لئے خود اتباع احکام کا اسوہ یا قابل تقلید نمونہ ہوں ۔ دینی اداروں، مدارس ومکاتب کے بظاہر ادنیٰ سے ادنیٰ ملازمین ومتعلقین کے باب میں اس کا پورا لحاظ ہے کہ وہ فرائض وواجبات کی پابندی اور وضع ولباس میں خاصے دیندار معلوم ہوں ان کی ایک حیثیت رعایا یا زیر نگرانی توابع کی بھی ہے اس لئے یوں بھی ان کے دین کی نگرانی لازم ہے۔

اصول بالا کی مزید تفصیل تو اوپر اصل کتاب میں ملے گی یہاں ان کا اجمالی ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ ان کی روشنی میں عام وتام دینی انقلاب کا ذیل میں ایک نظام عمل پیش کرنا ہے ۔ عام کے یہ معنی نہیں کہ ایک ساتھ کل دنیا، کل ہندوستان یا کل پاکستان میں کام شروع کردیا جائے، دین کی اصلاحی خدمات یا نبوت کی نیابت کا حق ادا کرنے کے لئے ایمان واخلاص، صلاح وتقویٰ، علم وعمل، ایثار وقناعت حوصلہ وہمت، فہم وفراست کے جیسے جامع صفات رجال کی ضرورت ہے ان کی جیسی ہمیشہ کمی رہی اور ہمیشہ سے بڑھ کر آج جیسا قحط ہے اس کے لحاظ سے ان صفات کے کاملین ہی نہیں اوسط درجہ کے حاملین بھی اگر کسی ایک بستی وشہر میں کیا سارے ملک میں دس پانچ بھی مل جائیں تو ان کو جمع کرکے مذکورۂ بالا اصول کے مطابق کسی گوشہ سے اس نظام کا آغاز کردیا جائے، پھر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو اس معنی میں

بھی عام ہو جائے گا کہ سارے ملک یا ساری دنیا میں مقبول و رائج ہو جائے
وھو علیٰ کل شئ قدیر

اجزائے نظام کا خاکہ

ایک درسگاہ

کا قیام جس میں دین کی عربی کے ذریعہ ابتدائی اوسط اور اعلیٰ درجہ تک تعلیم کا تربیت کے ساتھ اس طرح اہتمام ہو کہ دینی تربیت یا افراد سازی پر تعلیم سے کم نہیں زیادہ زور و توجہ ہو کہ یہی افراد آگے چل کر صحت و قوت کے ساتھ اس نظام کی توسیع و تعمیم کا ذریعہ ہوں گے، اس درسگاہ میں ایسے خاندانی و خوشحال ذہین بچوں کے لینے کا خاص خیال رکھا جائے جن کے والدین یا سرپرست اپنی اولاد کی خیرخواہی صرف دنیا ہی تک نہیں محدود جانتے بلکہ آخرت کی خیرخواہی کو مقدم رکھتے ہیں۔ ایسے والدین کم ہی لیکن ہیں اور جو نہیں ہیں ان کو بتلایا جائے کہ تمہاری کیسی نادانی کی خیرخواہی بلکہ کھلی بدخواہی ہے کہ چند روزہ زندگی وہ بھی ایسی کہ یقین ایک روز کا بھی نہیں اس کی راحت و عزت کے لئے تو مال و دولت وقت و قوت کا سارا سرمایہ لگا دیتے ہیں لیکن آخرت کی ابدی و یقینی زندگی کی کامیابی و کامرانی سے یہ غفلت کہ گویا تم کو کبھی مرنا ہے نہ اولاد کو۔ اگر اتنا بھی یقین نہیں تو پھر مسلمان کس منہ سے اپنے کو کہتے ہو۔

ایسے طلباء بعد فراغ دینی خدمات کے لئے زیادہ موزوں ہوں گے کہ دنیا کی حاجات سے بقدر حاجت الحمدللہ گھر ہی سے فارغ ہوں گے اور خاندانی اثرات کے بدولت حوصلگی سیرچشمی وغیرہ بہت سے اچھے صفات کے موروثی طور پر حامل ہوں گے۔ غریب شرفاء اور عام مسلمانوں کے بچوں میں بھی نظر انتخاب سے ایسوں ہی کو چنا جائے

جو قبول تربیت کی استعداد رکھتے ہوں، اور تجربہ کے بعد جس طالب العلم کی معتد بہ تربیت پذیری کی استعداد سے مایوسی ہو تو اس کے زہریلے اثر سے دوسروں کو بچایا اور اس کو قطعاً علیحدہ کر دیا جائے خواہ ذہنی و علمی اعتبار سے وہ کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو دوسری درسگاہوں کے لیے فارغ و نیم فارغ طلباء کو بھی لیا جائے جو دینی خدمت اور قبول تربیت کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

نصابِ تعلیم

(۱) ابتدائی و بنیادی نصاب وہی حضرت علیہ الرحمۃ کا مجوزہ مختصر سہ سالہ[۱] ہوگا جو اس درسگاہ کے متوسط اور اعلیٰ سب درجوں کی بنیاد اور سب کے لئے لازم ہوگا۔ حسب ضرورت کچھ ضروری جزئی ترمیمات کر لی جا سکتی ہیں مدتِ تعلیم تین سال ناکافی ہو تو چار سال تک بڑھا لی جائے۔ اس سے زائد نہ ہو۔

(۲) متوسط درجوں میں خالص علوم دین تفسیر و حدیث اور فقہ کا حصہ زیادہ ہو، متن کلام مجید کامل، باقی انہیں سے تعلق رکھنے والے دیگر علوم کا حسب ضرورت و گنجائش الاقدم فالاقدم کے لحاظ سے جن کا جتنا حصہ شریک رکھا جا سکے، ایک کتاب علم کلام کی بھی ہو، مدت تین سال سے زائد نہ ہو۔

(۳) اعلیٰ درجہ (یا درجۂ تکمیل) کی مدت تعلیم دو سال ہوگی، اس میں تفسیر، و حدیث و فقہ میں سے کسی ایک کی تکمیل ہوگی

(۴) اس درجۂ اعلیٰ کے دو شعبے اور ہوں گے جن میں درجہ متوسط کے ایسے فارغ التحصیل لئے جائیں جو خود اپنے ایمان و عمل میں راسخ ہونے کے ساتھ تحریر یا تقریر کی کچھ خاص صلاحیت رکھتے ہوں کہ غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ کی یا ان کے پیدا و پیش

---

[۱] دیکھو ص ۸۳

کردہ شکوک وشبہات کے ازالہ کی خدمت کر سکیں۔

(الف) جن کو علوم عقلیہ وحاضرہ سے کچھ ذوق ومناسبت ہو ان کو ان علوم کے ایسے مسائل ونظریات کی خصوصی تعلیم دی جائے جن کا اسلامی تعلیمات پر نفیاً یا اثباتاً کوئی اثر پڑتا ہو۔ انگریزی زبان ان کے لئے لازم ہوگی تاکہ ایسے نئے نئے مسائل و نظریات سے واقف ہوتے رہیں، مدت تعلیم دو تین سال ہو، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آخر کتاب میں ضمیمہ)

(ب) جو خود ہم وطن غیر مسلموں میں دعوت واشاعت کا کچھ ذوق وشوق رکھتے ہوں وہ ان کی زبان میں تحریر وتقریر کا ایک اچھا ملکہ پیدا کرنے کے علاوہ خود ان کے مذہب کی مستند معلومات بھی جس ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہوں کریں، مثلاً ہندوستان میں تحریر یا تقریر کا ملکہ تو ہندی میں پیدا کریں۔ اور مذہب ہنود کی جو کچھ معلومات اردو میں مل سکیں ان پر قناعت نہ کریں خود سنسکرت پڑھیں اور دو سال اس کے لئے ناکافی ہوں تو دوران خدمت میں ساتھ ساتھ مطالعہ کے ذریعہ استعداد بڑھاتے رہ سکتے ہیں

کہفی رنگ

اس درسگاہ میں خانقاہی یا کہفی رنگ کے کم از کم ایک شیخ کے قیام کی بڑی ضرورت ہے۔ جس کی صحبت سے اساتذہ وطلباء ودیگر متعلقین مدرسہ کے اندر یا باطن میں دین کا رنگ وکیف تھوڑا بہت پیدا ہو۔ دیگر اساتذہ جہاں تک ہو سکے شیخ یا نیم شیخ (حضرت کی اصطلاح میں مجاز صحبت) ہوں یا کم از کم طالب کے رنگ کے ضرور ہوں جن کو اپنی ظاہری وباطنی اصلاح وعلاج کا مریض کی طرح اہتمام وفکر ہو، مطلب یہ کہ درسگاہ کے طلبہ کی تعلیم وتربیت، ماحول وفضا سب میں اس کا زیادہ سے زیادہ لحاظ ہو کہ طلباء میں نرے "طالب علم" نہیں طالب خدا ہونے کا بھی کچھ ذوق وشوق پیدا

ہو، جب تک خدا یا اس کی رضا کی طلب انسان کے اندر گھر نہ کرے سچ یہ ہے کہ وہ انسان نہیں ہوتا۔ اور دین تو دین دنیا کے حق میں بھی یہ نام کا انسان صفات انسانی سے ننگا ہوتا ہے۔

آج ساری دنیا میں جو انفرادی و اجتماعی فتنے اور سیاسی و معاشی شر و فساد آئے دن برپا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان اور سب کچھ اور جو کچھ بھی ہو مگر انسان نہیں رہا۔ اس انسان سازی میں حضرت کے ملفوظات کا زیادہ سے زیادہ پڑھنا پڑھانا خصوصیت سے کارگر ہوگا۔

مساجدی نظام

اس درسگاہ کے تعلیم و تربیت یافتہ مساجد و مکاتب کے درج ذیل نظام کی صورت میں خود اپنے مصلح کی حسب اجازت اصلاحی و تبلیغی خدمات انجام دیں گے بالفعل جہاں اور جس درسگاہ سے جتنے بھی ان خدمات کی صلاحیت رکھنے والے دستیاب ہوں ان کو کم و بیش ۲ ماہ اس درسگاہ میں رکھ کر اور ان کے علم و عمل سے اطمینان حاصل کر کے کام میں لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) مساجد کے امام و مؤذن اگر مذکورۂ بالا ابتدائی متوسط یا اعلیٰ درجہ کے عربی داں عالم ہوں تو کیا کہنا۔ ورنہ کم از کم مادری زبان اچھی طرح جانتے ہوں اور اس کے ذریعہ دیانات، معاملات، اخلاق و معاشرت کے تمام روزمرّہ کے ضروری دینی احکام سے خوب واقف ہوں اور ان کی تعلیم و تفہیم کر سکیں، ان میں سے کم از کم ایک حافظ بھی ہو تو بہت اچھا ہے ورنہ ناظرہ دونوں کا پورا اور ایسا اچھا ہو کہ صحت مخارج کے ساتھ دوسروں کو پڑھا سکیں

دین کے اعتبار سے ظاہری و باطنی حالت ائمہ مؤذنین کی اقلاً اوسط درجہ کی ہونا

ضروری ہے۔ خالی عقائد وعبادات ہی نہیں معاملات ومعاشرت سب میں۔ یا اگر طلب واستعداد ہو تو تعلیم کے ساتھ ۶ مہینے کی تربیت انشاء اللہ اس کے لئے بھی کافی ہوگی۔

(۲) ہر مسجد کے ساتھ بچوں کی تعلیم کا ایک مکتب ہوگا جس میں حافظہ وناظرہ دونوں یا کم از کم ناظرہ کی صحت مخارج کے ساتھ تعلیم کے علاوہ مادری زبان اور اس کے ذریعہ ایسے رسائل کی تعلیم جو دین کے تمام ابواب کے روزمرہ کام آنے والے احکام پر مشتمل ہوں[1] ساتھ حساب کی بھی بقدر ضرورت تعلیم ہو۔

ان مکاتب میں بھی تربیت کا لحاظ مقدم ہوگا اور یہ صرف مسجد کے حلقہ یا محلہ کے بچوں کے لئے خاص ہوں گے، بچوں کا سن کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ دس سال کا ہو اور مدت تعلیم ۵ سے ۶ سال تک۔ اور روزانہ تعلیم تین، چار، اور پانچ گھنٹے ہو گی، دو اور تین گھنٹے صبح اور ایک اور دو گھنٹے تیسرے پہر کو، چار پانچ سال کے کم سن بچوں کی صبح دو اور تیسرے پہر کو صرف ایک گھنٹہ۔ ۶ سے ۱۰ سال تک کے بچوں کی صبح ۲½ دو۔ تیسرے پہر کو دو ۱½، یا صبح ڈھائی گھنٹہ اور تیسرے پہر کو ڈیڑھ۔ باقی اس کے اوپر کے بچوں کی صبح تین اور تیسرے پہر کو دو گھنٹہ۔

۳۔ ایک ایک گھنٹہ روزانہ امام ومؤذن دونوں کے ذمہ اپنے حلقہ کے ہر گھر کے ایسے خواندہ یا ناخواندہ صاحب خانہ کو منظور ومقرر کردہ کتابوں کے ذریعہ جملہ ابواب دین کے احکام سنانا ہوں گے جو اپنے گھر کے بااثر راعی یا نگران کی حیثیت رکھتے ہوں ساتھ

---

[1] اوپر صفحہ ۵ کے تحتانی حاشیہ پر حضرت کی تجویز فرمودہ جو کتابیں درج کی گئی ہیں ان کے مضامین کی ضروری تلخیص وتسہیل کے ساتھ ان رسائل کو مرتب کیا جائے جس میں بچوں کی تدریجی ترقی واستعداد کا لحاظ ہو۔

ہی اس کی تفہیم و ترغیب ہو کہ وہ جس طرح اپنے گھر والوں یا زیرِ نگرانوں کی جسمانی و دنیوی صلاح و فلاح کے کفیل ہیں اس سے بڑھ کر ان کی دینی و اخروی اصلاح کے جواب دہ ہیں اس لئے ان احکام پر خود بھی آگاہ و کاربند ہوں اور گھر والوں کو بھی کریں۔

یہ بڑا اہم و مقدم اصلاحی کام ہے جو دراصل ایک شخص کی نہیں، پورے ایک گھر بلکہ پوری ایک نسل کی اصلاح کی صحیح و طبعی راہ ہے

(۴) جمعرات کے دن مکتب صرف ایک وقت صبح کا ہوگا۔ دوسرے وقت یا رات کو جو حلقہ کے لوگوں کے ملنے کا مناسب وقت ہو امام و مؤذن دو چار اپنے اور ہم خیالوں کو لے کر ایسے لوگوں کے گھروں پر باری باری جائیں یا جب تک ضرورت رہے جاتے رہیں جو مسجد میں جمعہ کو بھی نہیں آتے اور ان کو مسجد میں اوپر نمبر ۳ کے موافق آنے اور احکام دین سیکھنے پر تفہیم و ترغیب کے ساتھ آمادہ کریں، بحث و مناظرہ کی صورت بالکل اختیار نہ کریں نرمی سے اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات اور موت و آخرت کی تذکیر کے ساتھ تفہیم و ترغیب سے کام لیں

(۵) جمعہ کے بعد نماز، احکام دین کی تحصیل اور ان پر عمل کی ترغیب کے ساتھ حسب ضرورت و موقع خاص خاص احکام اوامر و نواہی سے متعلق کم و بیش ایک گھنٹہ وعظ کہا کریں، امام صاحب اگر خود اچھے واعظ ہوں تو زبانی وعظ ہو ورنہ حضرت کے مواعظ مناسب انتخاب اور ترتیب و سلسلہ کے ساتھ سناتے رہیں۔ زبانی وعظ میں بھی حضرت کے مواعظ کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری و مفید ہوگا [1]

(۶) کم عمر بچیوں کے لئے یہ انتظام ہو کہ پاس پاس کے دو چار دس گھروں میں

---

[1] ضرورت و اہمیت کے اعتبار سے ان مواعظ کو مرکزی درسگاہ کی طرف سے مضمون وار مرتب کرا کے شائع کیا جائے تسہیل کے ساتھ۔

اگر کوئی بی بی پڑھی لکھی ہوں تو ان کو ترغیب دی جائے کہ لوجہ اللہ ان گھروں کی بچیوں کو کم و بیش تین گھنٹے دن میں پڑھا دیا کریں۔ ان کا نصاب کلام مجید، مادری زبان اور اس کے بعد مکمل بہشتی زیور اور کچھ حساب ہوگا۔

اگر محلہ میں ایسی معلمہ دستیاب نہ ہو تو باہر سے حاصل کی جائے یا کوئی سن رسیدہ معلم رکھا جائے ان معلم و معلمہ کا بھی خود نیک اور دیندار ہونا مقدم ہے۔

(۷) جو زیادہ سن کی لڑکیاں یا منکوحہ عورتیں ناخواندہ ہوں ان کے گھر کے راعی یا سرپرست کو آمادہ کیا جائے کہ کسی فرصت کے وقت گھنٹہ آدھ گھنٹہ دے کر اگر نماز نہ آتی ہو تو پہلے نماز سکھلا دیں پھر تھوڑے تھوڑے روزانہ بہشتی زیور سے احکام و مسائل سناتے رہیں۔ اگر گھر میں کوئی پڑھا لکھا مرد سرے سے نہ ہو تو کسی سن رسیدہ معلم کا انتظام ہو کہ وہ پردہ سے سنا دیا کرے، ایک معلم اگر پاس پاس کے دس پانچ گھروں کی مستورات کو بھی ایک جگہ جمع کر کے روزانہ ایک گھنٹہ وقت دے تو اس طرح دن بھر میں محلہ بھر کی مستورات کی تعلیم ہو جا سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ تین چار مہینے میں وہ روزمرہ کے ضروری احکام سے واقف ہو جا سکتی ہیں۔

۷۔ اس قسم کے معلم و معلمات کی نگرانی کا اور انتظامی تعلق حلقہ کی مسجد سے ہوگا

۸۔ مسجد کے حلقہ میں معمولاً وہ گھر داخل ہوں گے جن تک اذان کی آواز جاتی ہو

۹۔ ایسی مسجد جہاں نہ ہو وہاں بنانے کی کوشش کریں۔ جب تک نہ بنے زمین ہی لے کر اس کو خس پوش کر لیا جائے، مستقل زمین بھی جب تک نہ حاصل ہو کوئی زمین مکان یا کمرہ مستعارہ سہی۔ غرض کام کے آغاز میں اس کی وجہ سے تاخیر نہ ہو اور اذان کے ساتھ باجماعت نماز بھی اس عارضی جگہ ہوتی رہے۔

(۱۰) ہر مسجد میں اس کے حلقہ کی مردم شماری کا ایک رجسٹر ہو جس میں ہر گھر کے مرد و عورت بوڑھوں بچوں خواندوں ناخواندوں کی تعداد بقید سن درج ہو، خواندگی

کی نوعیت و مقدار بھی، دینی و اخلاقی حالت، معاشی صورت، خانہ کیفیت میں ہر ایک کی دینی و اخلاقی و تعلیمی ترقی کی ماہ بماہ مختصر کیفیت درج ہو۔

۱۱۔ ائمہ و مؤذنین یا معلمین و معلمات کسی کے خانگی قصوں قضیوں اور ان کے جھگڑوں میں ہرگز نہ پڑیں نہ کسی گھر یا فریق سے کوئی خصوصی یا طرفدارانہ تعلق رکھیں، سب مسلمانوں سے یکساں اور ایسا تعلق ہو کہ سب ان پر اعتماد کریں۔ اور اپنا یکساں خیر خواہ جانیں۔ مریضوں اور حاجتمندوں کی عیادت اور بقدر فرصت خدمت سے دریغ نہ کریں

البتہ پابندی احکام کے سلسلہ میں اس کی بھی ترغیب دیتے رہیں کہ اپنے جھگڑوں کا فیصلہ شریعت کے احکام کے موافق کیا کریں۔ اگر کوئی صاف و معمولی بات ہو تو اس کا شرعی حکم بھی زبانی نہیں کسی مستند کتاب سے فریقین کو ایک ساتھ سنادیں ورنہ استفتاء کی شکل میں لکھ کر مرکزی مدرسہ کو بھیجدیں اور وہاں سے جو جواب آئے وہ فریقین کو جمع کر کے سُنادیں

۱۲۔ حلقہ کے غیر مسلموں کے ساتھ بھی خصوصًا ایسا طرز عمل رکھیں کہ ان کی خیر خواہی امانت داری اور وفائے عہد پر اُن کو اعتماد ہو

۱۳۔ امام و مؤذن کو باری باری سال میں کم سے کم دو دفعہ ایک ایک ہفتہ کے لئے مرکزی مدرسگاہ کے ایسے بزرگ کی خدمت میں رکھا جایا کرے جو شیخ و مرشد کی حیثیت رکھتے ہوں اور مکاتبت تو اپنی اپنی دینی و اخلاقی اصلاح کے لئے ایسے بزرگ سے برابر رکھیں کہ مہینے میں دو دفعہ اپنے دینی و اخلاقی امراض کا حال لکھ کر ان کی تدبیر و علاج معلوم کر کے عمل کرتے رہیں۔

نئی تعلیم والوں کی اصلاح

ان کی حالت

سب سے دشوار و پیچیدہ معاملہ تو تعلیم یافتوں کا یا جدید طرز کے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے پڑھانے والوں کی دینی حفاظت و اصلاح کا ہے موجودہ نظام تعلیم کے ماحول میں ان کی حالت کچھ ایسی قابل رحم ہو گئی ہے کہ ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

کا معاملہ ہے ان کی کتابیں، ان کے اساتذہ، ان کے نگراں، ان کے رفقاء، ان کے امتحان، ان کے کھیل کود، ان کا طرز بود و ماند، اور سب سے بڑھ کر ان کا وہی مذکورۂ صدر اعلیٰ حیوانی زندگی کا نصب العین اور دانستہ یا نادانستہ ان غریبوں کا (الا ماشاء اللہ) خود اپنے یا انسان کے متعلق یہ تصور حیات کہ بس وہ حیوانی ارتقاء (ایولوشن) کے سلسلہ کا ایک نسبتہً زیادہ ترقی یافتہ حیوان یا اعلیٰ درجہ کا جانور ہے اس لئے لازمًا اعلیٰ درجہ کے کھانے پینے رہنے سہنے کی سعی و تدبیر کرتے کرتے مرجانے کے سوا ہماری زندگی کے اندر اور کوئی مقصد و معنویت نہیں!

اس لئے حضرت علیہ الرحمۃ کی تحقیق کا ماحصل تو اس جدید تعلیم کے بارے میں جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا۔ یہ ہے کہ سرے سے اس گندے تالاب میں کسی کو گودنا اور گرانا ہی نہ چاہیئے ورنہ پھر دامن بچانے کی فکر و فہمائش وہ "مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکلۂ خود باید زد" ہے کہ اپنا ہی سر پیٹنا چاہیئے، یہ بھی اوپر ہی واضح ہو چکا کہ اس نظام تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا پیوند جہاں بھی لگایا گیا وہ پیوند خود اسی رنگ میں ڈوب گیا۔

نئی تعلیم تعلیم ہی نہیں

اصل یہ ہے کہ یہ تعلیم دراصل تعلیم ہی نہیں ہے، نہ اسکول و کالج اور یونیورسٹیاں
تعلیم گاہیں ہیں زیادہ سے زیادہ کتاب خوانی یا زے لکھنے پڑھنے اور امتحان دینے
کے اڈے ہیں۔ لہٰذا ان کارخانوں کا کتاب خواں جتنا زیادہ پڑھا لکھا ہوتا
ہوتا ہے اتنا ہی کم تعلیم یافتہ ([illegible] ہوتا ہے یہ فتویٰ راقم احقر
یا کسی مولوی ملا کا نہیں، بلکہ اسی تعلیم جدید کی برادری کے ایک بڑے نامور ہموطن
فرد فرید سر سی دی رامن کا ہے جو نامور بھی سائنسدانی کے کمال میں ہیں، جس کا رعب
و ہیبت ہمارے دل و دماغ پر تمام جد[illegible] ہم سے بڑھ کر ہے یہ فتویٰ ابھی عین
سطور ہذا کی تحریر کے وقت بنگلور کی آ[illegible] نس کے افتتاحی خطبہ میں صادر
فرمایا۔ (پانیر یکم جنوری ۱۹۵۰ء)

پڑھے لکھے جاہل

اس سے بڑھ کر کا[illegible] ی بات یہ ہے کہ ان پڑھے لکھے ''نا تعلیم
یافتوں''[1] کو حقیقی معنی میں [illegible] ے کی تدبیر بھی موصوف نے اسی رنگ کی بتائی
ہے جو ہمارے حضرت [illegible] یشہ اور بار بار فرمایا کرتے تھے کہ ''بیش مرد کامل
پامال شو'' یعنی خال[illegible] ین کی کتابوں کی کافی نہیں جب تک کسی انسان کامل

---

[1] سر موصوف کی [illegible] جس کا
ترجمہ پڑھے لکھ[illegible] ی اس حدیث کی ترجمانی ہے کہ بعض علم یقیناً جہل ہوتا ہے ان
من العـ[illegible] یا قرآن مجید کی تعبیر میں گدھے پر کتابوں کا بوجھ کمثل الحمار
یحمل ا[illegible] ربائے برو کتابے چند۔

کی صحبت میسر نہ ہو، انسان تو انسان ہی سے بنتا ہے۔ اور حضرت نے کیا فرمایا۔ اسلامی تعلیم کا نصب العین تو اس کے اولین معلم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اولین متعلمین (صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین) سے یہی ملتا ہے کہ اس کا مطلب کتاب خوانی یا لکھا پڑھا ہونا ہرگز نہ تھا بلکہ وہی کسی مردِ کامل کے سامنے پامال ہو کر کامل بننا۔ کتابی اعتبار سے تو خود حضورؐ اور اکثر صحابہؓ سرے سے امی یا ان پڑھ تھے۔

اسی کو سر رامن نے ہمارے نا تعلیم یافتہ "نو تعلیم یافتوں" کے سامنے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ تعلیم نام ہے کسی اعلیٰ انسان سے تعلق کا۔ انفرادی زندگیوں تک میں سب سے زیادہ طاقتور تعلیمی اثر کسی طاقتور انسان سے تعلق ہی ہوتا ہے جو محض ذہنی اعتبار سے طاقتور نہیں بلکہ عظیم سیرت کا مالک ہوتا ہے اور زندگی کی سیدھی راہ دکھاتا ہے۔"

زندہ کتابوں کا مطالعہ

راقم ہذا صحبت و صحابیت کے اس اسلامی و مثالی اصول تعلیم کی رو سے ہمیشہ نئی و پرانی دینی و دنیوی تعلیم کے عزیز دوست معلمین و متعلمین و مصلحین و منتظمین سب کی خدمت میں عرض کیا کرتا ہے کہ جب تک کاغذی کتابوں کے ساتھ اور ان سے زیادہ ایمان و عمل کی زندہ انسانی کتابوں کے مطالعہ کا انتظام نہ ہوگا۔ اس وقت تک نہ انسانیت پیدا ہو سکتی ہے نہ دین ۔

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

ایک کالج جس کے پرنسپل آج کل ایک پرانے دوست ہیں جو عمر بھر تعلیم اور تعلیمات ہی کے محکمہ کے مختلف تعلیمی و انتظامی خدمات میں رہے۔ انہوں نے طلباء کے "کیریکٹر کی تعمیر" کی تدبیر یہ نکالی ہے کہ مختلف اماموں کے نام سے کالج

کو مختلف ٹیوٹوریل ہاؤسز (تربیتی بیوت) میں تقسیم کردیا ہے، مثلاً بیت علوی بیتِ حسنی، بیت حسینی وغیرہ اور ہر بیت کو کالج کے مختلف اساتذہ کی نگرانی میں دے کر یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ ان حضرات ائمہ کی سیرت کو پیش نظر رکھ کر طلباء کی سیرت سازی فرمائیں گے، مگر ان بیوت کے قیام کے بعد بھی طلباء کی سیرت ملاحظہ ہو کہ قریب کے باغ میں گھس جاتے ہیں اور زبردستی امرود توڑ توڑ کر کھا لیتے ہیں، دوکانداروں سے کھانے پینے کی چیزیں قرض لیتے ہیں اور ادا نہیں کرتے، راستہ گلی میں عورتوں کی تاک جھانک چھیڑ چھاڑ فقرے بازی تو گویا تعلیم جدید کے نوجوانوں کا تفریحی حق ہے۔

ایک دن پرنسپل صاحب سے عرض کیا گیا کہ حضرت کتابی تعلیم کی طرح کتابی بیوت سازی یا حضرات ائمہ کی سیرت خالی پڑھنے پڑھانے سننے سنانے سے سیرت سازی نہیں ہوتی اس کی تو فقط ایک ہی تدبیر ہے کہ خود آپ اور آپ کے اساتذہ کی زندگی میں حضرات ائمہ کی پاک سیرت جلوہ گر ہو۔ اور آپ کی زبان سے زیادہ آپ کی زندگی اس سیرت کی ترجمان ہو۔

ورنہ پھر یہی "پڑھے لکھے جاہل" جب ملک و سماج کی زندگی میں داخل ہوتے اور زندگی کی ذمہ داریاں ان کے سپرد ہوتی ہیں تو سب سے بڑی مصیبت اس دنیا کی زندگی اور ملک و سماج میں ان ہی کا وجود ہوتا ہے جس کا تماشا آج ہندوستان و پاکستان ہر جگہ دیکھا جارہا ہے کہ حکومت کا کوئی انتظام کوئی تجویز کوئی قانون اس تعلیم جدید کے عُمّال و حکام سے لے کر وزراء تک کی بددیانتی، رشوت ستانی خود غرضی و پاسداری کی بدولت کامیاب نہیں ہونے پاتا۔

بددیانتی و رشوت ستانی کی روک تھام کے لئے مستقل محکمے قائم ہوتے ہیں لیکن بے نتیجہ اور کیوں نہ بے نتیجہ ہوں اس لئے کہ رشوت ستانی کے روکنے والے

غیر رشوت ستاں کہاں سے آئیں۔ یہ تو حکومت کے اندر کا لاعلاج روگ ہے حکومت سے باہر جو شر و فساد ہے وہ انہیں "ناتعلیم یافتہ پڑھے لکھے"، چھوٹے بڑے لیڈروں کی ذات سے برپا ہے، وہ کیا ان کے باہمی نفاق و شقاق اور عوام کو مال وجاہ کی ذاتی خودغرضیوں کا آلہ کار بنانے کے سوا کسی اور شے کا خمیازہ ہے۔ ہندوستان وپاکستان کا ذکر ہی کیا ساری دنیا جو جنگ وجدل کا اکھاڑہ بن گئی ہے اور امن وسلامتی کی مجلس (سیکورٹی کونسل) تک میں اپنی خود غرضیوں اور پاسداریوں کی راہ سے امن سوزی کی آگ کو جو بھڑکاتے اور پھیلاتے رہتے ہیں کیا وہ یہی اعلیٰ درجہ کے پڑھے لکھے جاہل نہیں ہیں۔

غرض گریبان میں سر ڈال کر ذرا سوچا اور دیکھا جائے تو "پڑھی لکھی" جاہلیت جدیدہ نے ساری دنیا کے حق میں ایسے قہر و عذاب کی شکل اختیار کر لی ہے کہ غریب ان پڑھ جاہلیت قدیمہ بھی اس کے آگے مات ہے!

خود خدا کی کتاب جس کا سرچشمۂ علم و حکمت کامل و مطلق نامحدود و بے خطا ہے اور جس کے اندر کسی کجی و کج راہی کا گذر ہی نہیں جب مرد کامل کے بغیر اس کی بھی نری کتابی تعلیم کافی نہیں تو ایسی کتابوں کا ذکر ہی کیا جو ناقص و محدود، پرخطا و پرنسیان علم کی پیداوار اور کجیوں اور کجراہیوں سے پُر ہیں۔ ان کی تعلیم تو اگر کسی درجۂ اضطرار میں اختیار بھی کی جائے تو مردِ کامل کے ساتھ علمِ کامل کی کتابوں کی تعلیم اور بھی اہم و اقدم ہو جاتی ہے

بحالت موجودہ ان کی اصلاح کی ممکن صورت

یعنی جدید تعلیم کے ان ناقص اثرات کو دور کرنے کے لئے جن کی بناء پر اس کے پڑھے لکھوں کو خود اسی کے اکابر کی زبان سے ابھی "ناتعلیم یافتہ" سُن چکے ہو، اولاً تو یہ ضروری ہے کہ اس کے اساتذہ و معلمین خود ان اثرات سے پاک اور تلامذہ و متعلمین کے لئے پاک

دپاکیزہ زندگی کا نمونہ ہوں، ثانیاً ان مادی و معاشی علوم کے ساتھ روحانی و معادی یا دینی علوم کی تحصیل لازم اور بقدر ضرورت ان پر مقدم ہو، پہلی دونوں چیزیں یعنی اساتذہ و معلمین میں مطلوبہ بالا انقلاب و تبدیلی اور اس دنیوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا لزوم یہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کے ہاتھ میں یہ جدید نظام ہے اور جو خود اس کے اثرات سے ابھی اتنے مرعوب و مغلوب ہیں کہ ان سے کسی فوری انقلاب کے قبول کی امید نہیں

البتہ عام مسلمانوں کو اس لادینی نظام تعلیم کے مضر اثرات اور زہریلے ثمرات پر متنبہ کر کے آگے کے فتنہ کا بند باندھ دینا زیادہ دشوار نہ ہوگا اور اوپر جو دینی تعلیم کا نظام پیش کیا گیا ہے اس سے یہ بھی کام لیا جائے کہ

۱۔ جب لوگ اپنی اس راعیانہ جوابدہی کو سمجھنے لگیں کہ جس طرح ان کے ذمہ اپنے اہل و عیال یا توابع کی دنیوی خبرگیری و خیر خواہی ہے اس سے بدرجہا بڑھ کر عقلاً و نقلاً دینی خبرگیری و خیر خواہی واجب ہے کیونکہ ایک طرف زیادہ سے زیادہ دنیا کا فانی و غیر یقینی بلکہ وہمی ضرر ہے اور دوسری طرف آخرت کی ابدی و یقینی زندگی کا یقینی ضرر اس لئے اپنی اور اپنی اولاد اور توابع کی پوری پوری خیر خواہی تو یہ ہے کہ ایسے لادینی نظام تعلیم کی طرف قطعاً ان کو جانے ہی نہ دیں، انشاءاللہ بہت سے باہمت مومن اس ایمانی ہمت پر کمربستہ ہو جائیں گے۔ اور حضرت علیہ الرحمۃ کی اصل رائے یہی ہے، جیسا کہ اوپر تعلیم انگریزی کی تحقیق میں معلوم ہو چکا۔

۲۔ ورنہ ایمان کا اقل قلیل تقاضا یہ ہے کہ لادینی اسکولوں اور کالجوں کے دروازہ میں قدم رکھنے سے پہلے دیندار معلمین کی نگرانی میں بقدر واجب دینی تعلیم پوری کرادی جائے یعنی وہی مذکورۂ بالا مسجدی مکاتب کی بلکہ عربی کے کم از کم ابتدائی درجہ تک کی، اس کے علاوہ گھر پر ان کی پوری پوری دینی و عملی و اخلاقی نگرانی رہے۔ اور جدید تعلیم کے جدید اقامت خانوں میں تو ہرگز ہرگز قدم نہ رکھنے پائیں۔ نیز اپنے مکتب یا مدرسہ کے یا کسی اور

دیندار عالم سے ملاقات یا مکاتبت کا تعلق ان سے ضرور قائم رکھایا جائے ۔

۳ ۔ ایک اور کرنے کا کام یہ ہے کہ ایسے اقامت خانے زیادہ سے زیادہ قائم کئے جائیں جن کے مصارف قیام و طعام کم سے کم ہوں اور جن میں اچھے صالح، دیندار نگرانوں کی نگرانی میں دینی تربیت کے ساتھ بقدر واجب و ضرورت دینی احکام کی تعلیم و تفہیم کا انتظام ہو جس کے لئے روزانہ آدھ گھنٹہ یا ہفتہ میں دو تین دن ایک ایک گھنٹہ کافی ہوگا اور جمعہ کے دن ایک گھنٹہ حضرت کے مواعظ میں سے مناسب وعظوں کا سناتے رہنا۔ نیز بعض ایسی چیزیں بھی کبھی کبھی سناتے رہنا جن سے جدید عقلیت و عقلیات، سیاسیات و معاشیات کا وہمی رعب و ہیبت رفع ہو مثلاً مولانا دریابادی کے سچ اور صدق وغیرہ کے پرانے پرچوں کے مناسب مضامین و اقتباسات، مولانا سید سلیمان ندوی صاحبؒ کے مضامین سیرت خصوصاً خطبات مدراس، مولانا گیلانی رح کی خاتم النبیین۔ اور کاش کہ مولانا جو درسِ قرآن مجید حیدر آباد میں دیتے رہے ہیں اس کے کچھ ہی خاص خاص درس مرتب و شائع فرمادیتے تو وہ مولانا مودودی کے رسائل و مضامین، مولانا علی میاں کی تحریرات اور راقم احقر کا رسالہ "مذہب و عقلیات"، اور سیرۃ النبیؐ (مطبوعہ دار المصنفین) میں شائع شدہ باب معجزات و فلسفہ جدیدہ، اور حضرت علیہ الرحمۃ کا سلسلہ تجدیدات یعنی تجدید تعلیم و تبلیغ کے بیشِ نظر رسالہ کے علاوہ۔ تجدید تصوف و سلوک اور جامع المجددین اور تجدید قومیات و سیاسیات [1]

۴ ۔ حضرت علیہ الرحمۃ اور مذکورہ بالا دیگر حضرات مصنفین کی کتابوں اور تحریرات کو یوں بھی جدید تعلیم کے اسکول و کالج کے طلباء اور تعلیم یافتہ مختلف طبقات میں جن جن طریقوں سے زیادہ سے زیادہ پڑھے پڑھائے جانے کی سعی ہو سکے انشاء اللہ کچھ نہ کچھ لادینی کے زہر کا

---

[1] جو کتابی صورت میں انشاء اللہ جلد شائع ہو جاتے گی "قومیات و سیاسیات حاضرہ" کے عنوان سے معارف ۱۹۴۷ء میں بصورت مضمون شائع بھی ہو چکا ہے۔

ضرور تریاق ہوگا۔ مثلاً جہاں جہاں خود ان اسکولوں کالجوں اور ان کے اقامت خانوں کے مطالعہ گھروں (ریڈنگ روم) میں ان کتابوں کو رکھایا جا سکے رکھایا جائے، اضلاع اور شہروں کے عام مطالعہ گھروں اور کلبوں میں رکھایا جائے۔ ضلعوں، شہروں قصبوں میں ایسے مستقل مطالعہ گھر کھولے جائیں جن میں ان کتابوں کے علاوہ بعض اچھے رسائل صدق معارف، الفرقان، تعمیر (لکھنؤ) ترجمان القرآن، فاران (کراچی) جاری ہوں اور محض ترغیبی چارہ کے طور پر دو ایک روزنامہ اخبارات بھی جو کچھ غنیمت ہوں۔ گو اخبارات میں خیر و صدق پر شر و کذب اتنا غالب ہوتا ہے کہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ نسبتاً غنیمت بھی کس کو کہا جائے

۵ — اگر جدید ذہنیت کے مسائل و مطالبات سے آگاہ و مانوس اور ان کے مفاسد کی فہم و اصلاح کی صلاحیت کے ساتھ ان کو مخاطب کرنے والے کچھ مقرر یا واعظ میسر ہوں تو گشت اور دوروں کے ذریعہ اسکولوں اور کالجوں کے اندر یا باہر بلا بحث و مناظرہ کے محض خطاب و اسماع کا کچھ موقعہ ان کو مل سکے تو اس سے کام لینا بھی انشاء اللہ نافع ہوگا لیکن خود ان حضرات مقررین کا ایمان و عمل، اخلاق و اخلاص کے اعتبار سے صالح ہونا اور کسی طرح کی جاہ و مال کی طلب سے محتاط ہونا مقدم ہے۔

نظام اصلاح کی رُوح

اور ان پر کیا موقوف اس سارے نظام اصلاح کی جان و روح یہی ہے کہ اس کے سارے خدام و کارکن (اساتذہ و معلمین، ائمہ و مؤذنین، مبلغین و واعظین) خود ایمان و عمل ظاہر و باطن، صورت و سیرت تواضع و خدمت، اخلاص و ایثار کا نمونہ ہوں اس لئے ضروری ہے کہ جو حضرات تعلیم و تبلیغ کسی قسم کی اصلاحی خدمت کے براہ راست خادم ہوں ان سے نظام کی مالی ذمہ داریوں کے آمد و خرچ دونوں کا قطعاً کوئی تعلق نہ ہو نہ اپنے حلقہ تعلیم و اصلاح کے لوگوں سے کسی طرح کے لین دین کے مالی معاملات رکھیں اس طرح کے

عام ہدایا اور دعوتوں تک کو قبول نہ کریں جیسی کہ بالعموم ائمہ مؤذنین یا علماء و واعظین کی رسمًا لوگ کیا کرتے ہیں۔ جب تک کسی کے خاص خلوص و تعلق کا اطمینان نہ ہو۔

اس نظام کی مالی ذمہ داری تمامتر براہ راست اہل مال پر یا ایسے عام چندوں پر جن میں حضرت کے ہدایت فرمودہ اصول کے موافق دینے والوں کی رضائے حق و طیب خاطر کا پورا التزام ہو۔ یعنی کسی طرح کے بواسطہ یا بلاواسطہ دباؤ دیا اثر سے وصول نہ کئے جائیں [۱] نہ ایسے فوری جوش اور جذبات کے تحت جس میں دینے والوں کو عاقبت اندیشی کا ہوش نہیں رہتا۔ اور دینے کے بعد پچھتاتے ہیں یا اس کی بدولت حقوق واجبہ کی ادائی میں قصور و کوتاہی واقع ہوتی ہے۔ زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ خطاب عام سے پہلے تحریری یا تقریری اشتہار و اعلان کے ذریعہ ضرورت کی اطلاع کر دیجائے، مقدار کی کمی زیادتی سے زیادہ نظر معطی کے اخلاص و للٰہیت پر ہو، مخلص غرباء کے دو چار پیسوں کو بھی امراء کے ہزاروں سے کم قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے

مسجد و مکتب کے مصارف زیادہ تر اس کے حلقہ و محلہ ہی سے پورے

---

[۱] خود حضرت علیہ الرحمۃ کو اس کا جس درجہ لحاظ تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کرو جو حضرت کے ایک ملفوظ میں منقول ہے کہ ایک شخص پانی پت کے علاقہ کے یہاں تھانہ بھون آئے، پندرہ روپیہ دینے مدرسہ میں۔ مجھ کو شبہ ہوا کہ قریب کا مدرسہ چھوڑ کر تھانہ بھون روپیہ کیوں لائے۔ باوجود اس کے کہ وہ مرید تھے مگر مجھ کو شبہ ہو گیا وجہ دریافت کی تو کہنے لگے کوئی وجہ نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھ کو شبہ ہوتا ہے کہ تم اس لئے یہاں لائے ہو کہ پیر بھی خوش ہوں گے اور مدرسہ کا بھی نفع ہو جائے گا۔ کہنے لگے واقعی بالکل صحیح ہے، اب میں نے روپیہ واپس کیا۔ اور کہا کہ یہ تو ایک قسم کا شرک ہے کہ دین کا کام رضائے خلق کے لئے کیا جاتے۔

(الافاضات الیومیہ حصہ چہارم ص۲۰۷)

ہو سکیں تو بہتر ہے[1] لیکن انتظام اس کی بھی آمد و صرف کا مساجد کے ائمہ و مؤذنین سے بالکل نہ ہو بلکہ مرکزی ادارہ سے یا اسی محلہ کے کسی دیندار امین و معتمد شخص یا جماعت سے ائمہ و مؤذنین، معلمین و مبلغین ظاہر یا باطن کے ایسے اغنیاء یا متوکلین تو کم ہی ملیں گے جو بالکلیہ لوجہ اللہ اپنی خدمات ادا کریں۔ تاہم جہاں کہیں دو ایک جو کچھ بھی میسر آجائیں ان کو خصوصیت سے اس نظام کے لئے خیر و برکت کا باعث جاننا چاہئے باقی معمولاً اس نظام کے خادمان دین میں انہیں کو قبول کیا جائے جو معاوضہ یا تنخواہ کی بجائے نفقات کی صورت کو قبول فرمائیں، جو ان کی خدمت کی نہ ہو گی بلکہ ان کے حبسِ وقت کی بناء پر ان کی ذاتی و خانگی ضروریات کی ان کی ضرورت اور ادارہ کی وسعت کے بقدر کفالت ہو گی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنی حیثیت و استطاعت کے موافق اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا کفیل ہوتا ہے حتیٰ کہ اگر کبھی کسی وجہ سے آمدنی میں کمی ہو تو ان خدام کو اپنے نفقات میں بھی اسی طرح کمی کے لئے تیار رہنا چاہیے جس طرح باپ کی آمدنی کی کمی کی صورت میں اس کے بال بچے تیار رہتے ہیں۔ نیز محض

---

[1] ایک بڑی آسان صورت اس مضمون کو ملاحظہ فرما کر ہمارے اشرف المدارس (جس کا ذکر خیر پہلے بھی گذر چکا ہے) کے حضرت مولانا ابرارالحق صاحب سلمہٗ نے اپنے تازہ تجربہ کی یہ بتلائی کہ بعض جگہ توجہ دلانے پر لوگوں نے مقامی مکتب قائم کرنا چاہا تو چندہ کے لئے چٹکی کا ایک چٹکلا مولانا نے یہ تجویز فرما دیا کہ روزانہ کھانا پکاتے وقت محلہ کا ہر شخص ایک چٹکی آٹا اس کے لئے نکال دیا کرے۔ چنانچہ پہلے ہی مہینہ میں اس بستی یا محلہ سے ۳۵ روپے اس چٹکی کے چٹکلہ سے جمع ہو گئے۔

واقعی گھر میں روزانہ جو جنس پکتی ہے اس میں سے ایک چٹکی یا جو روپیہ بھنایا جائے اس میں سے ایک دو پیسے نکال دینا کتنا آسان ہے اور اس سے کتنا بڑا کام نکل سکتا ہے بس شرط ارادہ کرنا ہے پھر حق تعالیٰ خود ہی کام آسان فرما دیتے ہیں۔

اس نفقہ میں قابل تحمل کمی وتنگی کی وجہ سے اس خدمت کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پسند نہ کریں۔ نفقہ کی مقدار کا تعین بھی خادم کے مرتبہ فضل وکمال کی بناء پر نہ ہوگا کیونکہ یہ اس کے فضل وکمال کی قیمت نہیں بلکہ خادم کی ضرورت وحیثیت کی بناء پر ہو۔ مثلاً کوئی مدرس مجرد یا اتنا خوشحال ہے کہ اہل وعیال کے مصارف اس کی حیثیت کے موافق گھر سے پورے ہو جاتے ہیں اور صرف اپنے ذاتی مصارف کا حاجتمند ہے تو خواہ علم وفضل میں زیادہ ہو لیکن اس کا نفقہ اس کم علم وفضل سے کم ہوگا۔ جو مجرد نہیں یا صاحب اہل وعیال ہو کر گھر کا اتنا خوشحال نہیں۔ وقس علی ھذا

ضمیمہ

ایک بڑا فرض کفایہ

دوہری ذمہ داری

یہ بات بار بار یاد دلانے اور یاد رکھنے کی ہے کہ مسلمانوں پر اپنی ہی نہیں ساری دنیا کی صلاح و فلاح کی دوہری ذمہ داری ہے البتہ دوسری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی پہلی شرط خود مسلمانوں کا قومی و اجتماعی اعتبار سے من حیث الامت "خیر امۃ" یعنی بہترین قوم بنانا اور ہونا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس کم و بیش ساری برائیاں اور گمراہیاں افراط و تفریط کی بے اعتدالیوں سے پیدا ہوتی ہیں اسی لئے دوسری جگہ "خیر امۃ" کے مفہوم کو امۃً وسطًا کے عنوان سے واضح فرمایا گیا کہ "ہم نے تم کو ایک با اعتدال امت بنایا ہے، تاکہ تم (اسلام کی با اعتدال زندگی یا صراط مستقیم کے حق میں) سارے انسانوں پر گواہ (یا ان کے لئے نمونہ) ہو اور رسول تمہارے اوپر گواہ ہوں[1]" یعنی تم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدم بقدم چلو، اور ساری دنیا تمہارے قدم بقدم ہو۔

غرض اس قرآنی تعلیم و منطق کی رو سے نہ فقط مسلمانوں بلکہ سارے انسانوں کی خیر و بہتری اسی میں منحصر ہے کہ مسلمان انفرادی ہی نہیں اجتماعی و قومی حیثیت سے بہترین

---

[1] وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدًا ط (پ۲ البقرۃ)

قوم وامت اور اپنی فکری وعملی زندگی میں اسلام کے ایمان وعمل صالح کی زندہ وسراپا گواہی (شہادۃ علی الناس) ہوں۔

اوراق بالا میں مسلمانوں کی اجتماعی تعلیم وتبلیغ کے اصول وفروع سے متعلق خالص اسلامی نظر سے جو تجدیدات واصلاحات اور ان کے تحت نظام کار کا خاکہ جو انقلاب عام وتام کے نام سے پیش کیا گیا ہے وہ حضرت جامع المجددین[1] علیہ الرحمۃ کی دیگر ابواب دین میں تجدیدی واصلاحی جامعیت ہی کی طرح ایسا جامع وہمہ گیر ہے کہ اگر وقتی ومقامی تقاضوں کے پیش نظر تھوڑے بہت تغیر وترمیم کے ساتھ اس کو عمل میں لایا جائے تو انشاء اللہ امت مسلمہ کے کسی طبقہ کی اسلامی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ رہ جائے گا کہ مسلمان قرآنی معیار کے مطابق "خیر امۃ"، "وامۃ وسط"، اور "شہداء علی الناس"، کے مقام پر از سر نو کھڑے ہو کر گم کردہ راہ دنیا کے لئے نشان راہ نہ بن جائیں

اسلام پر شبہات کا ازالہ

شہادۃ علی الناس کے اس حال کے بعد ترے قال کا صرف ایک فرض زیادہ توجہ کا محتاج رہ جاتا ہے، دوسری قوموں کی طرف سے عقلی وفکری، سیاسی ومعاشی اخلاقی ومعاشرتی، تہذیبی وتمدنی کسی پہلو سے اسلامی تعلیمات پر جو شکوک وشبہات ظاہر کئے جائیں ان کو تحریر وتقریر سے دور کیا جائے اس سے معاندین پر حجت قائم ہو گی اور حق پسندوں کو یہ شکوک قبول حق میں مانع نہ رہیں گے۔ اس خدمت کے لئے فرض کفایہ کے درجہ میں ایک ایسی جماعت کا مسلمانوں میں موجود رہنا ضروری ہے جو غیر مسلموں کے ایسے علوم وفنون، افکار ونظریات سے اچھی طرح واقف ہوں، جن کا اسلامی عقائد

---

[1] جس کا اندازہ اسی نام کی کتاب (جامع المجددین) سے فرمایا جاسکتا ہے

داعمال، اصول وفروع پر نفیاً یا اثباتاً کسی طرح اثر پڑتا ہو، تاکہ ان کی تردید یا ان سے تائید کا کام لے۔ ہمارے قدیم متکلمین یہی خدمت انجام دیتے تھے۔

عہد حاضر میں بھی اس خدمت کے لئے حضرت مجدد کا ارشاد ہے کہ کچھ وہ لوگ ہوں جو ایسے لوگوں کے مقابلہ میں تبلیغ کریں جن کو اسلام پر کچھ شبہ ہو یا اسلام سے تعلق کم ہو گیا ہو (جیسے نوتعلیم یافتہ یا انگریزی داں مسلمان) یا سرے سے غیر مسلم ہوں اس طرح دوسری قوموں کے شبہات سے اسلام کو جس مضرت کا اندیشہ ہے اس سے بچانے کو حضرت نے فرض کفایہ قرار دیا ہے[۱]

آج یہ فرض اس میں شک نہیں کہ بہت بڑا فرض کفایہ ہے، فرنگی سائنس و فلسفہ علوم و فنون، تہذیب و تمدن و سیاسیات و معاشیات کی راہ سے جو شکوک و اعتراضات راہ پاگئے ہیں اور پاتے رہتے ہیں، یورپ کے حاکمانہ و سیاسی غلبہ کی مرعوبیت اور نت نئی سائنسی ایجادات و اکتشافات کی ہیبت نے ان کے زہر کو خصوصاً بہت تیز کر دیا ہے، جدید تعلیم کے اثر سے یہ زہر تعلیم یافتہ طبقہ میں سرایت کرتا ہے پھر سیاسی و تہذیبی قیادت چونکہ ساری دنیا میں اسی طبقہ کے ہاتھ میں آگئی ہے اس لئے قدرۃً دیگر طبقات حتیٰ کہ خاندانی علماء و مشائخ اور خالص دینی درسگاہوں کے طلباء و اساتذہ تک اس تعدیہ سے محفوظ نہیں۔

کفر از کعبہ

دنیا پر یورپ کی براہ راست سیاسی گرفت تو خود یورپ ہی کی آموختہ سیاسی تعلیمات کی بدولت ڈھیلی ہوتی جارہی ہے لیکن اس کی سیاسیات و معاشیات

---

[۱] دیکھو اوپر ص ۲۰۷ ح ۲ اوپر صفحہ ۱۸-۱۹- دیکھو۔

تہذیب و تمدن، علوم و فنون کے لادینی تصورات و افکار کا زور وہاں بھی روز افزوں ہے جہاں براہِ راست حاکمانہ و سیاسی اقتدار ایک دن بھی نہیں رہا۔ کم و بیش سارے عربی ممالک اس مغرب زدگی میں ہم عجمیوں سے بھی بازی لے گئے۔ خصوصًا ان کے حکمران و سربرآوردہ طبقات، زبان پر لاتے دل کانپتا ہے کہ یہ سیلاب اب بلد الحرام کی دیواروں تک سے ٹکرا رہا ہے، حد یہ کہ جدہ و طائف میں انگریزی تعلیم کے مدرسے کھول کر آنے والی نسلوں کے عوام و خواص سب کے لئے کفر و الحاد کے دروازے کعبۃ اللہ کی اس حکومت کے اندر کھول دیئے گئے ہیں جو ادنیٰ ادنیٰ بدعات کی بھی روادار نہیں سمجھی جاتی۔ "چو کفر از کعبہ برخیزد" کی شاعری و مجاز نے اس سے بڑھ کر واقعہ و حقیقت کا لباس کیوں کبھی پہنا ہوگا!

یونانی اور فرنگی شبہات میں فرق

کچھ ایسی ہی صورت ہے جیسی کہ یونانی فلسفہ و حکمت سے مرعوبیت نے مسلمانوں کی سیاسی و اقتداری قوت و سطوت کے عین شباب میں ایک تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ پر قبضہ پا لیا تھا لیکن اس وقت اول تو اس طبقہ کے ہاتھ میں عام مسلمانوں کی قیادت و حکومت نہ تھی۔ دوسرے یونانی فلسفیات سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات زیادہ تر عقائد کے دقیق مسائل تک محدود تھے، سیاسیات و معاشیات، تہذیب و تمدن جن کا اثر عوام و خواص کے سارے طبقات پر پڑتا ہے ان کے بھیس میں لادینی نظریات و تصورات کی دعوت و اشاعت نہ ہوتی تھی۔

آج ذہن پہلے انہیں راستوں سے مسموم ہوتا اور بالآخر غیر شعوری طور پر ایمان و عمل سب کو لے ڈوبتا ہے، یونانیات کے مقابلہ میں اگر ہمارے علماء و متکلمین کو زیادہ تر صرف ایمانیات کے ایک محاذ کا سامنا تھا تو آج انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی

تمدنی و ثقافتی غرض زندگی کے ہر ہر محاذ پر مسلح ہونے اور رہنے کی ضرورت ہے

ندوہ کا فضل تقدم

اس ضرورت کا احساس پہلے پہل اکابر ندوہ نے فرمایا اور ایک مستقل درسگاہ (دار العلوم) کا قیام زیادہ تر اسی غرض سے عمل میں آیا۔ لیکن ایک طرف تو جدید علوم و فنون کی باقاعدہ تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہوا۔ سارا سرمایہ سنی سنائی اخباری باتیں یا جدید معلومات کی کچھ معمولی مصری کتابیں رہیں۔ باضابطہ درس میں فرسودہ یونانیات ہی کا چرخہ چلتا رہا۔ دوسری طرف نری زبان کی حد تک کچھ انگریزی لازم کر دی گئی جس سے حال و قال دونوں میں الٹے فرنگی رجحانات کو مدد ملی، نیز دنیا طلبی کا ایک ارزاں راستہ اس دینی درسگاہ سے ہو کر بھی نکل گیا۔ یعنی ندوہ کے طلبا، بلکہ فارغ التحصیل علما تک طلبِ دنیا میں انگریزی اسکولوں، کالجوں کے طالب علم بننے لگے۔

ان کوتاہیوں اور خرابیوں کے باوجود فرنگی تعلیم کے آوردہ شبہات اور ان سے متاثرہ طبقات کو مخاطب و متاثر کرنے کی سب سے زیادہ سعادت مدارس دینیہ میں ندویوں ہی کے حصہ میں آئی۔ ان کے قلم نے خصوصاً نئی تعلیم کے مختلف طبقات میں خاصا قبول و اعتماد حاصل کیا۔ دار المصنفین کا سارا کارنامہ ندوی برادری ہی کا مرہونِ قلم ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ندوہ کی زمین اس مقصد کے لئے صالح یقیناً بہت ہے لیکن استاد محترم علامہ شبلی نعمانیؒ کے بعد "پیر توڑ کر" پھر کوئی نہ بیٹھا کہ یکسوئی کے ساتھ اس صلاحیت کو ترقی دینے کی فکر و تدبیر کرتا[1] نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کی بجائے بظاہر ندوہ کی اس خصوصیت کا بھی اب خاتمہ ہے اور حضرت سید صاحب (مولانا

---

[1] اب تو کس مپرسی کی نوبت یہاں تک ہے کہ مہتمم تک پورے وقت کا میسر نہیں مہینہ میں صرف ۱۵ دن کے لئے مستقل مہتمم کا اہتمام رہتا ہے۔

سید سلیمان) کی علمی علیحدگی نے دار المصنفین کو بھی بے جان کر دیا ہے۔

لادینی روگ دینی اداروں میں

قومی و سیاسی رنگ کی لادینی رائج الوقت خدمات کا ایک بڑا روگ دینی خدمات و ادارات میں بھی یہ پھیل گیا ہے کہ اپنی قوت فرصت اور صلاحیت کا لحاظ فرمائے بغیر اکثر حضرات کئی کئی ذمہ داریوں کو قبول فرما لیتے ہیں، لادینی کاموں میں مقصود اولاً تو کام سے زیادہ نام ہوتا ہے اور کام جو کچھ ہوتا بھی ہے زیادہ تر دنیوی اغراض سے بخلاف دینی کاموں کے کہ ان کی اصل غرض اخروی اجر اور رضائے حق ہے۔ اگر کسی ایک ہی کام کے حقوق کی کما حقہ ادائی میں ساری زندگی لگ اور ختم ہو جائے تو بھی اللہ تعالیٰ کی رضا اور اجر آخرت کی اس سے زیادہ امید کی جا سکتی ہے جتنی کئی کئی ذمہ داریوں کے ناقص طور پر ادا کرنے سے، بلکہ الٹے مواخذہ کا اندیشہ ہے ہمارے اجتماعی کاموں میں ناکامیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ تن من دھن کی لگن کے ساتھ لگ جانے والا کوئی ایک فرد بھی مشکل ہی سے ہوتا ہے۔

دو ضروری باتوں کا انتظام

ندوہ یا اور جو ادارہ بھی اس فرض کفایہ کا حق کما حقہٗ ادا کرنے کی طرف متوجہ ہو دو باتوں کا انتظام ازبس ضروری ہے۔ اول و اقدم تعلیم کے ساتھ ایسی دینی تربیت کا اہتمام ہے کہ ایمان و عمل، صورت و سیرت، ظاہر و باطن ہر اعتبار سے اس خدمت کے خدام اسلامیت کی نمائندگی یا شہادت علی الناس کا جاذب و معیاری نمونہ ہوں۔ عمل میں خالق کے ساتھ مخلوق کے حقوق یا اسلامی معاملات و معاشرت کی نگہداشت اسلام کو سب سے زیادہ پرکشش بناتی ہے سیرت کے

ساتھ وضع وصورت کا معاملہ بھی حقیر وخفیف ہرگز نہیں خاص کر اس جماعت کے لئے جو غیروں یا مخالفوں کے دل ودماغ سے اسلام کے متعلق ایمانی وعملی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو نکالنے کا فرض پورا کرنا چاہتی ہے، اپنے پرائے سب کا سابقہ عقائد وعبادات سے پہلے معاشرت ومعاملات ہی سے پڑتا ہے اور سب کی نظر باطن وسیرت سے پہلے ظاہر صورت کو دیکھتی ہے آدمی سُن کر کم اور دیکھ کر زیادہ قبول کرتا ہے [۱]

دوسرا کام جدید چیزوں کی مستند ومنضبط تعلیم ہے، جامعہ عثمانیہ کی بدولت جدید علوم وفنون کی ضروری ومعتبر کتابیں خود اُردو میں منتقل ہو گئی ہیں ان میں سے پیش نظر مقصد کے مناسب چیزوں کو قدیم معقولات کی جگہ باقاعدہ نصاب میں شریک کر دینا کافی ہوگا۔

سائنس کی عملی تعلیم درکار نہیں البتہ سائنس کا فلسفہ [۲] و مذہب سے فرق وتعلق اس کی تحقیق ورسائی کی تجدید، طبعیات، حیاتیات، فلکیات وغیرہ کے خاص خاص ایسے نظریات ومعلومات جن کا مذہب پر سلبی وایجابی کوئی اثر پڑتا ہو، مثلاً مادہ کی ساخت ونوعیت، حیات کی حقیقت وماہیت، ارتقاء واضافیت وغیرہ کی محض نظری تفہیم وتشریح [۳] جدید فلسفہ خصوصاً تصوریت (آئیڈیلزم) اور علمیات (اپسٹمالوجی) کے

---

[۱] ندوی طلباء وعلماء میں تو بعض اثرات وروایات کی بدولت اعمال ہی نہیں عقائد تک میں ایسی سستی آگئی تھی کہ دوسروں کو کیا حیثیت بخشتے؟ الحمدللہ کہ اب اس آزادی وروشن خیالی کا دور دورہ نہیں رہا۔ عمل کی آزادی میں بھی کمی ہے لیکن بس کمی ہی۔ ورنہ صورت وسیرت اخلاق وعادات معاملات ومعاشرت میں خیر امۃ اور شہداء علی الناس کی شان وکشش کا کوسوں اب بھی پتہ نہیں حیرت ہوتی ہے کہ بہت سی بالکل اختیاری اور موٹی موٹی باتوں تک کی طرف اعتنا نہیں۔

(باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

مباحث سے پوری واقفیت ضروری ہے مقدمہ فلسفہ (انٹراڈکشن ٹو فلاسفی) مسائل فلسفہ (پرابلمس آف فلاسفی) اور تاریخ فلسفہ کی ایک ایک کتاب کافی ہوگی۔ اخلاقیات ونفسیات کی بھی ایک ہی ایک کتاب یہ چیزیں تو مذہب کے زیادہ تر اصولی وقریبی مسائل کے کے لئے کار آمد ہونگی خود مذہبی مسائل کے لئے فلسفہ مذہب ونفسیاتِ مذہب وغیرہ کے عنوان کی چیزوں کا مطالعہ۔

مادیانہ سطحیت

کے ندرتے دورحاضر کے انسان کو ایسا خودفراموش بنا دیا ہے کہ اپنی انسانی فطرت کے سارے اعلیٰ وعمیق باطنی مسائل ومطالبات کو بھلاکر (نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ) معاشیات وسیاسیات کے بالکل بطنی مقاصد ومطلوبات میں کھو گیا ہے اپنی عمیق فطرت کی تشنگی کو زیادہ سے زیادہ بس بے معنیٰ وبے مقصد تہذیب وتمدن یا ثقافت کے سراب بہلاتا رہتا ہے۔ اس سطحیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مذہب جس کی بنیاد ہی تمامتر باطنی فطرت کے عمیق واعلیٰ عقائد وایمانیات پر تھی اس کو بھی اب

(بقیہ از صفحہ گذشتہ)

؎۲ WALTER GRIEYSON اور N.W.SULLIVAN کا مرتبہ مجموعہ OUTLINE OF MODERN BALIEF خاکہ فکر جدید) ہمارے مطلب کے لئے بڑی حد تک تازہ ترین (لیٹسٹ) اور نسبتاً سہل ترین ہے یہ ہر علم کے مستند ارباب قلم کے نوشتہ ۱۲ رسالوں پر مشتمل ہے اگر اس کے ضروری حصوں کا ترجمہ ہوجائے تو کیا کہنا۔ اصل بھی دستیاب ہوسکے تو استاد کے پیش نظر ہے

؎۳ راقم احقر کی نظر میں پالسن کی مقدمہ فلسفہ رسل کی مسائل فلسفہ اور ویبر کی تاریخ فلسفہ زیادہ موزوں ہونگی۔ یہ جامعہ عثمانیہ سے شائع ہوچکی ہیں۔

معاشی وسیاسی لطنیات وسطحیات ہی کی میزان پر تولا یا نام نہاد ثقافتی فیتہ سے ناپا جاتا ہے اس لئے ضروری ہوگیا ہے کہ ان بطنی وسطحی علوم کے اہم و اصولی مباحث کی بھی کچھ نہ کچھ کتابیں درس و مطالعہ میں شریک رہیں۔

ذرا اچھے ذہن وفہم کے طلباء ان چیزوں کو خود اپنے ذاتی مطالعہ سے بھی بہت کچھ اخذ کر سکتے ہیں۔ یا استاد کی معمولی رہنمائی کافی ہوگی بہت اچھے استاد کی سب سے زیادہ تاخت سائنسی نظریات کی فہم وتفہیم کے لئے ہوگی۔ خصوصاً جس کی نظر ان نظریات پر ذرا فلسفیانہ ہو اور خود بھی کچھ صاحب فکر ہو۔

قدیم معقولات

منطق، فلسفہ وکلام کا صرف اس قدر جز شریک نصاب رہنا مناسب ہوگا کہ ان کے مسائل اور اصطلاحات وتعبیرات سے ذہن مانوس ہوجائے۔ اولاً تو خود ہمارے دینی علوم تفسیر، حدیث وفقہ میں ان تعبیرات واصطلاحات سے تقاضائے وقت کی بناء پر اسی طرح کام لیا گیا تھا جس طرح آج رائج الوقت اصطلاحات وتعبیرات سے دینی مضامین میں بے تکلف لایا جاتا ہے۔ اور جن سے بالکلیہ ناآشنا رہ کر اسلاف کے ان خاص وخالص دینی کارناموں سے بھی پوری طرح استفادہ دشوار ہے، دوسرے راقم ہذا کا ذاتی تجربہ ہے کہ ان سے ذہن کی تشحیذ وتربیت کا نفع خاصا ہوتا ہے ایسا نفع کہ خود جدید خیالات وعقلیات کی فہم وتفہیم میں بڑی مدد ملتی ہے بالخصوص قدیم علم کلام کے اصول ومبادی سے تو آج جدید کلام کی تدوین کا بڑا کام لیا جا سکتا ہے جس کا اندازہ خود حضرت حکیم الامت رح کے مختصر رسالہ الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ پر اس گفتگو سے کیا جا سکتا ہے جو جامع المجددین (مؤلفہ احقر) صـ ۱۱۳ تا صـ ۱۴۹ میں ملے گی [1]

[1] دارالعلوم ندوہ کی عمارت نوساخت میں تو غضب ہی کیا گیا کہ فلسفہ قدیم تو خیر علم کلام تک کو بالکلیہ نصاب بدر کر دیا گیا

انگریزی کا لزوم

سارے طلبا کے لئے غیر ضروری بھی ہے اور مضر رساں بھی البتہ جن طلبا کی طبیعت و تربیت سے خود اپنے ایمان و عمل میں رسوخ اور صدق و صلاح کے آثار نمایاں ہوں ساتھ ہی مذکورہ بالا جدید علوم میں سے کسی سے ذوق و مناسبت معلوم ہو اور اس کے ذریعہ دین کی تحریری یا تقریری خدمت کی توقع ہو ان کے لئے ضروری علوم دین سے فراغت کے بعد مستقلاً بقدر ضرورت انگریزی کی تحصیل کا انتظام ضرور ہو تاکہ ان کا سرمایہ معلومات ترجموں کی حد تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ خصوصاً آج کل علوم و فنون میں تازہ بتازہ نو بہ نو (لیٹسٹ) کا عارضہ ایسا لاحق ہو گیا ہے کہ فیشن کی طرح نظریات و معلومات بھی جلد جلد بدلتے اور فرسودہ (آؤٹ آف ڈیٹ) ہوتے رہتے ہیں علوم جدیدہ اور انگریزی کی تعلیم کا جوڑ علوم دین کے ساتھ خوب سوچ سمجھ کر اس حساب سے لگانا چاہئے کہ ان کا اضافہ دینی علوم فقہ و حدیث و تفسیر میں کمی و خامی کا باعث ہرگز نہ ہونے پائے بلکہ زیادہ بہتر صورت یہی ہو گی کہ علوم جدیدہ اور انگریزی کی تعلیم کا انتظام صرف خاص خاص طلبا کے لئے علوم دینیہ سے فراغ کے بعد بالکل علیحدہ اور مستقلاً دو تین سال کے لئے ہو۔

خالص عربی ادب

پر بھی ضرورت سے زیادہ زور دینا غلو سے خالی نہیں جب تک عام عربی لغت کی گوناگوں چھوٹی بڑی کثیر کتابیں اور خاص قرآن و حدیث کی لغات تفسیروں اور شروح کے عظیم الشان ذخیرے موجود نہ تھے اس وقت تک بیشک قرآن و حدیث کے معانی و مطالب کی فہم و تحقیق کے لئے خود عربی نظم و نثر خصوصاً کلام جاہلیت پر اطلاع و عبور

کی حاجت تھی۔ لیکن آج ایک لسان العرب ہی کی موجودگی میں کون بڑا سے بڑا ادیب بھی قرآن وحدیث کو سبعہ معلقہ وحماسہ سے سمجھنے کا محتاج ہے یا کسی لفظ ولغت کے لئے ایک نظر میں لسان العرب سے لسانی ولغوی تحقیق کا جتنا مواد ہاتھ آجاتا ہے وہ کسی حماسہ وہمدانی خواں کے دماغ میں محفوظ رہ سکتا ہے اسلاف کے ان کارناموں کے طفیل میں اب تو الحمد للہ بس اتنی قابلیت درکار ہے کہ طالب العلم لغت کی کتابوں اور قرآن شریف وحدیث شریف کی تفسیروں اور شرحوں کی عبارت بے تکلف سمجھ لے جس کے لئے خود ان کتابوں اور ان کی شرحوں کا زیادہ سے زیادہ پڑھنا پڑھانا ہی زیادہ نافع ہوتا ہے

ہاں تحریر وتقریر کے لئے نفس ادب کی ضرورت بڑی حد تک مسلّم ہے وہ بھی قدیم سے زیادہ جدید کی۔ اور اس کا مدار کتابی تعلیم وتعلم سے عملی مشق وتمرین پر ہے۔ پھر عربی تحریر وتقریر خاص عربی ممالک سے باہر کام ہی کہاں اور کس دینی خدمت کے لئے آسکتی ہے سوا اس کے کہ خود عربی ممالک میں جاکر وہیں کے لئے کوئی خاص تقریری وتحریری خدمت مقصود ہو تو ایسی استثنائی ضرورت کے لئے انتظام بھی استثنائی ہی مناسب ہوگا تاکہ عام نصابِ تعلیم میں اس کے زیادہ وقت گھیر لینے سے مستقل ومقدم دینی علوم میں خلل وکوتاہی واقع نہ ہو۔ غرض "ادب برائے ادب" بھی عہد حاضر کی عبث کاریوں میں سے ایک عبث کام ہے جو نہ دین میں مقصود بالذات اور نہ مقدمۂ مقصود ہونے کی حیثیت سے نفس دینی علوم یا ایسے عصری علوم کی تعلیم پر مقدم جن سے مقصود جدید وعصری علوم وافکار کے مقابلہ میں دینی عقائد واحکام کی تائید وتوثیق یا ان سے پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا ازالہ واستیصال ہے

تقریر وتحریر کی قوت وقدرت بھی ہمارے علمائے دین کو جس زبان میں حاصل کرنے کی زیادہ ضرورت واہمیت ہے وہ انگریزی ہی ہے اس کے واسطہ سے خود ان دلوں دماغوں تک پہنچا جاسکتا ہے جو دشمنِ دین وساوس وافکار کا سرچشمہ اور

فساد کی جڑ ہیں مگر بھولنا نہ چاہئے کہ نری چرب زبانی اور انشاپردازی کا نہ اپنوں پر زیادہ جادو چلتا ہے نہ غیروں پر، اصلاح و تبلیغ کے خادموں کا خود معتدبہ درجہ تک ایمان و عمل، ظاہر و باطن سے اسلام کی فکری و عملی برتری کا گواہ ہونا بہر صورت اہم و اقدم ہے ندوہ کا نام، ذاتی و قلبی تعلق کے ماسوا ان معروضات کے ضمن میں بالخصوص زبان پر اس لئے آگیا کہ دین کے اس ایک بڑے فرض کفایہ کیطرف توجہ کا فضل و تقدم اسی کو حاصل ہے اور ناقص و ناتمام انتظام کے باوجود کچھ نہ کچھ کام اس راہ کا ہوا بھی جس کے تجربات و روایات کی موجودگی میں آسانی کے ساتھ از سرِ نو بہتر انتظام و اہتمام سے بہتر نتائج و ثمرات کی توقع بیجا نہ ہوگی [1]

وفقنا اللہ لما یحب و یرضیٰ

---

[1] گو اس وقت زمام کار جن ہاتھوں میں ہے ان کی قوت و فرصت کی اصل بلکہ تمامتر مصروفیت خود عام مسلمانوں میں ایمان و یقین کو قوی و بیدار کرنے کی ایک مستقل جماعتی تحریک ہے یہ خدمت خصوصاً اس پر آشوب عہد میں جس اہمیت و وسعت کی متقاضی ہے اس کی بناء پر اس کے خادموں کو کسی دوسری طرف نظر اٹھانے کی بھی قطعاً مہلت نہ ملنی چاہئے چہ جائیکہ کسی دوسری مستقل خدمت کی مستقل ذمہ داری لیکن یہ کام اہم و اقدم ہونے کے باوجود دارالعلوم ندوہ کے زیر بحث مقصد قیام کا بدل یا قائمقام بہر حال نہیں۔ نہ ایک فرض میں انہماک دوسرے فرض سے سبکدوش کر دیتا ہے۔

۲۸-۱۱-۹۲